اٹلانٹس

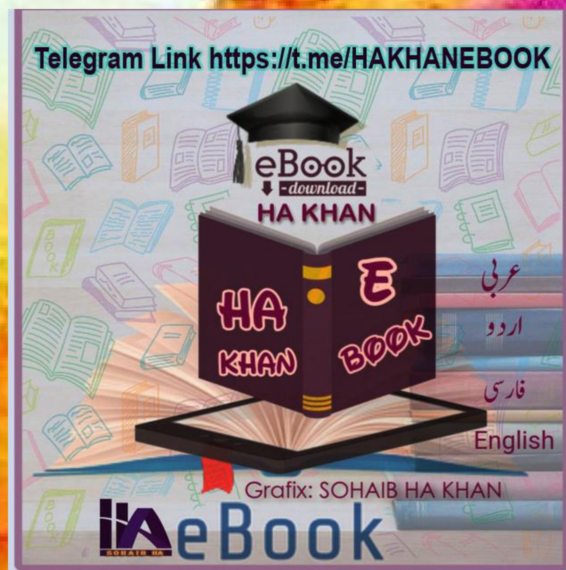
زندہ کتابیں
181

لاہور کی یادیں

(یادداشتیں)

اے حمید

اہتمام و پیشکش
راشد اشرف

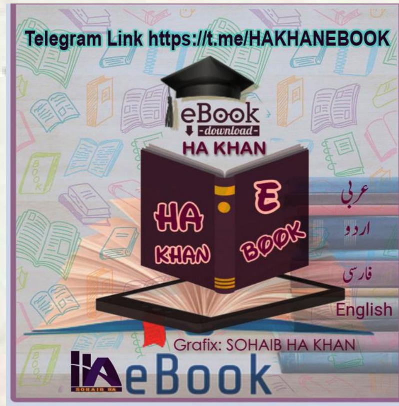


زندہ کتابیں
181

لاہور کی یادیں

(یادداشتیں)

اے حمید



اہتمام و پیشکش
راشد اشرف

اٹلانٹس

Zinda Kitabain (Regd)

اٹلانٹس پبلیکیشنز

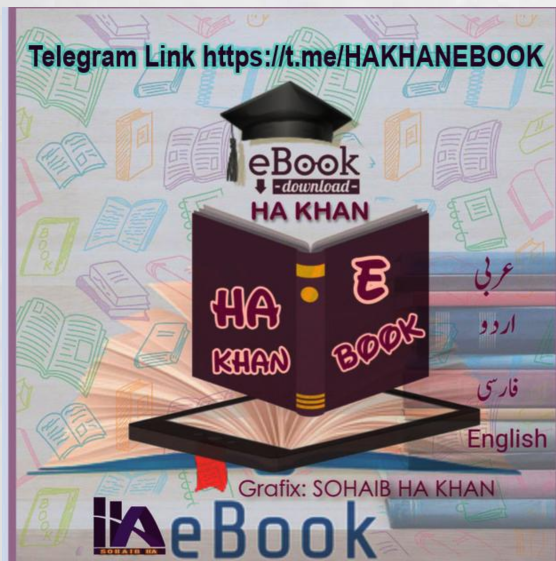
صحت مند، اصلاحی اور دلچسپ کتابوں، کہانیوں اور ناولوں کی کم قیمت اشاعت کے ذریعے ہر عمر کے لوگوں میں مطالعے اور کتب بینی کے فروغ کے لئے کوشاں ہے۔

کتاب کا نام	:	لاہور کی یادیں
مصنف	:	اے حمید
ناشر	:	فاروق احمد
مطبع	:	اٹلانٹس ڈیجیٹل پرنٹرز
منتظم	:	آسیہ عزیز
رابطہ نمبر	:	021-32581720, 0348-2568546
ویب سائٹ	:	www.atlantispublications.com.pk
پبلیکیشن ہیڈ	:	محمد اختر حسین 0300-2472238
انچارج ای کامرس	:	آمنہ فاروق
آئی ایس بی این	:	978-969-601-354-9
اشاعت	:	اکتوبر ۲۰۲۱ء
قیمت	:	1290

خصوصی شکریہ:

زیرِ نظر کتابوں کے مختلف اشاعتی مراحل کے دوران راقم کو جن قابلِ احترام شخصیات نے اپنے علمی تعاون اور مشوروں سے نوازا، ان کے نام یہاں درج کیے جاتے ہیں:

- جناب مسعود حمید، لاہور
- ڈاکٹر پرویز حیدر
- جناب وسیم رضا، امریکہ
- جناب امین ترمذی
- جناب شاہد کیانی، آسٹریلیا
- محترمہ سعدیہ کیانی، آسٹریلیا



چند باتیں

زندہ کتابیں سلسلے کی یہ 181 ویں کتاب ہے۔ یہ کتاب فرزند اے حمید، مسعود حمید کی تحریری اجازت وقانونی معاہدے کے تحت شائع کی گئی ہے۔



لاہور کی یادیں اور اے حمید کا سدا بہار قلم.....کون ہے جو اس کے سحر سے بچ سکے۔ وہ خود کہتے تھے کہ "یادوں کے قافلے کبھی ایک ساتھ سفر نہیں کرتے۔ ان کی کوئی خاص سمت نہیں ہوتی، کوئی طے شدہ راستہ نہیں ہوتا، کوئی منزل نہیں ہوتی۔ کہیں سے کوئی پرانی خوشبو آتی ہے، کچھ روشن اور دھندلی شکلیں سامنے آجاتی ہیں۔ جس طرح پھول مرجھا جاتا ہے مگر اس کی خوشبو کبھی مرجھاتی نہیں۔ یہ یادیں بھی زندہ ہیں۔"

اکمل علیمی، اے حمید سے متعلق اپنی یادوں میں لکھتے ہیں:

"بچھڑی ہوئی محبتوں کے راستے' یہ عنوان ہے ان کی ایک تحریر کا جوان کے مجموعہ مضامین 'لاہور کی یادیں' میں شامل ہے۔ امرتسر سے وابستگی کے دوران ہی انہیں لاہور سے عشق ہوگیا تھا اور ان کی مشہور ہیروئن واجدہ اسی شہر کی رہنے والی تھی اور جس نے مصنف سے التجا کی تھی۔ حمید صاحب میری محبت کی کہانی مت لکھنا میں بدنام ہو جاؤں گی۔ اس انشائیے میں وہ ایک رومان پرست اہل قلم کی تعریف کرتے ہیں۔ مضمون سے ایک اقتباس: 'ان درختوں کا اصل نام مجھے معلوم نہیں مگر ہم انہیں چڑی پھول والے درخت کہتے تھے۔ یہ درخت لاہور کی کسی دوسری سڑک پر بہت ہی کم نظر آتے ہیں۔ بہار کے آخری دنوں میں ان پھولوں کی پنکھڑیاں گرنے لگتیں اور ڈیوس روڈ کے خاموش اور دور تک خالی خالی فٹ پاتھوں پر ان پھولوں کا سرخ قالین بچھ جاتا، ہم نے کبھی ان دنوں میں فٹ پاتھ پر چلنے کی بے ادبی نہیں کی بلکہ فٹ پاتھ چھوڑ کر سڑک پر چلتے اور پھولوں کے زندہ قالین کو نظارہ کرتے چلے جاتے۔'

پاکستان میں لکھنے کو ذریعہ معاش بنانا ہمیشہ مشکل رہا ہے۔ منٹو اور اے حمید کے بعد انتظار حسین اردو فکشن کی آبرو اور ادب کے نوبیل پرائز کے حقدار ہیں مگر ان کی کتاب بھی دو ہزار سے زیادہ تعداد میں نہیں چھپتی چنانچہ بیشتر اہل قلم نے ماہوار معاوضہ دینے والے اداروں میں ملازمت اختیار کی۔ حفیظ جالندھری، تیغ الہ آبادی (مصطفےٰ زیدی) قدرت اللہ شہاب، الطاف گوہر، ن م راشد، مسعود مفتی، مختار مسعود، عبدالحمید عدم، جمیل الدین عالی، ممتاز مفتی، ابن انشا اور دوسروں نے جدید تعلیم کے بل پر سرکاری ملازمتیں حاصل کیں۔ فیض احمد فیض، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، قیوم نظر، انجم رومانی، عابد علی عابد، شہرت بخاری اور دوسرے دانش ور کالجوں میں پڑھانے لگے۔ قتیل شفائی اور تنویر نقوی نے فلمی دنیا کا رخ کیا۔ احسان دانش نے کتابوں کی دکان کھولی۔ استاد دامن، حبیب جالب اور ساغر صدیقی کچھ نہ کر پائے مگر شاعری کے کوچے میں نام کمایا۔ ادب اور صحافت میں ایک مضبوط رشتے کی روایت آزادی کے حصول سے پہلے سے چلی آ رہی تھی جس نے مولانا ظفر علی خان، عبدالمجید سالک، غلام رسول مہر، چراغ حسن حسرت اور مرتضیٰ احمد خان میکش جیسے چاند تارے پیدا کیے تھے۔ اس روایت کو سعادت حسن منٹو، رئیس امروہوی، احمد ندیم قاسمی اور انتظار حسین نے آگے بڑھایا اور آخر میں شوکت تھانوی، میرزا ادیب، ناصر کاظمی، اشفاق احمد، ابوالحسن نغمی اور اے حمید ریڈیو پاکستان میں پائے گئے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ یار لوگوں نے اے حمید کو 'اسٹاف آرٹسٹ یونین' کا صدر چن لیا تھا۔ ریڈیو کا اسٹاف آرٹسٹ ٹھیکے پر کام کرتا تھا اور اس کی تنخواہ بالعموم پروڈیوسر سے بھی کم ہوتی تھی۔

وائس آف امریکا سے مستقل وابستگی کے بعد میں نے اے حمید کو واشنگٹن لانے کی کوشش کی جو سن اسی کے وسط میں کامیاب ہوئی اور وہ دو سال کے کانٹریکٹ پر امریکا آئے۔ میری رہائش ڈیل سٹی ورجینیا میں تھی۔ وہ گھر کے ڈیک پر سیب اور آلوچے کے درختوں کی شاخوں کو جھکے پا کر بے حد خوش ہوئے۔ گویا ان کے

دیرینہ رومانوی خوابوں کی تعبیر سامنے تھی۔ شام ہونے کے بعد ہم اس ڈیک پر بیٹھ کر روشنی کرتے اور لاہور کی یادیں تازہ کرتے تھے۔ چند روز میں وہ اداس ہو گئے اور یہ کہہ کر مجھے حیران و پریشان کر دیا کہ میں وطن واپس جانا چاہتا ہوں۔ میں نے سبب پوچھا تو کہنے لگے کہ حفیظہ اور بچے یاد آنے لگے ہیں۔ چند ماہ میں کنبہ بھی ان سے آملا اور وہ ولسن بلیوارڈ پر کرائے کے ایک اپارٹمنٹ میں رہنے لگے۔ اب ان کی زندگی گھر اور دفتر تک محدود تھی۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ واشنگٹن آئے تو انہوں نے مجھے فون کیا۔ وہ اے حمید سے ملنا چاہتے تھے۔ میں نے حمید کو بتایا تو وہ بیزاری سے بولے: 'دفع کرو، کون میری لینڈ جائے گا؟ تم گھر آجانا۔ حفیظہ چائے بنائیں گی اور ہم دونوں بھائی مل کر پئیں گے۔'

واشنگٹن میں ہمارا ایک مشغلہ People Watching تھا۔ سن پچاس کے عشرے کے اواخر میں جب میں روزنامہ امروز کے ادارتی انتظامات کے لیے لاہور سے ملتان گیا تو مجھے یہ فن مختار مسعود نے سکھایا تھا جو وہاں ڈپٹی کمشنر تھے اور میں صبح کی سیر ان کے ساتھ کرتا تھا۔ اے حمید نے اس میں اجنبیوں میں جانے پہچانے چہرے تلاش کرنے کا اضافہ کیا۔ ایک روز ہم ایک پرہجوم سڑک پر جا رہے تھے کہ انہوں نے میرے کان میں کہا، 'وہ دیکھو کشور ناہید جا رہی ہیں۔' شاید وہ لاہور میں چھوڑے ہوئے دوستوں کی کمی محسوس کرتے تھے۔

ایک شام کام سے فارغ ہو کر میں نے اپنی گاڑی ایک پارکنگ لاٹ میں چھوڑی اور پاس ہی ہم ایک ریستوران میں بیٹھ گئے۔ تادیر باتیں ہوتی رہیں۔ ڈھاکے کی، بنگال کی، لاہور کی، مری کی۔ آدھی رات ہو چکی تو ہم باہر نکلے۔ پارکنگ لاٹ کو تالہ لگا ہوا تھا مگر تالے کے پاس لکھا تھا، یہ پارکنگ لاٹ گیارہ بجے رات بند ہو جاتا ہے اور تالے کی چابی سامنے پولیس اسٹیشن پہنچا دی جاتی ہے۔ اگر آپ تاخیر سے لوٹیں اور اپنی گاڑی اندر پائیں تو پولیس اسٹیشن سے رجوع کریں۔ میں نے اے حمید سے کہا، 'آپ یہیں ٹھہریں میں تھانے سے چابی لاتا ہوں۔' میں سڑک کے پار ڈی سی پولیس ڈسٹرکٹ میں گیا اور استقبالیہ

میں ڈیوٹی دینے والی خاتون افسر سے اپنی مشکل بیان کی تو اس نے ایک صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، آپ وہاں تشریف رکھیے۔ جس افسر کے پاس پارکنگ لاٹ کی چابی ہے وہ ذرا باہر گیا ہے ابھی آ جائے گا۔ میں نے صوفے پر 'تشریف' رکھی۔ انتظار قدرے طویل ہو گیا لیکن بالآخر وہ پولیس افسر آ گیا اور مجھے منتظر پا کر جلدی سے چابی نکال کر میرے ساتھ ہو لیا۔ اس نے پارکنگ لاٹ کا تالا کھولا۔ میں نے گاڑی نکالی مگر اے حمید اپنی جگہ سے غائب تھے۔ میں نے گاڑی میں بیٹھ کر ان کی تلاش شروع کی۔ آس پاس کی کئی گلیاں چھان ماریں۔ اے حمید کا کہیں پتا نہیں تھا۔ جوئیندہ یابندہ۔ پندرہ منٹ علاقے میں گاڑی دوڑانے کے بعد میں نے انہیں ایک گھر کی دیوار کے اوٹ میں کھڑے دیکھا۔ میں نے پوچھا۔ آپ وہاں سے کیوں چلے آئے؟ تو وہ بولے، 'میں ڈر گیا تھا۔' کس لیے؟ میں نے پوچھا۔ 'میں سمجھا تمہیں پولیس نے پکڑ لیا ہے اور میری بھی خیر نہیں۔'

وائس آف امریکا کے ساتھ معاہدے کی میعاد ختم ہونے پر وہ ہنسی خوشی وطن واپس چلے گئے۔ چند سال کے بعد میں لاہور گیا تو وہ سکون سے بولے، 'امریکا میں رہ کر میں نے آٹھ گھنٹے روزانہ کام کرنا سیکھا۔' واقعی وہ روزانہ آٹھ گھنٹے لکھتے تھے اور اپنی تحریروں کے معاوضے پر اپنے گھر کا خرچ چلاتے تھے۔ مگر انہوں نے اس دور کی کوئی کتاب مجھے نہیں دی۔ سنا ہے کہ 'امریکا نو' جیسی غیر معیاری کتابیں میرے تذکرے سے پُر ہیں۔'' (اکمل علیمی)



لاہور کی یادیں سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے کہ یہ باتیں اے حمید محفوظ نہ کرتے تو موجودہ دور کے قارئین ان سے محروم ہی رہ جاتے:

''بھاٹی دروازے کے باہر ہی ایک آنہ تھیٹریکل کمپنی میں ایک بار شیریں فرہاد کا کھیل لگا۔ میں بھی یہ کھیل دیکھنے گیا۔ اس ڈرامے کا آخری منظر مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ آخری سین میں ایسا ہوتا ہے کہ فرہاد پہاڑ کاٹ کر اس میں سے نہر

نکالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ فرہاد نے برجس پہن رکھی تھی اور پرانے بینڈ بجانے والوں کی وردی میں ملبوس تھا۔ وہ یوں ہی مٹی کی ایک ڈھیری پر کدال چلا رہا تھا اور ساتھ میں گانا بھی گا رہا تھا۔ اچانک شیریں کی نوکرانی آ کر کہتی ہے:

نوکرانی: فرہاد! شیریں شیریں مرگئی۔

فرہاد: مگر تو تو زندہ ہے۔

نوکرانی: لخ لانت ہے تیرے فرہاد تے، وے تمہاری معشوقہ شیریں مرگئی ہے۔

فرہاد: (چیخ مار کر) ہائیں۔ میری شیریں مرگئی؟ آہ! اب فرہاد زندہ رہ کر کیا کرے گا؟ سلام! اے فلک کج رفتار میرا آخری سلام!

اتنا کہہ کر فرہاد کدال اپنے سر پر مارتا ہے اور اسٹیج پر گر کر مر جاتا ہے۔ نوکرانی فرہاد کی لاش کو ہاتھ لگا کر کہتی ہے.....

نوکرانی: بے چارہ مرگیا۔ یہ میں نے کیا کر دیا مگر مجھے تو بادشاہ سلامت نے کہا تھا۔ نوکرانی گانا گانے لگتی ہے جس کا مفہوم یہ تھا کہ ان دونوں محبت کرنے والوں کی سچی داستان ہمیشہ زندہ رہے گی۔ اس دوران فرہاد اسٹیج پر اس جگہ مردہ پڑا رہتا ہے جہاں وہ گرا تھا نوکرانی گانا ختم کر کے تماشائیوں کو سلام کرتی ہے اور آؤٹ ہو جاتی ہے۔

اتفاق ایسا ہوا کہ جس جگہ فرہاد مر کر گرا تھا اور اسٹیج پر جہاں اس کی لاش پڑی تھی وہاں اس کے عین اوپر لکڑی کی وہ گیلی (شہتیر) تھی جس کے ساتھ پردہ لٹکا ہوا تھا اور جسے پردہ گرنے کے ساتھ ہی کھل کر نیچے دھڑام سے گرنا تھا۔ فرہاد کی لاش نے کانی آنکھ سے جب دیکھا کہ مر کر گرنے میں تھوڑا حساب کتاب غلط ہو گیا ہے، اس کی لاش لکڑی کی گیلی (شہتیر) کے عین نیچے آ گئی ہے۔ اگر اس حالت میں پردہ گرا تو گیلی (شہتیر) اس کے اوپر آ کر گرے گی اور وہ سچ مچ مر جائے گا... تو لوگوں نے ایک بڑا دلچسپ منظر دیکھا۔ پردہ گرنے سے چند سیکنڈ پہلے لوگوں نے محسوس کیا کہ فرہاد کی لاش میں جان پڑ گئی ہے اور اس نے آہستہ کھسکنا شروع کیا ہے۔ فرہاد کی لاش کھسک کر جلدی سے پرے ہٹ گئی اور

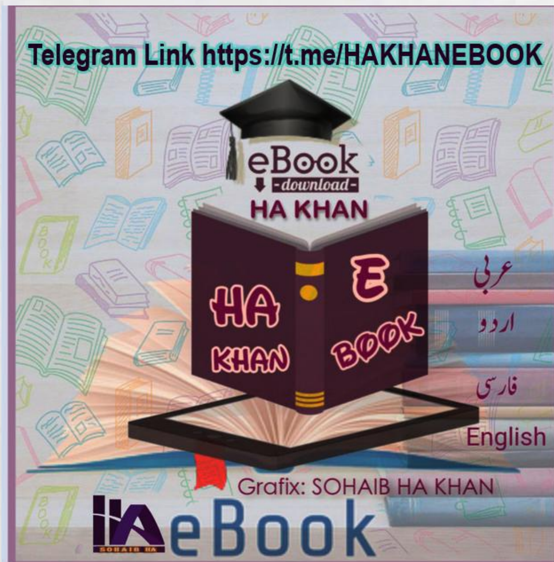
پردے کی گیلی یا شہتیر اسٹیج پر دھڑام سے آن گرا۔

لوگوں نے زور زور سے تالیاں بجاتے ہوئے مطالبہ کیا کہ انہیں فرہاد کی لاش کے زندہ ہو کر کھسکنے کا سین دوبارہ دکھایا جائے۔ کمپنی والے مجبور ہو گئے چنانچہ پردہ ایک بار پھر اٹھا دیا گیا اور فرہاد کدال سر پر مار کر دوبارہ گرا۔ وہ لاش کی طرح بے حس و حرکت ہو گیا اور پھر پردہ گرنے سے دو سیکنڈ پہلے فرہاد کی لاش اسٹیج پر کھسکتی ہوئی پردے کے شہتیر سے دور چلی گئی۔ لوگ دیر تک تالیاں بجاتے رہے۔ یہ سین تو اس کھیل کی جان بن گیا۔ لوگ صرف یہی منظر دیکھنے کے لیے دھڑا دھڑ آنے لگے..... یہاں تک کہ تھیٹر والوں نے باہر لکھ کر لگا دیا، حضرات! آیئے آیئے اپنے دوستوں کو بھی لایئے اور فرہاد کی لاش کو قدرت خداوندی سے دوبارہ زندہ ہوتے دیکھیں۔''



انجینئر راشد اشرف، کراچی۔ نومبر ۲۰۲۱ء

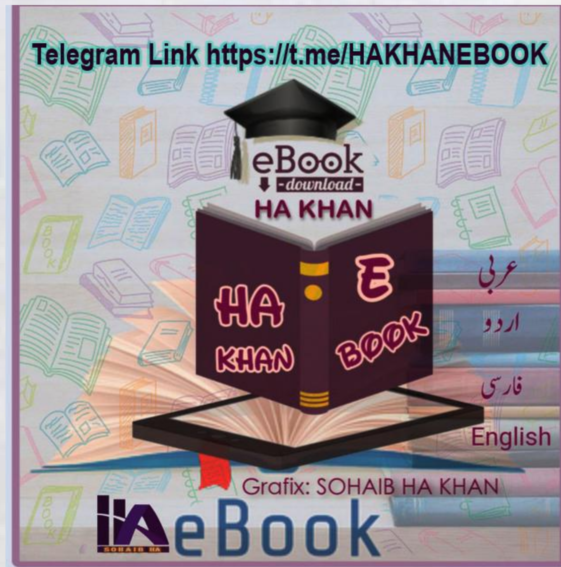
zest70pk@gmail.com / www.kitaabistan.com / zest70pk@yahoo.com



فہرست

سراج نظامی کے نام

جن کا خیال یہ کتاب لکھتے وقت
میرے ساتھ تھا



لاہور...... شہر الف لیلہ

لاہور کا نام آتے ہی طلسم و اسرار کی الف لیلہ کا ایک باب کھل جاتا ہے۔ خود اس نام میں ایک طلسم ہے۔ ایک پر اسراریت ہے۔ اس کا جادو ان پر بھی چل جاتا ہے جو جادو پر یقین نہیں رکھتے۔ میری رائے میں لاہور محض ایک شہر نہیں ہے۔ یہ ایک کیفیت ہے۔ یہ کیفیت جب اس شہر کی نیم روشن گلیوں، اس کے پرانے تاریخی باغوں میں چلنے پھرنے کے بعد دل کی گہرائیوں میں جذب ہو جاتی ہے تو پھر انسان پر اس کیفیت کی حالت طاری ہو جاتی ہے اور وہ محسوس کرتا ہے کہ اس شہر سے اس کی روح کا رشتہ بہت پرانا اور کبھی نہ ٹوٹنے والا ہے۔

مجھے یاد ہے ایک بار میں لاہور کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے لان میں بیٹھا ایک غیر ملکی سفارت خانے کے پریس اتاشی سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کا تعلق یورپ کے ایک ملک سے تھا۔ ہم کافی پی رہے تھے۔ یہ مارچ اپریل کا موسم تھا جب لاہور کے باغوں میں پھول کھل رہے ہوتے ہیں۔ یہ غیر ملکی پریس اتاشی مال روڈ کے سایہ دار درختوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا:

''میں نے اپنے سفارتی کیریئر کا آغاز افریقا کے ایک ترقی پذیر ملک سے کیا۔ میرا وہاں دل نہیں لگتا تھا۔ لیکن میرا وہاں کچھ عرصہ رہنا ضروری تھا۔ وہ عرصہ گزارنے کے بعد میں نے کوششیں شروع کر دیں کہ میرا تبادلہ پیرس کے سفارت خانے میں ہو جائے تاکہ میں ایک جدید اور فیشن ایبل ملک کی آسائشوں سے لطف اندوز ہو سکوں۔ ان ہی دنوں کی بات ہے میں نے پاکستان کے ایک انگریزی رسالے میں لاہور شہر کی گلیوں کی تصویر دیکھی۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ وہ گلیاں ہیں جہاں میں نے اپنا بچپن گزارا ہے۔ تم بھی میری اس بات پر ضرور ہنسو گے۔ اس وقت میرے دوست بھی بہت ہنسے تھے۔ مگر میں لاہور کی پر اسرار گلیوں کے طلسم کا اسیر ہو چکا تھا۔ چند روز بعد مجھے بتایا گیا کہ میرا تبادلہ افریقا کے اس بور ملک سے پیرس میں کر دیا گیا ہے۔ دوستوں نے مجھے مبارک باد دی۔ مجھ سے پارٹی مانگی۔ مگر اس وقت ان سب پر حیرت طاری ہوگئی جب میں نے اپنے متعلقہ محکمے کو لکھا کہ اگر پیرس کی بجائے میرا تبادلہ پاکستان کر دیا جائے تو میں بڑا شکر گزار

ہوں گا۔ کیونکہ میں لاہور جانا چاہتا ہوں۔ مجھے لاہور سے روحانی لگاؤ ہے۔ پیرس ایسا رنگین اور ماڈرن شہر چھوڑ کر لاہور آ جانا ان لوگوں کے لیے ایک ناقابل یقین بات تھی۔ مگر میں نے پیرس کے مقابلے میں لاہور کو ترجیح دی اور میں لاہور آ گیا۔ تب سے آج تک میں اس شہر میں ہوں اور مجھے لگتا ہے کہ میں اپنے ہی وطن میں آ گیا ہوں۔"

اس پریس اتاشی کی یہ کہانی حقیقت پر مبنی تھی یا محض اس کی سفارتی ڈپلومیسی تھی، اس بارے میں، میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن یہ میں ضرور جانتا ہوں کہ لاہور شہر کی کیفیت جب کسی انسان پر طاری ہو جاتی ہے تو پھر وہ اس شہر سے جدا ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ لاہور پرانا ہو یا نیا— لاہور ہر حالت میں، ہر رنگ میں، ہر روپ میں لاہور ہی ہے۔ یہ داتا کی نگری ہے اور اس شہر پر داتا صاحب کے فیض و برکات کا بھی سایہ ہے۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ لاہور کا دل آستانہ داتا صاحب کی فضاؤں میں دھڑکتا ہے۔ داتا صاحب کی درگاہ کے سرخ گلابوں اور اگربتیوں کی خوشبو نے سارے لاہور کو اپنی نورانی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔

لاہور میں عبادتیں بھی بہت ہوتی ہیں۔ پاکستان کے دوسرے شہروں کی طرح لاہور میں بھی عبادت گزاروں کی کمی نہیں ہے۔ میں نے سرد سنسان راتوں میں عبادت گزاروں کو لاہور کی مسجدوں میں نوافل ادا کرتے، قرآن کریم کی تلاوت کرتے اور اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو کر زار و قطار آنسو بہاتے دیکھا ہے۔ لاہور کے بزرگان دین اور شب زندہ دار عبادت گزاروں نے اس شہر زرنگار کو ایک روحانی سوز و گداز عطا کیا ہے۔

مجھے بھی اس شہر سے محبت ہے۔ میں نے بھی اس شہر سے عشق کیا ہے۔ میں نے بھی اپنی دور دراز کی خانہ بدوشیوں کے دوران اس شہر کو اشک بار آنکھوں سے یاد کیا ہے۔ یہ شاید سن ۴۱، ۴۲ء کی بات ہو گی۔ یہ میرے لڑکپن کا زمانہ تھا، اور میں اپنی آوارہ گردیوں کے سلسلے میں دارالحکومت برما یعنی رنگون میں مقیم تھا۔ وہاں پنچولی پکچرز کی فلم "خزانچی" پچاسویں ہفتے میں چل رہی تھی۔ میں اس فلم کو بار بار دیکھنے جایا کرتا تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ مجھے یہ فلم پسند تھی بلکہ وجہ یہ تھی کہ اس فلم میں ایک منظر آتا تھا جہاں فلم کا کردار بس سے اترتا ہے اور سڑک پر ایک جگہ "لاہور- بیس میل" اردو میں لکھا ہوا ہوتا ہے۔ بس میں صرف یہ "لاہور- بیس میل" لکھا ہوا دیکھنے کے لیے بار بار وہ فلم دیکھنے چلا جاتا تھا۔ میں سوچتا کہ کیا کبھی ایسا وقت بھی آئے گا کہ میں لاہور سے صرف بیس میل کے

فاصلے پر ہوں گا۔ یہ عجیب و غریب قسم کے جذباتی تجربے ہیں جنہیں صرف وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جن کے دلوں میں چھوٹے چھوٹے بے لوث غریبانہ جذبے ابھی زندہ ہیں اور ان جذبوں نے ابھی وفات نہیں پائی، اور خاص طور پر جنہیں لاہور شہر سے بھی وہی جذباتی اور روحانی لگاؤ ہے جو مجھے ہے۔

مجھے اپنے بچپن کا لاہور بھی یاد ہے، لڑکپن کا لاہور بھی یاد ہے اور وہ لاہور بھی اچھی طرح یاد ہے جب پاکستان کا سبز ہلالی پرچم اس کی فضاؤں میں پہلی بار لہرایا اور لاکھوں مسلمان مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے اس شہر میں داخل ہو رہے تھے اور لاہور کے زندہ دل مسلمانوں نے انہیں اپنے سینوں سے لگا لیا تھا۔

کہتے ہیں لاہور کی تاریخ بڑی پرانی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس قدر ماڈرن ہو جانے کے باوجود لاہور آج بھی اپنی پرانی تاریخ میں ہی زندہ و پائندہ ہے۔ اس کی ٹھنڈی نیم روشن قدیم گلیوں میں سے گزرتے ہوئے یوں لگتا ہے کہ ابھی کسی نہ کسی گلی میں سے سلطان محمود غزنوی نکل کر سامنے آ جائے گا۔

میری زندگی کی تختی پر لاہور شہر کی پہلی تصویر بڑی صاف ہے۔ اکثر سنا ہے کہ ماضی کی یادیں بڑی دھندلی ہوتی ہیں۔ مگر میری یادیں بالکل دھندلی نہیں ہیں۔ وہ خواب کی مانند ضرور ہیں مگر ان کے رنگ، شیڈ، نقوش، آوازیں اور آسمان بڑے صاف شفاف اور واضح ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ مجھے تسلسل کے ساتھ سب کچھ یاد نہیں ہے۔ لیکن جتنا یاد ہے اور جو کچھ یاد ہے وہ اپنی تمام تر تفصیلات کے ساتھ یاد ہے اور میں اس کے نقش و نگار کو صاف صاف دیکھتا ہوں۔ میری لاہور کی پہلی یاد جیسا کہ میں پہلے بھی کہیں لکھ چکا ہوں، ایک میدان کی ہے۔ میدان میں ایک جگہ سبز جھنڈا لہرا رہا ہے۔ جھنڈے کے پاس ایک آدمی زور زور سے ڈھول بجا رہا ہے۔ میں کسی کی گود میں ہوں۔ میرے کانوں میں کسی کی آواز آتی ہے کہ یہ غازی علم دین شہید کا مزار ہے۔ اس کے بعد بچپن کی ایک اور تصویر ابھرتی ہے۔ میں نے صرف نیکر پہن رکھی ہے۔ میری عمر پانچ چھ سال کی ہو گی، میں لاہور کی فاروق گنج کی آبادی کے باہر ریلوے لائن پر لائن کے ساتھ ساتھ بھاگ رہا ہوں۔ میرے ساتھ ایک اور لڑکا بھی ہے۔ بادامی باغ کی طرف سے چھک چھک کرتی دھواں اڑاتی گاڑی آتی ہے۔ ہم ریلوے ٹریک سے اتر کر ڈھلان پر بیٹھ جاتے ہیں۔ دیوہیکل کالا انجن کسی بھوت کی طرح شور

مچاتا اپنے سر میں سے آگ کے شرارے اڑاتا، زمین کو ہلاتا، سرخ رنگ کی گاڑی کو ساتھ لیے گزر جاتا ہے۔ ریل کے ڈبوں کے رنگ سرخ ہیں۔ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ بڑی گرد اڑ رہی ہے۔ ریل کے پہیوں میں سے ٹھکا ٹھک کی آوازیں نکل رہی ہیں اور پھر یہ آواز ٹرین کے آخری ڈبے کے ساتھ لاہور اسٹیشن کی طرف دور ہوتی چلی جاتی ہے۔ اسی لاہور شہر میں اپنے بچپن کی ایک تصویر میں آپ کو دکھاتا ہوں۔

میں اپنی والدہ آپو جی کے ساتھ داتا صاحب کے مزار میں عورتوں کے حصے میں بیٹھا ہوں۔ ہر طرف سرخ گلاب کے پھولوں کی پتیاں بکھری ہوئی ہیں۔ فضا میں ان پھولوں اور اگربتیوں کی مہک بسی ہوئی ہے۔ میرے کانوں میں درود و سلام کی مقدس آوازیں آ رہی ہیں۔ میں دوڑ کر ساتھ والی مسجد کے صحن میں آ جاتا ہوں۔ یہ چھوٹی سی پرانی مسجد ہے۔ صحن میں دریاں اور صفیں بچھی ہوئی ہیں۔ کچھ نمازی وضو کر رہے ہیں۔ آسمان شفاف اور نیلا ہے۔ میں واپس مسجد کے دروازے میں آ گیا ہوں۔ نیچے سیڑھیاں بازار والے دروازے کی طرف اترتی ہیں۔ ایک سبز پوش بزرگ اوپر آ رہے ہیں۔ ان کے پیچھے بہت سے لوگ ہیں۔ میں بھاگ کر اپنی والدہ کی طرف چلا جاتا ہوں۔

منظر بدلتا ہے۔ لاہور کی ایک اور تصویر میری آنکھوں کے سامنے ابھرتی ہے۔ میں لالہ غلام حسن کے ساتھ مستی دروازے سے نکل کر سڑک کی ڈھلان پر اتر رہا ہوں۔ بائیں جانب مستی دروازے کا تھانا ہے۔ تھانے کے کنویں کے اوپر بڑ کے گنجان درخت کا سایہ ہے۔ ایک سپاہی تھانے کی دیوار کے پاس دھوپ میں بیٹھا حقہ پی رہا ہے۔ ہم دریائے راوی پر جا رہے ہیں۔ لالہ غلام حسن ہمارا قریبی رشتے دار ہے۔ اسے مچھلی کے شکار کا شوق ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں تھیلا اور دوسرے ہاتھ میں مچھلیاں پکڑنے والی لمبی چھڑی ہے۔ موسم بڑا خوشگوار ہے۔ ہم حکیم نیر واسطی کے دواخانے کے سامنے سے گزرتے ہوئے بادامی باغ ریلوے اسٹیشن پر آ جاتے ہیں اور پھر لائنوں لائن دریا کی طرف چل پڑتے ہیں۔ مجھے ریلوے لائن بڑی اچھی لگتی ہے۔ مجھے ریلوے لائن پر چلتی ریل گاڑیوں سے بھی بڑا پیار ہے۔ میں ان ریل گاڑیوں کو چلتے دیکھ کر رک جاتا ہوں۔ جب تک ریل گاڑی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہو جاتی، اپنی جگہ پر کھڑا رہتا ہوں۔ اب ریل گاڑیوں میں وہ بھاپ کے انجنوں والی ریل گاڑیوں کا رومان نہیں رہا۔ اب تو بجلی یا ڈیزل کے انجنوں والی ریل گاڑیاں کرخت آواز کے سائرن بجاتی آتی ہیں اور گزر جاتی ہیں۔ لیکن بھاپ

کے انجن والی ریل گاڑی چھن چھن کرتی، رقص کرتی آیا کرتی تھی۔ جیسے کوئی رقاصہ مستی میں، رقص کرتی، جھومتی ہوئی چلی آ رہی ہو۔ اس کی دور کی آواز کچھ اور ہوتی تھی۔ جب قریب سے دھڑ دھڑاتی ہوئی گزرتی تو اس کی لے اور تال کچھ اور ہوتی تھی۔ بہر حال زمانے کو ترقی کرنی ہی ہوتی ہے۔ ریل گاڑیوں کو بھی بدلنا ہی تھا۔ اسٹیم کی جگہ ڈیزل اور بجلی نے لینی ہی تھی۔

میں لالہ غلام حسن کے ساتھ اب دریا پر آ گیا ہوں۔ یہ یاد نہیں کہ وہ دریا کا کون سا علاقہ تھا۔ بس سامنے دریا ہی دریا تھا۔ ایک طرف چھوٹی چھوٹی ٹاہلیوں کے پتلے پتلے درخت تھے، لالہ کنڈی لگانے کے لیے کیچڑ میں چلا جا رہا ہے۔ میں بھی اس کے پیچھے ہوں۔ اچانک میرا پاؤں کیچڑ میں دھنس جاتا ہے۔ یہ اصل میں دریا کی دلدل تھی۔ میں ٹانگ نکالنے لگتا ہوں تو کمر تک دلدل میں اتر جاتا ہوں۔ میں شور مچاتا ہوں۔ لالہ غلام حسن پلٹ کر دیکھتا ہے اور میری طرف بڑھتا ہے۔ اب وہ بھی دلدل میں اترنے لگا ہے مگر وہ گھبرایا نہیں ہے۔ وہ ایک دم کیچڑ میں چت لیٹ جاتا ہے اور مجھے بھی اس طرح اپنا آدھا جسم دلدل میں لٹا دینے کو کہتے ہیں۔ پھر وہ دلدل پر یوں ہاتھ چلانے لگتا ہے جیسے دریا میں تیر رہا ہو۔ وہ مجھے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف زور سے کھینچتا ہے اور میرا آدھا دھڑ دلدل میں سے باہر آ جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ مجھے دلدل پر سے گھسیٹ کر کنارے پر لے آتا ہے۔ یہاں سے منظر دھندلا ہو جاتا ہے۔ اب ہم دریا سے واپس مستی گیٹ کی طرف آ رہے ہیں۔ لالہ غلام حسن ایک دکان سے قیمہ بنوا رہا ہے۔ شاید وہ کوئی مچھلی نہیں پکڑ سکا۔ پھر ہم اپنے مستی دروازے والے گھر میں ہیں۔ لالہ غلام حسن کی بیوی چولھے میں آگ جلائے پتیلی میں پیاز سرخ کر رہی ہے۔ لالہ غلام حسن چٹو میں قیمہ ڈالے ہاون دستے سے کوٹ رہا ہے۔ وہ ہاتھ روک لیتا ہے۔ حقے کا ایک کش لگاتا ہے اور اپنی بیگم سے کہتا ہے:

''ممتاز مسالے میں تھوڑا سا زعفران ضرور ڈالنا۔ کوفتوں کی خوشبو سارے محلے میں جانی چاہیے۔''

منظر بدلتا ہے۔ میں اندرونِ لاہور ایک مکان کی بیٹھک میں کھڑکی کے پاس بیٹھا ہوں۔ بیٹھک میں عورتیں ہی عورتیں جمع ہیں۔ اگربتیاں سلگ رہی ہیں۔ درمیان میں پتھوسوں (طشتوں) میں کٹے ہوئے پھل پڑے ہیں۔ حنا کے عطر کی خوشبو سے فضا بوجھل ہو رہی ہے۔ مراثنیں پیڑھیوں پر بیٹھی طبلے ٹلیاں بجاتے ہوئے بلھے شاہ کی یا کسی اور صوفی شاعر کی کافی گا رہی ہیں۔

درمیان میں ایک سرخ و سفید بھاری جسم والی عورت اپنے بال کھولے بیٹھی اپنے سر کو دائیں بائیں جھلا رہی ہے۔اس کا چہرہ سرخ ہے۔آنکھیں بند ہیں۔اس نے صاف ستھرے سفید کپڑے پہن رکھے ہیں۔کافی گانے کی آوازیں تیز ہو جاتی ہیں۔طبلے کی لے بھی تیز ہو جاتی ہے۔اس کے ساتھ ہی کھلے بالوں والی خاتون زور زور سے حال کھیلنے لگتی ہے۔طبلے کی اونچی دھمک میرے دل پر ایسے پڑ رہی ہے جیسے کوئی گھونسے مار رہا ہو۔طبلے اور ٹلیوں کی بلند آوازوں میں گانے والیوں کی آوازیں گھل مل گئی ہیں۔وہاں بیٹھی ہوئی باقی عورتیں بھی سروں پر سفید دوپٹے اوڑھے جھوم رہی ہیں۔حال کھیلنے والی بھاری بھرکم خاتون کے سر کے بال آگے پیچھے گر رہے ہیں۔میں کچھ کچھ سہا ہوا یہ سارا منظر دیکھ رہا ہوں۔اچانک حال کھیلنے والی عورت اپنے بازو اوپر اٹھا لیتی ہے۔گانے کی آواز رک جاتی ہے۔خاتون کا چہرہ پسینے میں تر ہے۔قریب بیٹھی ہوئی ایک عورت ململ کے سفید کپڑے سے، خاتون کا پسینہ بڑے ادب و احترام سے پونچھتی ہے اور جلدی سے ہاتھ پیچھے کر کے بیٹھ جاتی ہے۔خاتون آنکھیں کھولتی ہے۔اس کی آنکھوں کا رنگ سرخ ہو رہا ہے۔وہ بھاری آواز میں کہتی ہے:

''میں شاہ پری ہوں۔تم لوگوں نے مجھے کیوں یاد کیا ہے؟''

پاس بیٹھی عورت خوش ہو کر کہتی ہے:

''آپ کا آنا مبارک ہو۔یہ ہمارے دھن بھاگ آپ یہاں تشریف لائیں۔''

خاتون کی بھاری آواز دوبارہ بلند ہوتی ہے۔وہ پوچھتی ہے:

''گڈو کہاں ہے؟''

گڈو اس حال کھیلنے والی خاتون کا پوترا ہے۔ایک عورت جلدی سے منہ بسورتے ہوئے کسی قدر خوف زدہ گڈو کو گودی سے اتار کر خاتون کے آگے زبردستی بٹھا دیتی ہے۔خاتون گڈو کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہتی ہے:

'اسے ڈاکٹر بنانا۔اس کے گلے میں اٹی ڈال دینا۔''

دوسری عورتیں اپنے اپنے سوال پوچھنے لگتی ہیں۔خاتون کے پاس بیٹھی عورت انہیں ڈانٹ کر کہتی ہے:

''شاہ پری کو پریشان نہ کرو۔''

خاتون ہاتھ اٹھا کر کہتی ہے:

''کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں۔''

وہ کسی عورت کو کہتی ہے۔تمہارا بچہ ٹھیک ہو جائے گا۔کسی کو کہتی ہے تمہارا شوہر پردیس سے واپس آجائے گا کہ کسی کو اولاد نرینہ کی خوشخبری دیتی ہے۔کسی کے بیٹے کی نوکری لگا دیتی ہے۔کسی لڑکی کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہتی ہے،''تیرے سر پر جو سایہ ہے وہ اب نہیں آئے گا۔''اور پھر مراثنوں کی طرف نگاہ اٹھا کر بھاری آواز میں کہتی ہے:

''تم بھی خوش رہوگی۔وہ شعر پھر گاؤ۔لپاں مار چھہاں پئی وگدی اے۔''

مراثنیں خوشی خوشی طبلہ ٹلیاں بجاتے ہوئے اپنی کراری آواز میں یک دم سے گانا شروع کر دیتی ہیں۔جوں ہی طبلے کی لے تیز ہوتی ہے۔خاتون پر پھر حال طاری ہو جاتا ہے اور وہ سر آگے پیچھے جھٹکنے لگتی ہے۔میں صرف اس لیے وہاں بیٹھا ہوں کہ کب یہ محفل ختم ہو اور کب کٹے ہوئے پھل بچوں میں بانٹے جائیں۔ایک گھنٹے بعد میں گلی میں اس مکان کی ڈیوڑھی کے باہر کھڑا بندر کا تماشا دیکھ رہا ہوں۔میری جھولی میں کٹے ہوئے کیلے، مالٹے اور سیب ہیں اور میں مزے لے لے کر کھا رہا ہوں۔

یہاں ایک بار پھر لاہور کی اسکرین پر منظر بدلتا ہے اور میں اپنی ایک رشتے دار فیملی کے ساتھ لاہور اسٹیشن کے سامنے والے ریوالی سینما کے ایک باکس میں بیٹھا ہوں۔میری عمر بہت چھوٹی ہے۔میں باکس میں کسی کے گھٹنوں پر بیٹھا ہوں۔سامنے سینما ہال کے پردے پر فلم چل رہی ہے۔ایک آدمی گھوڑے کو بھگائے لیے جا رہا ہے۔بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ فلم ''دلیل و نہار'' تھی جس میں شاہو موڈک نے کام کیا ہے۔اس فلم کا مجھے صرف وہی سین یاد ہے جس میں ایک آدمی گھوڑے کو جنگل میں بھگائے لیے جا رہا تھا۔میری یادوں کے پردہ سیمیں پر یہ آدمی آج بھی اسی طرح گھوڑے کو دوڑائے لیے جا رہا ہے۔اس کا سفر ابھی تک ختم نہیں ہوا۔شاید اس کا سفر میری زندگی کے سفر کے ساتھ ہی ختم ہو۔یا شاید میرے مرنے کے بعد ہم دونوں کا کوئی نیا اور انوکھا سفر شروع ہو جائے۔وہ گھوڑے سے اتر کر میری جگہ پر آجائے اور میں گھوڑے پر سوار ہو کر جنگل میں سے گزرنے لگوں۔کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

میں اس بار بدلتے منظر کے ساتھ لاہور میں اپنے ایک رشتے دار کے گھر میں ہوں۔یہ گھر بھی اندرون شہر ایک گلی کے کونے میں ہے۔ایک دبلی پتلی عورت جگمگ کرتی کوٹھڑی میں جوتی

باہر اتار کر داخل ہوتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں تانبے کی تھالی ہے جس میں آٹے کا گندھا ہوا پیڑا رکھا ہے۔ اس میں درجن بھر اگربتیاں سلگ رہی ہیں۔ وہ عورت جگمگاتی کوٹھڑی میں جا کر اگربتیوں والی تھالی کارنس پر رکھتی ہے اور منہ میں کچھ پڑھتی الٹے قدم کوٹھڑی سے باہر آ جاتی ہے۔ کوٹھڑی کی چھت اور دیواروں پر چھوٹے چھوٹے شیشوں کے بے شمار ٹکڑے لگے ہیں۔ ان میں جلتے ہوئے بجلی کے انڈوں کے بے شمار عکس پڑ رہے ہیں جن کی وجہ سے ساری کوٹھڑی جگمگا رہی ہے۔ اس کوٹھڑی کو یہ لوگ شیش محل کہتے ہیں۔ بقول ان لوگوں کے یہاں جن رہتے ہیں۔ یہ مسلمان جن ہیں۔ ان کا پورا خاندان اس شیش محل میں آباد ہے۔ ماسی عغراں کا کہنا ہے کہ ان کے ہاں شادیاں بیاہ بھی ہوتے ہیں۔ ڈھولک پر گیت بھی گائے جاتے ہیں۔

''میں نے اپنے آنکھوں سے جن کی ایک بیٹی کو دلہن بنے دیکھا ہے۔''

یہ بات اس گھر میں ہر کوئی کہتا ہے کہ ہم راتوں کو کئی بار ایسی آوازیں سنتے ہیں کہ جیسے کوئی تیز قدموں سے سیڑھیاں چڑھ رہا ہو۔ سڑھیاں اتر رہا ہو۔ ہم سمجھ جاتے ہیں کہ جنوں کے بچے وغیرہ آ جا رہے ہیں۔ وہ غیبی عورتوں کے ہلکے ہلکے قہقہوں کی آوازیں بھی سنتے ہیں۔ اس گھر والوں کا کہنا ہے ان جنوں نے انہیں کبھی کچھ نہیں کہا۔ وہ اس گھر کی حفاظت کرتے ہیں۔ ماسی عغراں کا کہنا ہے کہ ایک بار رات کو چور آ گیا۔ کسی طرح اس نے ڈیوڑھی کی کنڈی کھولی، اور سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ جونہی وہ شیش محل والی کوٹھڑی کے سامنے گزرا اس کے حلق سے ایک بھیانک چیخ نکلی۔ سب گھر والے اٹھ بیٹھے۔ دیکھا کہ سیڑھیوں میں چور بے ہوش زخمی حالت میں پڑا ہے۔ مجھے اس شیش محل کے خوشبوؤں اور گلاب گیندے کے پھولوں والی فضا بڑی اچھی لگتی ہے۔ میرے دل میں خواہش بیدار ہوتی کہ میں شیش محل کی غیبی مخلوق کو دیکھوں۔ پھر میں ڈر کر سہم جاتا کہ کہیں وہ مجھے اپنے ساتھ نہ لے جائیں۔ یہ شیش محل آج بھی اسی گھر میں ہے اور وہاں آج بھی سر شام بلب روشن کر دیے جاتے ہیں اگربتیاں سلگا دی جاتی ہیں۔

منظر تبدیل ہوتا ہے۔ میں لاہور میں اپنی سب سے بڑی بہن کے گھر کی دوسری منزل والے چھوٹے سے کمرے میں ہوں۔ بازار میں میں ٹھٹھیرے تانبے کی بڑی بڑی پراتوں کو کوٹ رہے ہیں۔ میری عمر سات آٹھ سال کی ہوگی۔ میرے ساتھ میری عمر کا ایک اور لڑکا بھی ہے۔ ہم دونوں کو سخت چکر آ رہے ہیں۔ ہم کبھی دری پر لیٹ جاتے ہیں اور کبھی اٹھ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ کبھی

نلکے کے ساتھ منہ لگا کر پانی پیتے ہیں اور پھر لیٹ جاتے ہیں۔ہم نے کہیں سے لے کر ایک ایک پورے کا پورا سگریٹ پی لیا ہے، اور اب ہمارا برا حال ہو رہا ہے۔ آنکھوں کے تارے ناچ رہے ہیں۔سر چکرا رہا ہے۔اوپر سے ایک موٹی توند والا آدمی اتر کر ہمیں دیکھتا ہے اور کرخت آواز میں پوچھتا ہے:

''اوئے تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

پھر اسے ہماری حالت کی خبر ہو جاتی ہے اور وہ گھبرا کر اوپر آواز دیتا ہے: ''رضیہ! نیچے آنا۔''

اس کے بعد منظر دھندلا جاتا ہے۔آگے کے سین میری یادوں کی تختی سے مٹ گئے ہیں یا مٹا دیئے گئے ہیں۔کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ بعض یادوں کا مٹا دیا جانا بھی کتنی بڑی نعمت ہے۔اگر ہمیں گزرے ہوئے زمانے کی ایک ایک تفصیل، ایک ایک واقعہ یاد رہتا تو ہمارے لیے زندہ رہنا اور خاص طور پر مرنا کس قدر مشکل ہو جاتا ہے۔اللہ میاں کے ہر کام میں بڑی حکمت ہے۔اس نے انسان پر ہر طرح سے اپنا کرم ہی کیا ہے۔ہم ناشکرے ہیں کہ اس کے کرم کو بھلا دیتے ہیں۔میری یادوں کے کچھ کینوس، کچھ پینٹنگز، کچھ تصویریں رئیل ازم یعنی حقیقت پسند فائن آرٹ کے نمونے ہیں جن میں لینڈ اسکیپ بھی ہیں۔پورٹریٹ بھی ہیں۔ان کے روغنی اور آبی رنگ بڑے صاف ہیں۔ان تصویروں کی جزئیات بڑی واضح ہیں۔جب مجھے اپنی یادوں کو قلم بند کرنا ہوتا ہے تو میں ان تصویروں میں سے کسی ایک تصویر، کسی ایک پینٹنگ کو، کسی ایک لینڈ اسکیپ، کسی ایک پورٹریٹ کو اپنے سامنے رکھ لیتا ہوں اور پھر اس کی لکیروں، اسٹروک، نقش و نگار اور قسم قسم کے کلرز کو الفاظ کی شکل میں بیان کرتا چلا جاتا ہوں۔لیکن کچھ یادیں ایسی ہیں کہ جب میں انہیں یاد کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو وہ شراروں کی طرح تھوڑی دیر کے لیے چمک کر میری آنکھوں سے غائب ہو جاتی ہیں۔میں بڑی مشکل سے انہیں اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کرتا ہوں۔پل بھر کے لیے کچھ چہرے میرے سامنے آتے ہیں اور ماضی کی دھند انہیں اپنی آغوش میں لپیٹ لیتی ہے اور وہ میرے حافظے سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔چنانچہ ایسی یادوں کی تصویریں اور پینٹنگز میں تجریدی آرٹ میں بنانے کی کوشش کرتا ہوں۔جب میں ایسی کسی تجریدی یاد کو الفاظ کی صورت میں کاغذ پر بیان کروں گا تو آپ کو کسی کی صرف آنکھیں، کسی کے سنہری بال، کسی کی عینک، کسی مکان کی نیم روشن سیڑھیاں، کسی کی شرارتی مسکراہٹ، کسی لڑکی کا تیزی سے سیڑھیاں چڑھ جانا اور کسی کے ریشمی

ملبوس کی صرف سرسراہٹ ہی سنائی دے گی۔

اپنے بچپن کے لاہور کی ایسی ہی دو یادیں، دو تجریدی تصویریں میں کتاب کے کینوس پر الفاظ کی شکل میں بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ پہلی تجریدی یاد رتی دروازے کے اندر ایک بازار، شاید ڈبی بازار۔ اس بازار کی ایک گلی، تنگ گلی، گلی میں ایک پختہ چار منزلہ مکان، مکان کی بند کھڑکیوں کے اوپر روشن دانوں پر لگے ہوئے نیلے زرد شیشے، کھڑکیوں کے چھجوں پر بیٹھے غٹرغوں غٹرغوں کرتے سرمئی رنگ کے کبوتر مکان کا چھوٹا سا گرد آلود دالان، ٹائیلوں والا فرش، ٹھنڈی ٹھنڈی خاموشی، مجھے لالا غلام حسن نے یہاں ایک اپنے ٹھیکیدار دوست کے ہاں کوئی پیغام دے کر بھیجا ہے۔ میں جانے کس کا نام لے کر آواز دیتا ہوں۔ کافی دیر بعد دالان کے اوپر ایک پرانی چوبی کام والی کھڑکی کھلتی ہے۔ ایک لڑکی کا چاند ایسا گول زرد چہرہ نیچے جھانکتا ہے۔ اس کے بالوں کی ایک لٹ آگے کو جھول رہی ہے۔ میں کچھ کہتا ہوں وہ کچھ جواب دیتی ہے۔ ذرا سا مسکراتی ہے۔ چاند ایسا چہرہ پیچھے ہٹ جاتا ہے کھڑکی بند ہو جاتی ہے اس کے ساتھ ہی اس تجریدی تصویر کے نقوش بھی مکمل ہو جاتے ہیں۔ آج میں کوشش بھی کروں تو اس مکان کو، اس گلی کو، اس چاند ایسے چہرے والی لڑکی کو تلاش نہیں کر سکتا۔ جس نے مجھے اس ڈبی بازار والی گلی میں بھیجا تھا وہ مر چکا ہے۔ جس کے پاس بھیجا تھا وہ بھی زندہ نہیں ہے۔ وہ سرمئی کبوتر بھی مر کھپ گئے ہوں گے۔ جو اس پر اسرار الف لیلوی مکان کی کھڑکی کے چھجے پر بیٹھے ایک دوسرے سے محبت کی باتیں کیا کرتے تھے۔ مجھے اس لڑکی کا خیال آتا ہے جس کا چاند ایسا چہرہ کھڑکی کے پٹ میں سے طلوع ہوا تھا۔ ایک پل کے لیے طلوع ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غائب ہو گیا تھا۔ اسی لاہور شہر کے ہجوم میں دوسرے خوب صورت چہروں کے ساتھ غائب ہو گیا تھا۔ میں اب اگر اسے دیکھوں بھی تو ہم ایک دوسرے کو پہچان نہ سکیں گے۔

ایک دوسری ایبسٹرک یاد یعنی تجریدی نامکمل تصویر کی کچھ لکیروں کے ساتھ مغلپورے کے ایک مکان کی شکل سامنے آتی ہے۔ مکان کی بیٹھک میں ساوار پڑا ہے۔ ایک سنہری عینک والا دبلا پتلا ادھیڑ عمر کا آدمی مسکرا رہا ہے۔ اس کا ایک جملہ مجھے یاد رہ گیا ہے۔ بیٹھک میں کچھ عورتیں بھی بیٹھی ہیں۔ ان میں سے کسی عورت کا چہرہ مجھے یاد نہیں۔ وہ ادھیڑ عمر کا آدمی کہہ رہا ہے:

"داتا صاحب کے مزار پر ننگے پاؤں جاتا ہوں۔ ننگے سر جاتا ہوں۔ اسی میں عاجزی

ہے۔''

اس کے ساتھ ہی یہ تجریدی تصویر بھی غائب ہو جاتی ہے۔

اب میں نے ہوش سنبھال لیا ہے۔ میں امرتسر سے روزانہ بابو ٹرین میں سوار ہو کر لاہور آتا ہوں۔ میں ریلوے ہیڈ کوارٹر میں کلرک بھرتی ہو گیا ہوں۔ یہ نوکری میں نے صرف دو تین مہینے ہی کی تھی، اور پھر لاہور چھوڑ کر امرتسر چھوڑ کر جنوب مشرقی ایشیا کے کسی ملک کی طرف بھاگ گیا تھا۔ اسی بابو ٹرین میں ظہور الحسن ڈار بھی میرے ساتھ آتا ہے۔ ریلوے کا پاس تین ساڑھے تین روپے مہینے کا بنتا ہے۔ مگر میں گھر سے یہ پیسے لے کر کھا پی جاتا ہوں اور ٹرین میں بغیر ٹکٹ سفر کرتا ہوں۔ کئی بڑی عمر کے لوگ بھی بغیر ٹکٹ سفر کرتے ہیں۔ میری عمر اس وقت سولہ سترہ سال کی تھی۔ مجھے ٹرین میں بغیر ٹکٹ سفر کرنے میں مزہ آتا تھا۔ بابو ٹرین میں زیادہ تر ریلوے ملازم ہی سفر کرتے ہیں۔ امرتسر سے نفیس خلیلی اور شاعر اقبال کوثر بھی اسی ٹرین میں لاہور آتے، کبھی کبھی اس ٹرین پر بھی ریلوے ہیڈ کوارٹر کے ٹکٹ چیکروں کا چھاپا پڑ جاتا ہے۔ ہم ادھر ادھر ہو جاتے ہیں۔ ایک بار ٹرین مغلپورے کے اسٹیشن سے چلی تو ہمارے ڈبے میں دو ٹی ٹی آ گئے۔ میرے پاس ٹکٹ نہیں تھا۔ ٹی ٹی نے میرے پاس آ کر ٹکٹ کا پوچھا تو میں نے کھڑکی کے باہر چھلانگ لگا دی۔ یہ منظر مجھے پوری جزئیات کے ساتھ آج بھی یاد ہے۔ ٹرین کی رفتار ابھی تیز نہیں ہوئی تھی۔ وہ مغل پورے کے نہر کے پل سے گزر رہی تھی کہ میں کھڑکی میں سے باہر کود گیا۔ میں جھاڑیوں میں گرا۔ ٹرین گزر گئی۔ ٹی ٹی اور ڈبے کے دوسرے مسافر کھڑکیوں میں سے سر نکالے مجھے آنکھیں پھاڑے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ میں ہنس رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس منظر کی روشنیاں بھی بجھ جاتی ہیں۔

لاہور کا ریلوے آفس جہاں میں کلرک لگا ہوں، وہ ریلوے یارڈ کے قریب ہی ہے۔ ہم ریلوے یارڈ میں سے گزر کر چھوٹے سے راستے میں سے ہوتے ہوئے دفتروں کے علاقے میں آ جاتے ہیں، میرا یہاں ذرا دل نہیں لگتا۔ آفس کے ماحول میں میرا دم گھٹتا ہے۔ میں دفتر میں ٹک کر نہیں بیٹھتا۔ اکثر دفتر سے بھاگ کر اندرون لاہور اپنے رشتہ داروں کے ہاں چلا جاتا ہوں جہاں میں ایک لڑکی سے بے پناہ محبت کرتا ہوں۔ یہ وہی لڑکی ہے جس کا اصل نام چھپاتے ہوئے میں نے واجدہ کے نام سے اس پر اپنی ادبی زندگی کا پہلا افسانہ ''منزل منزل'' لکھا تھا۔ یہ لڑکی مجھ سے کچھ سال بڑی ہے۔ درمیانی شکل وصورت کی لڑکی ہے۔ مگر اس کے چہرے پر ایک اداسی ہر

وقت چھائی رہتی ہے۔ یہ اداسی مجھے پسند ہے۔ بہت کم بات کرتی، چپ چاپ نظروں سے مجھے دیکھتی، اور چہرہ دوسری طرف پھیر کر چلی جاتی۔ ایک بار میں نے سیڑھیوں میں اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ اس کا جسم اس طرح لرز رہا تھا جیسے تیز آندھی میں درخت کی شاخ سے لٹکتا اکیلا پتا لرزتا ہے۔ جنسی آلودگیوں سے میں بے خبر ہوں۔ میں اس لڑکی کے سراپا کو پیار کرتا ہوں۔ اب جو برے خیال میرے ذہن میں آتے ہیں، اس وقت میں ان برے خیالوں سے بالکل پاک تھا۔ مجھے نہیں یاد کہ میں نے کبھی اس لڑکی کا منہ چوما ہو، مگر اس کی محبت مجھے دور دور سے کھینچ کر اس کے پاس لے آتی۔ چونکہ وہ ہماری رشتہ دار تھی اس لیے ان کے ہاں آنے جانے میں مجھے کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ ایک رات میں اس کے گھر ٹھہر گیا۔

سردیوں کا موسم تھا۔ واجدہ نے میرے لیے بڑے ٹرنک میں سے نیا لحاف نکال کر میرے پلنگ پر رکھ دیا۔ لحاف میں سے فینائل کی ہلکی ہلکی بو آ رہی تھی۔ میں نے کبھی اس لڑکی سے الگ ملنے کی کوشش نہیں کی۔ کبھی اتفاق سے مکان کی چھت پر یا مکان کی سیڑھیوں یا ڈیوڑھی میں اکیلے میں آمنا سامنا ہو جاتا تو ہم ایک دوسرے کو دیکھتے چلے جاتے، یا زیادہ سے زیادہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیتا، اور پھر اس خیال سے کہ کوئی آ نہ جائے جلدی سے الگ ہو جاتے۔

اب میں آپ کو دوسرے پس منظر میں لے جاتا ہوں۔

یہی پرانا شہر لاہور ہے۔ فلیمنگ روڈ کے قریب ایک گلی میں سے اردو کا ادبی ماہوار رسالہ ''شاہکار'' نکلتا ہے۔ اس رسالے کے چیف ایڈیٹر مولانا تاجور نجیب آبادی ہیں۔ بھاری بھرکم جسم، چہرے پر بچوں ایسی معصومیت، سر پر گول رومی ٹوپی، مجھ سے بڑی شفقت سے پیش آتے ہیں۔ میرا کام رسالے کے پروف دیکھنا ہے۔ ایک خوب صورت ہندو شاعر لڑکا راج بلدیو راج بھی اس رسالے میں نائب مدیر کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔ رسالے کا دفتر ایک تین منزلہ مکان کی بیٹھک میں ہے۔ پیچھے ایک چھوٹا سا کمرہ ہے۔ مولانا تاجور اسی کمرے میں بیٹھتے ہیں۔ رسالے کا مالک مضبوط خدوخال اور بھاری آواز والا ایک درمیانے قد کا ادھیڑ عمر آدمی ہے جو ہر وقت انگریزی سوٹ پہنے رکھتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں لکڑی کی چھڑی ہوتی ہے۔ اسے ادب سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ ادبی رسالہ اس لیے نکال لیا ہے کہ اس زمانے میں یہ ایک مفید کاروبار تھا اگر اشتہار معقول مل جائیں۔ کبھی کبھی وہ مولانا کے پاس آ کر خوش مزاجی سے کہتا ہے:

"مولانا! ہندو کاروباری ہمارے رسالے کو شائیں کار کہتے ہیں۔"

اسے ہر وقت یہ فکر لگی رہتی ہے کہ رسالے میں اس بار کوئی نیا اشتہار آیا ہے کہ نہیں۔ مجھے یہاں پچاس روپے ماہوار تنخواہ ملتی ہے جو میرے لیے بہت ہوتی تھی۔ یہ قیام پاکستان سے کچھ ہی سال پہلے کی باتیں ہیں۔ میں کبھی لاہور سے ریل میں بیٹھ کر واپس امرتسر چلا جاتا ہوں اور کبھی لاہور میں واجدہ کے گھر کے ساتھ ہی اپنی بڑی بہن کے ہاں رہ لیتا ہوں۔ میرے گھر والوں کو میری محبت کا علم ہے۔ مگر وہ اسے کوئی اہمیت نہیں دیتے۔

سردیوں کی راتوں کو واجدہ کے ہاں چائے کی محفل لگتی۔ میں انہیں بڑے لطیفے اور اپنی خانہ بدوشیوں اور سفر کے عجیب وغریب واقعات نمک مرچ لگا کر سناتا۔ میرے لطیفوں پر سب خوب ہنستے۔ واجدہ صرف ہلکا سا مسکرا کر چپ ہو جاتی۔ وہ کچن میں سے سبز چائے سے بھرا ہوا سماوار لے کر کمرے میں آتی۔ باقر خانیاں وہاں ٹرے میں پہلے سے رکھی ہوتی تھیں۔ وہ سب کی پیالیوں میں سماوار سے چائے انڈیلتی اور یہ محفل رات گئے تک جاری رہتی۔ پھر ہم وہیں ادھر ادھر لحاف کمبل وغیرہ لے کر پڑ جاتے۔

پھر ایک روز مجھے پتہ چلا کہ واجدہ کی شادی کی بات پکی ہو گئی ہے۔ مجھے بڑا دکھ ہوا۔ میں اداس ہو گیا۔ پرانی رومانٹک فلموں کے ہیرو کی طرح میں سڑک پر سر جھکا کر چلتا۔ کوئی بات کرتا تو ہوں ہاں میں جواب دے کر اس کا منہ خالی خالی نظروں سے تکنے لگتا۔ کسی ہوٹل، کسی ریستوران میں لگے ریڈیو سے کسی دردناک فلمی گیت کی آواز آتی تو میں وہیں رک جاتا اور میری آنکھیں اپنے آپ بھر آتیں۔ نہ میری شادی کی عمر تھی اور نہ میں نے کبھی واجدہ سے شادی کے بارے میں سوچا تھا۔ جب واجدہ کی شادی کی بات رشتے داروں میں پکی ہو گئی تو مجھے اپنی زندگی میں ایک بہت بڑا خلا نمودار ہوتا محسوس ہوا۔

لاہور میں میرا ایک جگری دوست ہوتا تھا۔ اس کا نام اختر عکسی تھا۔ اس نے پاگل عاشقوں ایسی حالت دیکھی تو بولا:

"اگر لڑکی تم سے پیار کرتی ہے۔ تم اس سے پیار کرتے ہو۔ دونوں ایک دوسرے سے بیاہ بھی کرنا چاہتے ہو تو پھر جھگڑا کس بات کا ہے۔ تم واجدہ سے کہو کہ وہ تمھارے ساتھ بھاگ چلے۔ میں اپنے گاؤں میں سارا انتظام کر دوں گا۔ مولوی

صاحب اور چار گواہ وہاں تیار ہوں گے۔ آتے ہی تمہارا نکاح پڑھا دیا جائے گا۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ بعد میں لاہور آ جانا۔ سب کچھ اپنے آپ ٹھیک ہو جائے گا۔''

میرے اندر بھی جوش آ گیا میں نے ایک لڑکی کے ذریعے پیغام بھجوایا کہ واجدہ مجھے لارنس باغ میں آ کر ملے۔ وہ تانگے میں اپنی سہیلی کے ساتھ بیٹھ کر آ گئی۔ میں نے اسے کہا کہ واجدہ میرے ساتھ چلی چلو۔ ہم گاؤں میں جا کر نکاح پڑھوالیں گے۔ پھر لاہور تمہارے ماں باپ کے پاس آ جائیں گے۔ ہم ان سے معافی مانگ لیں گے۔ وہ ہمیں معاف کر دیں گے۔ واجدہ نے کہا:

''نہیں۔ اس طرح میرے ماں باپ کی بدنامی ہو گی۔ میں ایسا نہیں کر سکتی۔''

واجدہ نے صاف انکار کر دیا۔ کتنا خیال ہوتا تھا اس زمانے کی محبت کرنے والی لڑکیوں کو اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کی عزت کا...... وہ محبت کے غم میں اندر ہی اندر گھل کر مر جاتی تھیں مگر اپنے درد کو ظاہر نہیں ہونے دیتی تھیں۔ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے۔ واجدہ شادی کے بعد مجھے ملی تو میں نے اسے بتایا کہ میں اس کے بارے میں افسانہ لکھنے والا ہوں۔ واجدہ نے کہا تھا:

''میرے بارے میں افسانہ نہ لکھنا۔ میں بدنام ہو جاؤں گی۔''

اور میں نے واجدہ کے اسی جملے سے اپنے پہلے افسانے ''منزل منزل'' کی ابتدا کی تھی۔

واجدہ اپنے گھر چلی گئی۔ میں افسانوں کی دنیا میں نکل آیا۔

میں جہاں بھی ہوتا لاہور مجھے اپنی طرف ضرور بلاتا۔ جس محلے میں واجدہ کا نیا گھر تھا میں اس محلے کی طرف کبھی نہیں گیا تھا۔ ایک بار میں دیال سنگھ کالج کے ہوسٹل کے قریب سے گزر رہا تھا کہ پیچھے سے ایک تانگہ آیا۔ وہ تھوڑی دور میرے آگے جا کر رک گیا۔ تانگے میں کچھ برقعہ پوش عورتیں بیٹھی تھیں۔ میں چلتے چلتے تانگے کے قریب آیا تو کسی نے مجھے میرا نام لے کر بلایا۔ میں رک گیا۔ واجدہ کی سہیلی نے نقاب اٹھا کر کہا:

''میں نے وعدہ کیا تھا کہ ایک بار واجدہ کو ضرور ملاؤں گی۔ آؤ بیٹھ جاؤ۔ واجدہ اسی تانگے میں بیٹھی ہے۔''

واجدہ نے برقعہ پہن رکھا تھا۔ اس نے ذرا سا نقاب اٹھا کر مجھے دیکھا۔ مجھے اس کے میک اپ والے کی ایک جھلک دکھائی دی۔ میں تانگے میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس کے ملبوس میں سے حنا کے عطر کی خوشبو آ رہی تھی۔ میں نے کوئی بات نہ کی۔ واجدہ بھی اپنی عادت کے مطابق

خاموش تھی۔ تانگہ میکلوڈ روڈ کی طرف مڑا تو واجدہ نے خشک سی آواز میں پوچھا، "کیا حال ہے؟"

میں نے آہستہ سے جواب دیا:

"ٹھیک ہوں۔"

اور پھر میں رائل پارک کے چوک میں تانگے سے اتر گیا۔ اس کے بعد مجھ پر اداسی کا حملہ ہوا اور میں ساری رات نہ سو سکا۔

اب لاہور مجھے محبت کا ایک اور منظر دکھاتا ہے۔ مگر یہ محبت نہیں تھی۔ کوئی دوسری شے تھی۔ واجدہ کی محبت نے میرے جذبوں کو روشنی اور پاکیزگی عطا کی تھی۔ میں اس کی محبت کا ہاتھ تھام کر آسمان کی نورانی فضاؤں میں پرواز کرتا تھا۔ لیکن اس دوسری عورت کی محبت مجھے سورج کی طرف کھینچ رہی تھی۔ مہک زمین کے اندر لے جا رہی تھی۔ لیکن یہ جذبہ بھی بڑا طوفان خیز اور بلا خیز تھا۔ مگر مجھے کسی غیبی طاقت نے ذلت کی گہرائیوں میں گرنے سے بچالیا۔

ان دنوں لاہور میں ایک فلمی دفتر ہوا کرتا تھا، جس کی دوسری فلم کے لیے میں کہانی مکالمے اور اسکرین پلے لکھ رہا تھا۔ میں ایک روز فلم کے دفتر میں بیٹھا کہانی پر کام کر رہا تھا کہ کمرے کی چق اٹھا کر فلم کا ڈائریکٹر اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ایک عورت تھی جس نے تھری پیس والا آسمانی رنگ کا ریشمی برقعہ اس طرح پہن رکھا تھا کہ اس کا آدھا سینہ باہر نکلا ہوا تھا۔ بالوں کے چھلے کانوں کے اوپر لٹک رہے تھے اور آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگا تھا۔ ہونٹ سرخی سے گہرے لال ہو رہے تھے۔ ڈائریکٹر نے کہا:

"ان سے کچھ مکالمے بلوا کر سن لیں۔ اگر یہ اردو ٹھیک بول لیتی ہیں تو کوئی رول نکال دیں گے ان کے لیے۔"

فیشن ایبل عورت جو شکل ہی سے لگتی تھی کہ سیدھی راہ سے بھٹک گئی ہے، میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے چشمہ اتار کر میز پر رکھ دیا، اور میری طرف دیکھ کر پراسرار انداز میں مسکرانے لگی۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا۔ فلمی ماحول میں اس قسم کی عورتوں سے میرا اکثر واسطہ پڑتا رہتا تھا اور میرے لیے یہ کوئی انوکھی یا ہیجان خیز بات نہیں تھی۔ اس فلمی شوقین عورت کا میں اصل نام نہیں لکھوں گا۔ آپ یوں سمجھ لیں کہ اس کا نام ستارہ تھا۔

میں نے اسے ایک دو مکالمے لکھ کر دیے۔ اس نے بول کر مکالموں کا حشر کر دیا۔ نہ اسے

اردو بولنا آتا تھا نہ مکالموں کی ادائیگی ہی اچھی تھی۔ چونکہ اسے فلم کے ہدایت کار اپنے ساتھ لائے تھے اس لیے میں نے کہہ دیا کہ آپ کل آ جائیں۔ میں نے یہ سوچا کہ ہدایت کار کو سمجھا دوں گا کہ اسے نو دو گیارہ کر دے۔ فلم میں کام کرنا اس کے بس کی بات نہیں۔ اس نے کاغذ میری طرف کرتے ہوئے کہا:

''آپ مجھے کچھ بتا دیں نا۔''

ستارہ کے اس اصلی مکالمے میں بڑا جذباتی ہیجان تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے سامنے کوئی ناگن پھن اٹھائے بیٹھی ہے۔ میں نے کہا۔ ''آپ سے کہہ دیا نا کل کسی وقت آ جائیں۔''

وہ آہستہ سے اٹھی اور سلام کر کے مسکراتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

میرے ساتھ اس فلم میں طفیل فاروقی میوزک ڈائریکٹر تھا جو میرا دوست بھی تھا اور اردو کا ایک نامور اور مقبول شاعر فلم کے لیے گیت لکھ رہا تھا۔ یہ شاعر بھی میرا بے تکلف دوست تھا۔ میں یہاں اس کا بھی اصل نام نہ لکھوں گا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں وہ اپنا ذکر پڑھ کر مجھ سے ناراض ہو جائے گا کہ یہ بات دوسروں تک کیوں پہنچی۔ وہ خود تو سمجھ جائے گا کہ یہ اسی کا ذکر ہے اور چونکہ میں حقیقت بیان کر رہا ہوں اور اس حقیقت کا اس کی ذات سے بھی تعلق ہے اس لیے وہ مجھ سے ناراض نہیں ہو گا۔ ستارہ عورت کو اس شاعر سے ملاقات کا شرف حاصل ہو چکا تھا اور وہ اس پر مرنے لگا تھا۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ شاعر نے اس کو فلم میں کام دلانے کا وعدہ بھی کر لیا تھا اور اس سے اظہار محبت بھی کر دیا تھا۔

میں، طفیل فاروقی اور میرا شاعر دوست۔ ہم تینوں فلم کے دفتر میں اپنا کام ختم کر کے نکلے اور ایک شارٹ کٹ کے ذریعے میکلوڈ روڈ والی سڑک پر آئے تو ہماری نظر ستارہ پر پڑی۔ وہ نقاب اٹھائے فٹ پاتھ پر بڑی شان سے پیدل چلی آ رہی تھی۔ اس نے اتنا زیادہ میک اپ کر رکھا تھا کہ راہ گیر پلٹ پلٹ کر اس کی طرف دیکھتے تھے۔ اس نے ہم تینوں کو دیکھا تو سڑک پار کر کے ہمارے پاس آ گئی۔

''کہاں جا رہے ہیں؟''

اس نے بڑی معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ ہم سے پوچھا۔ طفیل فاروق، ہم دونوں میں شریف

آدمی تھا۔اس نے کہا۔"چائے پینے جا رہے ہیں۔آپ بھی چلیں۔"شاعر کی نیت بدل چکی تھی۔ اس نے میرے کان میں کہا۔"اسے ڈاکٹر کے ہاں لیے چلتے ہیں۔"

یہ ایک نقلی ڈاکٹر تھا اور اس کا کلینک بڑا چلتا تھا۔طفیل فاروقی تو ہوٹل کی طرف چل دیا اور ہم ستارہ کو تانگے میں بٹھا کر ڈاکٹر کے کلینک میں لے آئے۔ڈاکٹر سمجھ گیا کہ شاعر کس لیے آیا ہے۔ اس نے شاعر سے کہا۔"آپ اندر بیٹھیں۔میں انہیں ابھی دیکھتا ہوں۔"

شاعر اور ستارہ اندر چلے گئے۔میں باہر ڈاکٹر کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔تھوڑی دیر بعد شاعر پریشانی کے عالم میں بالوں میں انگلیاں پھیرتا باہر آ گیا۔میری طرف غصیلی نظروں سے دیکھ کر بولا:

"وہ تمہیں بلا رہی ہے۔"

میں نے کہا:

"مجھے تو اس سے کوئی کام نہیں ہے۔"

شاعر نے غرا کر جواب دیا:

"کمینے تمہیں نہیں تو اسے تو تم سے کام ہو گا۔میں رائل پارک جا رہا ہوں۔"

شاعر چلا گیا۔میں اندر چھوٹے سے کمرے میں گیا تو ستارہ نے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا اور بڑی جذباتی لہجے میں اعتراف کیا کہ وہ مجھے پسند کرتی ہے۔میں ہنس پڑا۔میں اس قسم کے مکالموں کی اصلیت سے واقف تھا۔میں نے کہا:

"شاعر کو تم نے کیا کہا؟ وہ تو بڑا ناراض ہو کر گیا ہے۔"

ستارہ نے گردن کو ذرا سا جھٹک کر کہا:

"وہ مجھ سے محبت کرنا چاہتا تھا۔میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں تمہیں اپنے بھائی کے برابر سمجھتی ہوں۔تم حمید کو اندر بھیج دو۔"

مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا۔میں نے کہا:

"اچھا تو اب میں بھی چلتا ہوں۔تم بھی گھر جاؤ۔"

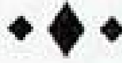
وہ بولی:

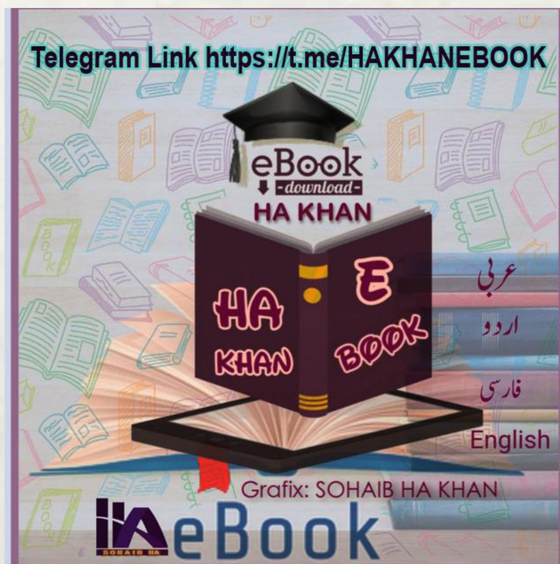
"میں تو قصور سے آتی ہوں۔وہیں جاؤں گی۔کل پھر تم سے ملنے آؤں گی۔فلم میں کام لینے کے لیے نہیں،صرف تم سے باتیں کرنے آؤں گی۔"

دوسرے دن ستارہ نے جہاں آنے کے لیے کہا تھا وہاں آ گئی۔ ہم رتن سینما میں فلم دیکھنے چلے گئے۔ فلم ''مس ۵٦'' چل رہی تھی جس کا ایک گانا ''اے لو میں ہاری پیا'' ان دنوں بڑا پاپولر تھا۔ یہ گیتا رائے نے گایا تھا۔ جب فلم پر یہ گانا آیا تو ستارہ بھی اسے دھیمی آواز میں گانے لگی۔ میں گھبرا گیا۔ کیونکہ ہمارے آس پاس شرفا بیٹھے تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے ستارہ کو چپ کرایا۔ اس روز بھی ستارہ نے بہت زیادہ میک اپ کر رکھا تھا۔ اس کے ریشمی لباس سے سر کو چکرا دینے والی خوشبوئیں اٹھ رہی تھیں۔ شام چھ بجے میٹنی شو ختم ہوا تو میں اسے چھوڑنے لاری اڈے پر گیا۔ ان دنوں اسٹیشن کے سامنے سرائے سلطان سے قصور کو لاریاں جایا کرتی تھیں۔ جب اس کی لاری بس اسٹینڈ سے باہر نکل گئی تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرے سر سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں اپنے آپ کو خالی خالی سا محسوس کرنے لگا۔ مجھے ستارہ کا بوجھ پسند تھا۔

اگلے روز وہ پھر قصور سے مجھے ملنے لاہور آ گئی۔ اس روز ستارہ نے میرے سامنے ایک تجویز پیش کی۔ بلکہ مطالبے کے انداز میں کہا کہ مجھے اغوا کر کے کسی دوسرے شہر لے چلو۔ میں اپنے خاوند کی بجائے تمہارے پاس رہنا چاہتی ہوں۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ خود مجھے اغوا کرنا چاہتی تھی۔ میرے خیال کے مطابق ستارہ اپنے زمانے سے ڈھائی ہزار سال بعد پیدا ہوئی۔ اسے اصل میں حمورابی سے بھی پہلے کے شہر بابل میں پیدا ہونا چاہیے تھا جہاں عورتیں مندر کے دیوار پر اپنی پسند کے نوجوانوں کے نام لکھ جاتی تھیں۔ اگر میں ڈھائی ہزار برس پہلے کے بابل شہر میں ہوتا تو یقین کریں کہ میں ستارہ کو ضرور اغوا کر کے ملک شام کے صحراؤں کی طرف نکل جاتا مگر اب میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ میں صرف محبت ناموں اور ٹیلی فون کے ذریعے ہی محبت کر سکتا تھا اور محبت کرتے ہوئے بھی مجھے ایک خاص حد کے اندر رہنا پڑتا تھا۔ یہ بالکل ایسی بات تھی جیسے کوئی سانڈ شیشے کی دکان کے اندر بڑی احتیاط سے چلنے کی کوشش کر رہا ہو۔ مجھے افسوس بھی ہوا کہ خواہش کے باوجود میں ستارہ کو اغوا کر کے افق کے اس پار نہیں لے جا سکتا تھا۔ کیونکہ وہ عورت پیدا ہی اغوا کیے جانے کے لیے ہوئی تھی۔ یہ اس قسم کی عورت تھی جن کے لیے قتل ہو جاتے ہیں۔ یہ اس قدرتی جذبہ عشق والی عورت تھی کہ جو ایک آزاد وحشی جنگلی گھوڑے کی طرح تھا۔ مگر میں نے اس گھوڑے کو لگام ڈال کر اسے زندگی کے یکے میں جوت دیا تھا۔ وہ یکہ بھائی سے لوہاری اور لوہاری سے بھاٹی کے چکر میں پھنس کر رہ گیا تھا۔ میں اس زمانہ ماقبل تاریخ کی جنگلی عورت سے کس طرح الگ ہوا؟ یہ ایک الگ

داستان ہے۔ جس کا میرے موضوع سے براہ راست تعلق نہیں ہے۔ اس لیے میں اس کہانی کو یہیں ختم کرتا ہوں۔





پرانے لاہور کے فلم اسٹوڈیوز

کہا جاتا ہے کہ پرانے لاہور میں فلم سازی کی ابتدا بھاٹی دروازے کے ایک نوجوان نے کی جس کا نام عبدالرشید کاردار تھا اور جس نے فلم ڈائریکٹر کی حیثیت سے اے آر کاردار کے نام سے بعد میں بڑی شہرت حاصل کی۔

یہ میرے ہوش سے پہلے کی باتیں ہیں۔ سنا ہے کہ اے آر کاردار کے ساتھ نامور کریکٹر ایکٹر ایم اسماعیل ہوا کرتے تھے۔ میں نے جب ہوش سنبھالا تو لاہور میں اپر انڈیا فلم اسٹوڈیو کے نام سے ایک فلمی اسٹوڈیو فیروز پور روڈ والی نہر کے کنارے پر ہوا کرتا تھا۔ فلم ایکٹر بننے کا شوق یا خبط تو مجھے بھی شروع ہی سے تھا۔ جس کی خاطر میں بمبئی اور کلکتے کی خاک بھی چھان چکا تھا۔ میں کبھی کبھی لاہور والے اس فلم اسٹوڈیوز کے چکر بھی لگایا کرتا تھا۔ فیروز پور روڈ سے نہر کے پل پر سے اتر کر نہر کے ساتھ ساتھ ٹالیوں کے درختوں کے پاس یہ فلم اسٹوڈیو ایک پرانی مگر بڑی کشادہ کوٹھی میں بنایا گیا تھا۔ مجنوں، منورما، پران، ایم اسماعیل، راگنی اس زمانے کے مشہور فلمی فنکار تھے۔ کچھ روز تک میں راگنی کے عشق کے بھوت کو بھی بھگت چکا تھا۔ فلم اسٹوڈیو کے اندر میں کبھی نہیں گیا تھا۔ باہر ہی نہر کے کنارے درختوں میں کھڑے ہو کر فلمی چہروں کو اندر جاتے باہر آتے دیکھا کرتا۔ کریکٹر ایکٹر اجمل اس زمانے کا مشہور ویلن تھا۔ بعد میں شاید یہی اسٹوڈیو پنچولی اسٹوڈیو اور اس کے بعد شوری اسٹوڈیو میں تبدیل ہو گیا تھا۔ جب پاکستان بنا تو اس کا نام بدل دیا گیا۔ قیام پاکستان کے وقت صرف یہی ایک فلم اسٹوڈیو تھا۔

کچھ عرصہ بعد فیروز پور روڈ پر ہی اسکرین اینڈ ساؤنڈ اسٹوڈیو قائم ہو گیا۔ اب میں اپنے دوستوں کے ساتھ اکثر گھومنے پھرنے ان اسٹوڈیوز میں جایا کرتا۔ فلم ایکٹر بننے کا بھوت میرے سر سے اتر چکا تھا۔ کیونکہ میری پوری توجہ افسانہ نگاری کی طرف ہو گئی تھی۔

پھر ملتان روڈ پر شاہ نور اسٹوڈیو اور اس کے بعد ایور نیو اسٹوڈیوز تعمیر ہو گئے۔ اور پاکستان کی فلم انڈسٹری ترقی کی منزلیں طے کرتی گئی۔ لیکن ابھی میں اس پرانے لاہور کی بات کر رہا ہوں جو

ابھی پاکستان کے پہلے مہینوں میں سے گزر رہا تھا۔ یہ ۴۸۔۱۹۴۷ء کا زمانہ تھا۔ لاہور کی فلمی سرگرمیوں کا مرکز رائل پارک ابھی تقریباً خالی پڑا تھا۔ اس زمانے میں مشہور شاعر ساحر لدھیانوی بھی لدھیانے سے ہجرت کر کے لاہور آ گیا۔ ہم کچھ دوستوں نے رائل پارک میں ایک بلڈنگ کے نچلے حصے پر قبضہ کر رکھا تھا۔ میں احمد راہی اور عارف عبدالمتین اسی جگہ راتیں بسر کرتے۔ ابھی کسی کا کوئی مستقل ٹھکانا نہیں بنا تھا۔ ساحر لدھیانوی بھی ہمارے ہاں آ گیا۔ متروکہ بلڈنگ کا یہ نچلا پورشن دو کمروں، ایک کچن اور ایک باتھ روم پر مشتمل تھا۔ کچن میں ہم کبھی نہیں گئے تھے۔ کچھ یاد نہیں کہ ہم روٹی کہاں کھاتے تھے۔ ہمارے پاس پیسے بھی واجبی سے ہوتے تھے۔ کبھی سگریٹ ختم ہو جاتے تو کمرے میں گرے ہوئے سگریٹوں کے ٹکڑے ہی پی کر گزارا کر لیتے تھے۔ بعد میں ساحر لدھیانوی کو ایبٹ روڈ والے نشاط سینما کے سامنے لال رنگ کی ایک لمبی چوڑی کوٹھی الاٹ ہو گئی اس کے آدھے حصے میں ابن انشا کی فیملی رہنے لگی۔

اس زمانے کے لاہور کی یادیں بھی بڑی خوشگوار اور کبھی نہ بھلائی جانے والی ہیں۔ اب نشاط سینما کی جگہ ایک مارکیٹ بن گئی ہے۔ لال کوٹھی کے سامنے کڑاہی تکے والوں کے کھوکھوں کی قطاریں دکھائی دیتی ہیں۔ ان کھوکھوں نے لال کوٹھی کو بہت حد تک نظروں سے چھپا دیا ہے۔ مگر اس زمانے میں یہ کوٹھی سڑک سے صاف نظر آتی تھی۔ ایک جانب کیپٹل سینما کی دیوار کے ساتھ کوٹھی کی ایک انیکسی تھی یہ پیگوڈا کی طرز کی تھی اور ابن انشا اسی جگہ رہتا تھا۔ میں ابن انشا سے ملنے جاتا تو اس کے والد صاحب چھوٹے سے صحن میں چارپائی پر بیٹھے حقہ پی رہے ہوتے۔ بڑے خاموش طبع شفیق بزرگ تھے۔ وہ پگڑی باندھا کرتے تھے۔ میں نے کبھی انہیں اونچی آواز میں بولتے نہیں سنا تھا۔

اپنے ادبی دوستوں سے ہٹ کر میری لاہور کی فلمی صنعت سے تعلق رکھنے والے شاعروں اور کہانی نویسوں اور فنکاروں سے بھی دوستی تھی۔ فلمی کہانی نویس تو خال خال ہی نظر آتا۔ شاعروں میں تنویر نقوی، حزیں قادری اور بابا سیاہ پوش رائل پارک کے ریستورانوں میں آ کر بیٹھا کرتے تھے۔ رائل پارک میں دو بڑے مشہور متروکہ ہوٹل ہوا کرتے تھے۔ ایک نام ویسٹ اینڈ ہوٹل اور دوسرے کا نام مجھے اس وقت یاد نہیں آ رہا۔ ان ہوٹلوں کے اوپر کا کچھ حصہ فسادات کی آگ میں جل گیا تھا۔ اونچی چھت والا لمبا سا ہال کمرہ ہوتا تھا۔ ویسٹ اینڈ ہوٹل تھا جہاں گرمیوں کے موسم

میں بڑی خوشگوار ٹھنڈک ہوتی۔ پنکھا چلانے کی کبھی کبھی ہی ضرورت پڑتی تھی۔ یہاں میری ملاقات پہلی بار پاکستان فلم انڈسٹری کی پنجابی فلموں کے ولین مظہر شاہ اور اسد بخاری سے ہوئی۔ دونوں بڑے خوش لباس، خوش اطوار اور خوش گفتار تھے۔ بڑا اعلیٰ ادبی ذوق رکھتے تھے۔ اساتذہ کے بے شمار معیاری شعر انہیں یاد تھے۔ مظہر شاہ کو میں نے اکثر تھری پیس سوٹ میں دیکھا۔ اسد بخاری ابھی نوجوان تھا اور اداکاری کی ابتدا ابھی نہیں کی تھی۔ بڑا صحت مند، خوب صورت اور ادبی گفتگو کرنے والا نوجوان تھا۔

اب یاد آ گیا۔ رائل پارک کے اس پرانے لاہور کے دوسرے ہوٹل کا نام برسٹل ہوٹل تھا۔ ابراہیم جلیس کراچی چلا گیا تھا۔ جب بھی لاہور آتا تو اسی برسٹل ہوٹل کے ایک چھوٹے سے کمرے میں ٹھہرا کرتا۔ ہم دوست اس سے ملنے جاتے تو وہ بلند بانگ قہقہوں سے ہمارا خیر مقدم کرتا۔ ہم الماریوں کی تلاشی لے کر کہیں نہ کہیں سے بیئر کی کوئی بوتل نکال کر وہیں پی جاتے۔ سدھیر، سنتوش اس زمانے کے خوش شکل اور مقبول ہیرو تھے۔ سیف الدین سیف، قتیل شفائی، تنویر نقوی، حزیں قادری اور احمد راہی لوگوں کے پسندیدہ فلمی نغمہ نگار تھے۔ موسیقاروں میں ماسٹر عنایت حسین، ماسٹر غلام حیدر، رشید عطرے اور بابا چشتی کا بڑا شہرہ تھا۔ ابھی شاہ نور اسٹوڈیوز کی بنیادیں اٹھائی جا رہی تھیں۔ شوٹنگ زیادہ تر پنجاب آرٹ اسٹوڈیو یعنی سابقہ پنچولی آرٹ اسٹوڈیوز اور اسکرین اینڈ ساؤنڈ اسٹوڈیو میں ہی ہوتی تھیں۔ لاہور میں ابھی تک انڈین فلمیں سینما ہالوں میں چلتی تھیں۔ شام کو تقریباً ہر دوسرے روز ہمارا فلم اسٹوڈیوز کا چکر لگتا تھا۔ پاکستان کی فلم انڈسٹری ابھی اپنے ابتدائی دور میں تھی۔ شوٹنگ کے لیے آج کی طرح جدید ترین سہولتیں میسر نہیں تھیں۔ سیٹ معمولی پلائی وڈ یا گتے کے لگائے جاتے جن میں ملتانی مٹی کا پوچا پھیر دیا جاتا۔ لیکن اس زمانے کے کیمرا مین، سیٹ ڈیزائنر، آرٹ ڈائریکٹر، فلم ایکٹر اور ہدایت کار وغیرہ بڑے قابل لوگ تھے۔ یہ ان ہی کی قابلیت اور محنتوں کا نتیجہ ہے کہ آج ہماری فلم انڈسٹری اتنی ترقی کر گئی ہے اور کر رہی ہے۔ یہ لوگ بڑی لگن سے کام کرتے تھے۔ ان میں جوہر قابل کی بھی کمی نہیں تھی۔ ناموافق حالات میں بھی انہوں نے اس زمانے میں ایسی معیاری فلمیں ہٹ کرائیں کہ جن کے آگے سینما ہالوں میں لگی ہوئی انڈین فلموں کے چراغ بھی گل ہو گئے۔

بعد میں انور کمال پاشا، خواجہ خورشید انور، سیف الدین سیف اور نذیر اجمیری جیسے اعلیٰ

پائے کے ہدایت کاروں نے ہماری فلمی صنعت کو بلاشبہ بہت آگے بڑھایا۔ خواجہ خورشید انور کی منفرد دھنیں تو پہلے ہی انڈیا میں اپنے جھنڈے گاڑ چکی تھیں۔ پاکستان آ کر انہوں نے نہ صرف درجہ کمال کی فلمی دھنیں بنائیں بلکہ بعض فلموں کی بڑی کامیاب ہدایت کاری بھی کی۔ ان کے ساتھ ہی حسن لطیف ایسے مایہ ناز موسیقاروں نے بھی ہماری فلمی صنعت کی اپنے خون جگر سے آبیاری کی۔ ایسے ایسے دیو پیکر فنکار، موسیقار، شاعر اور ہدایت کار اس زمانے میں ہماری فلم انڈسٹری میں کام کر رہے تھے کہ ان کے لیے میدان چھوٹا تھا۔ فلم ایڈیٹروں میں علی صاحب اور ایم اکرم تھے کہ جنہیں اپنے فن میں کمال حاصل تھا۔ انور کمال پاشا کے یونٹ نے ہماری پاکستانی فلمی صنعت کو کئی نئے چہرے دیے جو بعد میں پردۂ سیمیں پر چاند سورج بن کر چمکے۔

ان لوگوں کو کام کرتے دیکھتے انسان بہت کچھ سیکھتا ہے۔ وہ اتنے کمرشل نہیں تھے۔ انہیں ہر دم فن کی عظمت کا خیال رہتا تھا۔ روپے پیسے کی بھی اتنی فراوانی نہیں تھی۔ فنکاروں میں روپے کی ہوس بھی نہیں تھی۔ ہر کوئی اپنے شوق کی خاطر بہتر سے بہتر اداکاری کرتا۔ ابھی گلبرگ کا علاقہ بھی تعمیر نہیں ہوا تھا۔ سمن آباد میں صرف پکی کھتی والی قطار کے کوارٹر ہی بنے تھے۔ شاہ عالمی کے اندر ہر طرف ملبے کے اونچے اونچے ٹیلے نظر آتے تھے۔ یہ ملبہ ٹرکوں ٹرالیوں اور گدھوں کے ذریعہ سمن آباد اور گلبرگ کی تعمیر کے لیے لے جایا جا رہا تھا۔ فلم انڈسٹری میں جہاں نامور اور ذمہ دار شخصیتیں مصروف کار تھیں وہاں بعض نقلی لوگ بھی گھس آئے تھے جن کا کام فلم میں ہیرو بننے کا شوقین لڑکوں کو ایکسپلائیٹ کر کے اپنا الو سیدھا کرنا ہوتا تھا۔ یہ نقلی لوگ کوئی جرائم پیشہ نہیں تھے۔ بعض موقعوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے فلمی دنیا کے ماحول میں آ گئے تھے۔ بڑے فنکاروں کے ساتھ کسی نہ کسی طرح اپنی تصویریں اتروا لیتے۔ بعد میں یہ تصویریں فلم میں ہیرو بننے کے شوقین لڑکوں کو دکھا کر کہتے کہ یہ دیکھو۔ میاں صاحب کے پاس میں بھی موجود ہوں۔ یہ ڈائریکٹر تو میرے بغیر ایک سین شوٹ نہیں کرتا۔ تمہیں ان سے کہہ کر اگلی فلم میں چانس دلوا دوں گا۔

ہیرو بننے کے شوق میں یہ لڑکے انہیں ہوٹلوں میں کھانا کھلاتے۔ ان پر روپے خرچ کرتے۔ اگر موقع مناسب ہوتا تو یہ نقلی ہدایت کار لڑکوں سے ہزار بارہ سو روپے بھی ہتھیا لیتے۔ فلم اسٹوڈیوز کے دو چار چکر لگواتے اور پھر غائب ہو جاتے۔

ان نقلی ہدایتکاروں میں ایک بڑا دلچسپ آدمی ہوا کرتا تھا۔ وہ بڑا اباتونی تھا۔ ایک بار وہ رائل

پارک کے ایک ہوٹل میں اپنے نقلی اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے ساتھ بیٹھا تھا۔ دونوں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ دونوں کسی فلمی مریض کی تلاش میں تھے۔ ان دنوں فلم میں کام کرنے کے شوقین بھی اکثر ہوٹلوں میں نکل آیا کرتے تھے۔ اس روز بھی ہوٹل میں ایک خوش شکل لڑکا ہیرو کی طرح بال ماتھے پر ڈالے وہاں آ گیا۔ اس نے اپنے بالوں کا اسٹائل دلیپ کمار کی طرح بنایا ہوا تھا۔ اس زمانے میں دو ہیئر اسٹائل بہت مشہور تھے۔ ایک دلیپ کمار کا اور دوسرا ہماری فلمی دنیا کے پہلے اور نامور ہیرو وحید مراد کا اسٹائل۔ نقلی ڈائریکٹر نے لڑکے کو دیکھتے ہی اپنے اسسٹنٹ سے کہا:

''ہیرو آ گیا ہے۔ کیمرا تیار کرلو۔ میں سین شوٹ کرنے لگا ہوں۔''

جوں ہی لڑکا ایک خالی میز پر بیٹھا نقلی ڈائریکٹر بھی اپنے اسسٹنٹ کو لے کر اس کے پاس جا بیٹھا، اور ہاتھوں سے کیمرے کا فریم بنا کر اسے کبھی ادھر سے کبھی ادھر سے دیکھنا شروع کر دیا۔ جیسے جائزہ لے رہا ہو کہ اس لڑکے کا چہرہ فلم میں کس طرح شوٹ کیا جانا چاہیے۔ لڑکا فوراً سمجھ گیا کہ یہ کوئی فلم ڈائریکٹر ہے۔ نقلی ڈائریکٹر نے لڑکے کے بالوں کو ذرا سا پیچھے کرتے ہوئے کہا:

''سر اس کا فیس دلیپ کمار سے بڑا ملتا ہے۔ اسے اپنی اگلی فلم میں ہیرو کا چانس ضرور دے دیں۔''

لڑکے کا چہرہ خوشی سے لال ہو گیا۔ بڑا خوش ہوا کہ آج قسمت کھل گئی ہے۔ نقلی ڈائریکٹر نے بڑے پراعتماد لہجے میں لڑکے سے پوچھا، ''تم پہلے کبھی کیمرے کے سامنے آئے ہو۔''

لڑکا بولا، ''نہیں سر۔ مگر مجھے شوق بہت ہے۔''

نقلی ڈائریکٹر نے چٹکی بجا کر کہا:

''میں تمہیں ایک ہی فلم میں شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دوں گا۔ تم وحید مراد سے بھی آگے نکل جاؤ گے۔ پروڈیوسر، ڈائریکٹر چیک لیے تمہارے پیچھے پیچھے پھریں گے۔ لیکن میری ایک شرط ہے۔''

لڑکے نے جلدی سے پوچھا:

''وہ کونسی سر۔ مجھے ہر شرط منظور ہے۔''

نقلی ڈائریکٹر نے کہا:

''تمہیں میرے ساتھ پانچ سال کا کنٹریکٹ کرنا ہوگا۔ یعنی تم پانچ سال تک صرف

میری فلموں میں ہی کام کرو گے۔"

لڑکا تو خوشی سے نہال ہو رہا تھا۔ بولا:

"سر! میں ساری زندگی صرف آپ کی فلموں میں ہی کام کروں گا۔"

نقلی ڈائریکٹر بولا:

"ایک اور بات...... پہلی فلم میں تمہیں زیادہ معاوضہ نہیں ملے گا۔ صرف پچاس ہزار روپے ہی دے سکوں گا۔ بیس ہزار ایڈوانس اور باقی رقم قسطوں میں یعنی شوٹنگ ڈیٹ پر ملتی رہے گی۔"

فلم کے شوقین نوجوان کے تو زمین پر پاؤں نہیں ٹکتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو پاکستان کے سب سے بڑے ہیرو کی شکل میں دیکھ رہا تھا۔ دوسری طرف بھوک کے مارے نقلی ڈائریکٹر اور اس کے اسسٹنٹ کا برا حال ہو رہا تھا۔ دوپہر کے دو بج رہے تھے اور انہوں نے صبح ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔ جیب میں سگریٹ تک خریدنے کے لیے پیسے نہیں تھے۔ تب نقلی ڈائریکٹر نے کہا:

"میں تمہارا اسکرین ٹیسٹ تو شام کو اسٹوڈیو میں جا کر لے لوں گا۔ اس وقت صرف ایک معمولی ٹیسٹ لیتا ہوں۔ کیا تم تیار ہو؟"

لڑکے نے سینہ پھلا کر کہا:

"بالکل تیار ہوں سر۔ آپ جو ڈائیلاگ چاہیں بلوا کر دیکھ لیں۔"

نقلی ڈائریکٹر بولا:

"اس وقت تمہیں ایک سین کرنا ہو گا۔ فرض کر لو تم میری فلم میں ایک نواب کا رول کر رہے ہو۔ تم اس ہوٹل میں آ کر بیٹھ گئے ہو تمہارے مہمان بھی تمہارے ساتھ ہیں۔ اب سین یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ تم اپنے مہمانوں کے لیے کھانے کا آرڈر دیتے ہو۔ سمجھ لو کہ کیمرا اسٹارٹ ہو گیا ہے۔ جلد ایک نواب کا کردار شروع کرو۔"

لڑکے نے اپنے بالوں میں بڑی نزاکت سے ہاتھ پھیرا اور بیرے کو فلمی نواب کے انداز میں بلا کر کہا:

"بیرا! یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اس وقت ہمارے مہمان یہاں موجود ہیں۔ ان کے لیے بہترین کھانے پیش کرو۔"

بیرے نے پوچھا:

"جناب کیا لاؤں؟"

نقلی ہیرو بولا:

"مرغ روسٹ، چکن کری، پلاؤ، قورمہ، روغنی نان، فرنی، پھل اور کریون اے کے چار پیکٹ۔"

نقلی ڈائریکٹر اور اس کے اسسٹنٹ کے منہ میں پانی بھر آیا۔ بیرے نے اسی وقت تمام کھانے اور سگریٹ وغیرہ لاکر میز پر سجادیے۔ نقلی ڈائریکٹر نے انگلی اٹھاکر کہا:

"کٹ اٹ۔ شاباش! تم پہلے ٹیسٹ میں پاس ہوگئے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارا اسکرین ٹیسٹ بھی بڑا اچھا ہوا۔"

نقلی اسسٹنٹ نے کہا:

"میاں جی! اس سے کنٹریکٹ ابھی سائن کروالیں۔"

نقلی ہدایت کار نے سرنفی میں ہلاتے ہوئے کہا:

"نہیں، ابھی نہیں۔ میں نے کچا کام کبھی نہیں کیا۔ کنٹریکٹ اسکرین ٹیسٹ کے بعد سائن کرواؤں گا۔"

نقلی ہیرو اور پکا ہوگیا کہ میں اب ہیرو بن جاؤں گا۔ اس نے کہا:

"سر اتنے کھانوں کا کیا کریں؟"

اسسٹنٹ نے آستین چڑھاتے ہوئے کہا:

"زہر مار کر لیتے ہیں اور کیا کریں۔ اب یہ کھانے ہوٹل والا واپس تو لے گا نہیں۔"

نقلی ہیرو خوش ہوکر بولا:

"سر اس سے زیادہ میری اور کیا خوش قسمتی ہوسکتی ہے۔

بسم اللہ کیجیے۔"

اور نقلی ڈائریکٹر جو صبح سے بھوکا تھا کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ اس کے بھوکے اسسٹنٹ نے بھی مرغن کھانے سے دو دو ہاتھ کرنے شروع کردیے۔ دیکھتے دیکھتے آدھے سے زیادہ کھانا ختم ہوگیا۔ یہ چار آدمیوں کی خوراک تھی جو وہ دونوں اکیلے آدھی سے زیادہ سے ہڑپ کر گئے تھے۔ پھر بھی وہ

مرغ روسٹ اور چھ روغنی نان بچ گئے۔ نقلی ڈائریکٹر نے بیرے کو بلا کر کہا:

''یہ دو مرغ روسٹ اور روغنی نان لفافے میں ڈال کر لے آؤ۔ کوٹھی میں ہمارے نوکر کھائیں گے۔''

نقلی ہیرو نے بڑے ادب سے پوچھا:

''سر میں اسکرین ٹیسٹ دینے کے لیے کوٹھی کس وقت حاضر ہو جاؤں؟''

نقلی ہدایت کار کریون اے کا دوسرا سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا:

''شام کو میری میڈم نور جہاں سے اپوائنٹمنٹ ہے۔ میں اگلی فلم میں میڈم کو ہیروئن سائن کر رہا ہوں۔ تم ایسا کرنا کہ رات آٹھ بجے شاہ نور کے پہلے فلور پر پہنچ جانا۔ میں وہاں پر موجود ہوں گا۔ اسی وقت تمہارا اسکرین ٹیسٹ لے لیں گے۔ او کے اب میں چلتا ہوں۔''

بیرے نے دونوں بچے ہوئے مرغ روسٹ اور چھ روغنی نان لفافے میں ڈال کر میز پر رکھ دیے تھے۔ نقلی ہدایت کار نے اپنے اسسٹنٹ سے کہا:

''اسے اٹھا لو۔ نوکر بھی آج کیا یاد کریں گے۔''

پھر انہوں نے نقلی ہیرو سے ہاتھ ملائے اور ہوٹل کے دروازے کی طرف بڑھے۔ اچانک اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے نقلی ہدایت کار نے اسسٹنٹ سے کسی قدر غصے میں کہا:

''احمق میرا بٹوا تم نے میرے کمرے میں ہی چھوڑ دیا تھا۔''

اسسٹنٹ نے بڑی عاجزی سے کہا:

''سر! اس میں دس ہزار کے نوٹ تھے۔ میں نے کہا کہیں راستے میں ادھر ادھر نہ ہو جائیں۔ اس لیے وہیں رہنے دیا۔''

نقلی ڈائریکٹر نے چلا کر کہا:

''اب ٹیکسی کا کرایہ تمہارا باپ دے گا۔''

نقلی ہیرو نے جلدی سے آگے بڑھ کر کہا۔

''سر! اگر آپ برا نہ مانیں تو میرے پاس کچھ پیسے ہیں۔ کیا میں پیش کر سکتا ہوں؟''

نقلی ہدایت کار نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

''یار میں نے کبھی ایسا کام نہیں کیا۔ لیکن خیر اب مجبوری ہے۔ لاؤ دے دو۔ رات اسٹوڈیو آؤ گے تو واپس کر دوں گا۔''

''ارے سر! اس کی کیا ضرورت ہے؟''

نقلی ہیرو نے جیب سے بٹوا نکالا اور سو سو کے دو نوٹ نکال کر نقلی ہدایت کار کے حوالے کر دیے۔ جب دونوں یعنی نقلی ہدایت کار اس کا اسسٹنٹ چلے گئے تو نقلی ہیرو لڑکا ہوٹل میں آکر بیٹھ گیا۔ بیرا بل لے آیا۔ نقلی ہیرو نے جیبیں ٹٹولنا شروع کر دیں اس نے بٹوے میں جتنی رقم تھی وہ نقلی ہدایت کار کے حوالے کر چکا تھا۔ نقلی ہیرو نے کہا۔

''بھائی! میں تمہارے مالک سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

بیرا اسے مالک کے پاس لے گیا۔ مالک کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھا یہ سارا ڈرامہ دیکھ رہا تھا۔ وہاں اس قسم کے نقلی سین اکثر شوٹ ہوتے رہتے تھے۔ جب فلم کے شوقین نقلی ہیرو نے ہوٹل کے مالک سے کہا کہ میرے پاس اس وقت بل ادا کرنے کے لیے رقم نہیں ہے۔ میں کل صبح ادا کر دوں تو مالک نے بڑے سکون سے جواب دیا۔

''فی الحال آپ ایسا کریں کہ اپنا یہ تھری پیس گرم سوٹ، بوٹ اور گھڑی اتار کر ہمیں دے جائیں۔ کل جب آپ پیسے لے کر آئیں گے تو اپنے کپڑے واپس لے جائیے گا۔''

نقلی ہیرو نے پریشانی سے کہا:

''لیکن میں گھر ننگا جاؤں گا۔''

ہوٹل کے مالک نے کہا:

''ہم آپ کو ایک پرانی دھوتی دے دیں گے۔''

پھر مالک نے اپنے دو ہٹے کٹے بیروں سے کہا:

''چلو بھئی! اس ہیرو کو اندر لے جا کر اس کے کپڑے اتروا لو۔''

بے چارا فلم میں ہیرو بننے کا شوقین نوجوان صرف دھوتی باندھے شرماتا گھبراتا اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ کسی نہ کسی طرح کہیں سے ادھار رقم لے کر واپس آیا۔ ہوٹل کا بل ادا کیا، اپنے کپڑے چھڑوا کر پہنے اور رات کو فلم اسٹوڈیو بھی پہنچ گیا۔ وہاں اسے دربان نے ہی اندر نہ جانے

دیا۔ جب اس نے نقلی ہدایت کار کا نام لے کر کہا کہ مجھے انہوں نے بلایا ہے تو دربان نے جھڑک کر کہا:

"ہم تو اس کو بھی اسٹوڈیو میں گھسنے نہیں دیتا تم کون ہو۔"

اس قسم کے ڈرامے اس زمانے کی فلمی دنیا میں آف دی اسکرین ہوتے ہی رہتے تھے۔ مجھے کچھ ایسے لوگوں کے چہرے بھی یاد ہیں جو اچھے خاصے شریف آدمی تھے اگر چاہتے تو زندگی کے کسی دوسرے میدان میں بڑی ترقی کر سکتے تھے لیکن فلم میں کام کرنے اور فلم بنانے کا شوق انہیں فلمی دنیا میں لے آیا اور پھر وہ کہیں کے نہ رہے۔ نہ وہ فلمی دنیا میں کوئی مقام حاصل کر سکے اور نہ ایک ذمہ دار شہری کی کامیاب زندگی ہی بسر کر سکے۔ فلم اسٹوڈیوز اور فلمی دفتروں کے چکر لگاتے لگاتے ایک روز عالم گمنامی میں مر گئے اور پھر کسی نے انہیں یاد بھی نہ کیا۔ لیکن مجھے آج بھی وہ یاد ہیں۔ اور یہاں ان میں سے دو ایک کا ذکر ضرور کروں گا۔

پہلے میں آپ کی ملاقات درمیانے قد کے غلافی آنکھوں اور مضبوط ہموار دانتوں والے سانولے شخص سے کرانا چاہتا ہوں۔ اس کا اصلی نام مجھے معلوم نہیں ہو سکا۔ فلمی دنیا میں لوگ اسے مالٹا کے نام سے پکارتے تھے۔

جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تو وہ جوانی کی منزل سے گزر رہا تھا۔ مدھم لہجے میں مسکرا مسکرا کر بات کرتا تھا۔ کوٹ پتلون میں ملبوس ہوتا۔ ہر کسی سے بڑی انکساری سے ملتا۔ عاجزی سے جھک کر سلام کرتا۔ کوئی بیٹھنے کو کہتا تو بیٹھ جاتا۔ چلے جانے کو کہتا تو جیسے آتا ویسے ہی چلا جاتا۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے وہ صوبہ بہار کا رہنے والا تھا۔ فلموں میں کام کرنے کا شوق اسے فلمی دنیا میں کھینچ کر لے آیا تھا۔ ایسے لوگ عام طور پر کسی فلمی یونٹ سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ یونٹ کے لوگوں کی خدمت کرتے ہیں۔ پان سگریٹ لاتے ہیں۔ ہر ادنیٰ سے ادنیٰ کام کرتے ہیں۔ لوگوں کی ڈانٹ ڈپٹ مسکرا مسکرا کر سہتے ہیں۔ کوئی گالی بھی دے تو آگے سے ہنس دیتے ہیں۔ انہیں عام طور پر یونٹ میں ہیرو کہہ کر طنزیہ انداز میں پکارا جاتا ہے۔ ان کو صرف اتنا لالچ ہوتا ہے کہ جب کوئی فلم سیٹ پر جاتی ہے تو کسی نہ کسی سین میں انہیں نوکر، چپراسی یا بازار میں کیمرے کے سامنے سے گزر جانے والے کا پارٹ مل جاتا ہے۔ وہ اسی ایک ناقابل ذکر معمولی سے رول کے لیے ساری ذلتیں برداشت کرتے ہیں۔

مالٹا کسی یونٹ سے وابستہ نہیں تھا۔ وہ تقریباً ہر فلم کمپنی کے دفتر کا پھیرا مارتا۔ جھک کر کمرے میں بیٹھے ہوئے ہر آدمی کو سلام کرتا۔ پھر ادب سے ہاتھ باندھ کر دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو جاتا۔ پروڈیوسر یا ہدایت کار یا اس کا اسسٹنٹ اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کرتا۔ اگر نظر پڑ جاتی تو تیوری چڑھا کر پوچھتا، ''تم کیوں کھڑے ہو؟'' مالٹا انکساری سے مسکراتا اور دھیمے لہجے میں کہتا۔

''سر سلام کرنے آیا تھا۔''

''ٹھیک ہے جاؤ۔''

اور مالٹا جھک کر سلام کرتا اور چلا جاتا۔ وقت گزرتا گیا۔ مالٹا کو ایک دو بار میں نے کسی فلم کے سین میں بازار میں سے گزرتے یا ہیرو کے کمرے میں پانی کا گلاس لاتے دیکھا۔ مالٹا اس سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اسے زندگی کے میدان میں کوئی دوسرا کام کرنا چاہیے تھا۔ مگر فلم میں کام کرنے کا شوق اسے بھی ایک مہلک مرض کی طرح لگ گیا تھا۔ اب وہ بھی کسی اور کام کے لائق نہیں رہا تھا۔ وہ لوگوں کے مذاق اور تضحیک کا نشانہ بن گیا۔ فلمی دنیا میں اکثر لوگ اسے مذاق مذاق میں گالی بھی دے دیتے۔ مالٹا آگے سے صرف ہنس دیتا۔ زیادہ گالیاں دیتے تو جھک کر سلام کرتا اور چلا جاتا۔

پھر ایک دن پتہ چلا کہ مالٹا زور سے سگریٹ کا دھواں اپنے سینے میں کھینچ لیتا ہے۔ فاقہ مستی کے عالم میں تو وہ رہتا ہی تھا۔ مگر میں نے کبھی اسے کسی سے پیسے مانگتے نہیں دیکھا تھا۔ سگریٹ وہ شروع سے لے کر آخر تک اس انہماک سے پیتا کہ لگتا یہ اس کی زندگی کا آخری سگریٹ ہے۔ ایک دن میں نے اس کا یہ کرتب بھی دیکھ لیا۔ میں باری اسٹوڈیو کے ایک فلمی دفتر میں بیٹھا تھا کہ وہاں مالٹا بھی آ گیا۔ حسب عادت دروازے کے باہر ہی سے سر جھکا کر کمرے میں بیٹھے سب لوگوں کو سلام کیا۔ پھر وہیں کھڑا رہا کہ اجازت ملے تو اندر آؤں۔

پروڈیوسر نے کہا، ''آؤ آؤ مالٹے۔ حمید صاحب کو بھی اپنا کرتب دکھاؤ۔''

مالٹا مجھ سے بھی اکثر سلام علیک لے لیتا۔ شاید اسے پتہ چل گیا تھا کہ میں اس کا احترام کرتا ہوں۔ اس کے لیے یہ بڑی حیرت کی بات تھی۔ مگر وہ خودداری، اپنی شخصیت کے احترام کی منزل بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ اب حالت یہ تھی کہ اگر کوئی غلطی سے اسے سلام کر بیٹھتا تو مالٹا پلٹ کر پیچھے دیکھنے لگتا کہ اس شخص نے کس کو سلام کیا ہے۔ اسے یقین ہی نہیں رہا تھا کہ کوئی اسے بھی سلام کر سکتا ہے۔ اس کا بھی احترام کر سکتا ہے۔ خیر مالٹا اندر آ گیا۔ پروڈیوسر نے سگریٹ سلگا لیا۔ مالٹا کو چھ

سات قدموں کے فاصلے پر کمرے کے کونے میں رکھی کرسی پر بٹھا دیا۔ مالٹے نے اشارہ کیا۔ ”سر آپ کش لگائیں۔“

پروڈیوسر نے کش لگا کر دھواں اپنے سر سے اوپر کی طرف پھینکا۔ جوں ہی دھواں پروڈیوسر کے منہ سے نکلا مالٹے پر تشنج کی حالت طاری ہوگئی۔ اس کی گردن کی رگیں پھول گئیں۔ ہونٹ بھینچ گئے اور پھر اس نے زور سے سانس اپنے اندر کی طرف کھینچا۔ میں نے اچھی طرح دیکھا کہ سگریٹ کے دھوئیں کی ایک لہر بھی مالٹے کی طرف نہیں گئی تھی۔ مگر مالٹے نے جب سانس پھیپھڑوں سے باہر پھینکا تو اس کے منہ سے سگریٹ کا ہلکا ہلکا دھواں نکل رہا تھا۔ یوں دو تین بار اس نے تشنج کی حالت میں سانس اندر کھینچا اور ہر بار پروڈیوسر کے منہ سے اگلا ہوا دھواں مالٹے کے پھیپھڑوں سے باہر نکل رہا تھا۔ یہ کوئی شعبدہ نہیں تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ذلتوں کے مارے ہوئے اس شخص کے اندر یہ صدیوں کی سگریٹ کی طلب تھی جس نے اس کی ساری شخصیت، سارے وجود کو سگریٹ کے دھوئیں کا جاروب کش بنا دیا تھا۔

میرے دیکھتے دیکھتے مالٹا بوڑھا ہونے لگا۔ اس کے بال سفید ہونا شروع ہوگئے۔ وقت سے بہت پہلے اس کی جوانی ڈھل رہی تھی۔ جوانی میں اسے کسی نے نہ پوچھا تھا بڑھاپے میں اسے کون پوچھتا۔ پھر وہ فلمی دنیا میں کم کم نظر آنے لگا۔ اور کچھ عرصے بعد روپوش ہوگیا۔ یہ چند مہینے پہلے کی بات ہے میں ایک فلمی رسالے کے دفتر میں بیٹھا تھا کہ کسی نے مجھے بتایا کہ مالٹا مر گیا ہے۔ مالٹا بہت پہلے مر چکا تھا۔ فلم کے دفتروں اور اسٹوڈیوز میں ہر روز اس کی تھوڑی تھوڑی موت واقع ہوتی رہتی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ جب موت سامنے آئی ہوگی تو مالٹے نے اسے بھی بڑی عاجزی، بڑی انکساری سے جھک کر سلام کیا ہوگا۔ اور مسکراتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا ہوگا۔

دوسرا چہرہ بابا قلندر کا ہے۔ نام اس کا کچھ اور تھا مگر سب اسے بابا قلندر ہی کہہ کر بلاتے تھے۔ میں جس فلم کی کہانی لکھ رہا تھا بابا قلندر اس کے ڈائریکٹر کا تھرڈ اسسٹنٹ تھا۔ وہ راولپنڈی سے یہ ارادہ لے کر لاہور آیا تھا کہ بہت بڑا فلم ڈائریکٹر بنے گا۔ مگر اس نے بھی اپنی صلاحیتوں کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ وہ اپنی اس کوالٹی پر فخر کر رہا تھا جو اس کے اندر سرے سے موجود ہی نہیں تھی۔ وہ اگر چاہتا تو راولپنڈی میں کوئی دوسرا کام کر سکتا تھا اور ایک شریف شہری کی طرح روزی کما کر اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پال سکتا تھا۔ لیکن اسے بھی فلم کا مرض لاحق ہوگیا۔ وہ خیال ہی خیال میں اپنے

آپ کو پاکستان کی فلم انڈسٹری کا سب سے بڑا ڈائریکٹر سمجھنے لگا۔ مجھ سے باتیں کرتے ہوئے وہ بار بار اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کا چوکھٹا بنا کر فریم بناتا اور پھر سر جھٹک کر کہتا:

''بس چانس ملنے کی دیر ہے۔ فلم کی ایسی اوپننگ کروں گا کہ لوگ بکے بکے ہو کر رہ جائیں گے۔''

اپنی باتوں میں بھی وہ فلمی اصطلاحیں کثرت سے استعمال کرتا۔

''یہاں سے ڈی زالو [Desolve] کرتا ہوں تو راولپنڈی کے بازار میں جا رہا ہوں۔ وہ آدمی دوبارہ مجھے نظر آ گیا۔ میں کٹ کر کے ساتھ والی گلی میں گھس گیا۔ یہاں سے ٹائم لیپس [Time lapse] دیا تو شام کو وہی آدمی میرے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔''

اس پر کوئی نہ کوئی تنگ آ کر کہہ اٹھتا:

''بابا قلندر اب اس سین کو وائنڈ اپ کر دو۔''

اس زمانے میں تھرڈ اسسٹنٹ کی کیا تنخواہ ہو گی بھلا۔ بابا قلندر بھی فاقہ کشی میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ مگر وہ خوددار تھا اور کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی اس کی عادت نہیں تھی۔ جب وہ پنڈی سے آیا تھا تو اس کے گھنے بال سیاہ تھے۔ اب وہ سفید ہونے لگے تھے۔ وہ جس فلم یونٹ کے ساتھ وابستہ تھا وہ ٹوٹ گیا۔ بابا قلندر کو کوئی دوسرا یونٹ کیسے برداشت کرتا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بابا قلندر کی تعلیم بہت کم تھی اور اسے فلم کا ٹیکنیکل تجربہ بھی نہیں تھا۔

بابا قلندر طبعاً ان گھڑ آدمی تھا۔ فلمی دنیا میں ان گھڑ آدمی کی حیثیت میرے خیال کے مطابق ایسی ہی ہے جیسے ملاحوں اور غوطہ خوروں کی بستی میں کوئی اَن تارو آ کر رہنے لگے۔ بابا قلندر ادھر ادھر ڈولتا پھرتا۔ کسی فلم یونٹ نے اسے اپنے پاس نہ بلایا۔ بابا قلندر اس وقت بھی اگر چاہتا تو پنڈی جا کر کوئی دوسرا کام شروع کر کے اپنی زندگی کو سنبھالا دے سکتا تھا۔ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکتا تھا۔ مگر وہی بات کہ اس نے بھی اپنی صلاحیتوں کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ اور وہ بھی اس وہم میں مبتلا ہو گیا تھا کہ وہ بہت بڑا فلم ڈائریکٹر بنے گا اور فلمی دنیا میں انقلاب برپا کر دے گا۔ حالانکہ اس میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک روز بابا قلندر بھی فاقہ کشی کے عالم میں اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ مرنا تو ایک روز سبھی نے ہے۔ لیکن وہ موت بڑی اچھی اور نیچرل ہوتی ہے جو آدمی کو اپنے اڈے پر

آئے۔ بابا قلندر بھی مالٹے کی طرح اپنے اڈے کو چھوڑ بیٹھا تھا۔ میرے دوست مسعود سلطان نے مجھے بتایا کہ آخری دنوں میں بابا قلندر کی بڑی خراب حالت تھی۔ اس کے پاس دوائی کھانے کے لیے بھی پیسے نہیں تھے۔

اسی طرح میں نے بعض ایسی عورتوں کو دیکھا ہے کہ جو فلموں میں ہیروئن کا رول ادا کرنے کے لیے فلم کی دنیا میں داخل ہوئیں اور جب فلمی دنیا نے انہیں اسٹوڈیو سے باہر پھینک دیا تو ان کی شکل نہیں پہچانی جاتی تھی۔ میرے سامنے کئی ایسی مثالیں ہیں۔ میں ان عورتوں کا نام لے کر ذکر نہیں کرنا چاہتا۔ کیونکہ ان میں سے اکثر انتقال کر چکی ہیں یا جو زندہ ہیں وہ عبرت انگیز بڑھاپا گزار رہی ہیں۔ میں نے بھی ہر رنگ کی محفلیں دیکھی ہیں۔ ان محفلوں میں بیٹھا ہوں۔ خود بھی تماشا بنا ہوں اور دوسروں کا بھی تماشا دیکھا ہے۔ ایک بار ہم کچھ فلمی دوست رات کے ایک بجے رائل پارک کے ایک کمرے میں بیٹھے تھے۔ فضا سگریٹ کے دھویں اور ایک خاص قسم کی خوشبو سے بوجھل ہو رہی تھی۔ میں یہاں اس چیز کا نام نہیں لینا چاہتا کہ اچانک ایک عورت دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔ وہ نشے میں دھت تھی۔ ہماری محفل میں اس کا ایک چاہنے والا بھی بیٹھا تھا۔ اس نے جلدی سے عورت کو سنبھالا۔ ہم نے اس طرف کوئی خاص توجہ نہ دی۔ کیونکہ اس ماحول میں ایسا اکثر ہوتا ہی رہتا تھا اور ہم اس قسم کے مناظر کے دیکھنے کے عادی تھے۔ مخمور عورت کے عاشق نے ہماری طرف دیکھ کر آنکھ ماری اور کہا:

''یہ کٹ کر کے کہاں سے آ گئی ہے۔''

پھر خدا جانے کیا بات ہوئی کہ اس عاشق نامدار نے اپنی محبوبہ کو پیٹنا شروع کر دیا۔ وہ اسے اتنی زور سے مکے مارنے لگا کہ عورت کی چیخیں نکل گئیں۔ عاشق نامدار نے عورت کو زدوکوب کر کے کمرے سے نکال دیا اور اسے گالیاں دینے لگا۔ عورت بھی باہر خالی بازار میں کھڑی اسے فحش گالیاں دیتی رہی۔ رات گزر گئی۔ دوسرے روز شام کو اس عورت سے اسٹوڈیو میں میری ملاقات ہو گئی۔ اس کی ایک آنکھ سوجی ہوئی تھی۔

وہ ایک میوزک ڈائریکٹر کے گمنام سے سازندے کے پاس بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ میں نے اس کا حال پوچھا۔ اسے رات کی ساری مار پیٹ یاد تھی۔ ہنس کر کہنے لگی:

''آنکھ سوج گئی ہے۔ میں نے بھی اس کی خوب مرمت کی۔ یہ تو چلتا ہی رہتا ہے۔ تم

سناؤ تمہارا کیا حال ہے؟"

اس عورت نے بھی اپنے ضمیر کو اپنی طرف سے ہلاک کر دیا ہوا تھا۔ مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ ضمیر کے محسوسات کچھ دیر کے لیے معطل تو ہو جاتے ہیں مگر وہ مرتا نہیں۔ جس طرح آپ جونک کو درمیان سے کاٹ کر دو ٹکڑے کر دیں۔ وہ مرے گی نہیں، بلکہ ایک کی بجائے دو جونکیں بن جائیں گی اور دونوں رینگنا شروع کر دیں گی۔ فلموں میں ہیروئن بننے کا شوق لے کر آئی ہوئی یہ عورت اب یقیناً بوڑھی ہو گئی ہو گی۔ اس کے جسم کے زخم تو ٹھیک ہو گئے ہوں گے مگر ضمیر کے زخم، روح کے زخم اب بیدار ہو رہے ہوں گے۔ وہ ان کی ٹیسیں محسوس کر رہی ہو گی۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے اور ہم سب کے گناہ معاف کرے اور ہمیں سیدھی راہ دکھائے اور اس راستے پر چلنے کی توفیق عطا کرے جس پر چل کر انسان پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔

فلموں میں کام کرنے والی ایکسٹرا عورتوں کی زندگیاں بڑے دردناک اور عبرت انگیز سبق پیش کرتی ہیں۔ اس وقت میں ان کی زندگی کے واقعات کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ میں صرف قیام پاکستان کے وقت لاہور کی فلم انڈسٹری کے حالات بیان کر رہا ہوں۔

پھر بھی ایک ایکسٹرا گرل کا ذکر ضرور کروں گا۔ میں اس کا نام نہیں لکھوں گا۔ ایکسٹرا عورتیں از خود فلموں میں کام کرنے نہیں آتیں بلکہ ان کے ایجنٹ یا ٹھیکیدار انہیں فلموں میں لاتے ہیں۔ فلم کا پروڈکشن منیجر ان ایجنٹوں کو کہتا ہے کہ مجھے اس وقت رقص کے لیے دس ایکسٹرا لڑکیاں چاہییں اور ایجنٹ دس ایکسٹرا رقاصائیں مہیا کر دیتا ہے۔ وہ ساری لڑکیوں کے کام کا معاوضہ خود وصول کرتا ہے اور اس میں سے آدھی رقم اپنی کمیشن کے طور پر کاٹ کر باقی ایکسٹرا لڑکیوں کو دے دیتا ہے۔ ان ایجنٹوں کو ایکسٹرا سپلائر بھی کہتے ہیں۔ عام طور پر یہ ایکسٹرا لڑکیاں یا عورتیں عام شکل و صورت کی ہوتی ہیں اور اپنی ماؤں یا نانیوں کے ساتھ اسٹوڈیو میں آتی ہیں۔ کئی اپنے گودی کے بچے بھی ساتھ لے آتی ہیں۔ جو ساری رات اپنی نانی دادی کی گودی میں پڑے اسٹوڈیو کی سردی میں ٹھٹھرتے رہتے ہیں۔ فلم کی ہیروئن کے لیے سیٹ پر تھوڑی تھوڑی دیر بعد گرم چائے آتی ہے مگر ان ایکسٹرا لڑکیوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ انہیں اپنے پیسوں سے چائے منگوانی پڑتی ہے جو اکثر اوقات گھنٹہ گھنٹہ دیر سے انہیں ملتی ہے۔ ان میں جو لڑکی ذرا اچھی شکل و صورت کی ہو وہ ہیروئن بننے یا سائیڈ ہیروئن کے طور پر آنے کی خواہش مند ہوتی ہے اور اس مقام تک پہنچنے کے لیے جدوجہد

شروع کر دیتی ہے۔ بعض اوقات کوئی عورت ہیروئن بن بھی جاتی ہے۔ لیکن اکثر اس سنگلاخ وادی میں ٹھوکریں کھانے کے لیے چھوڑ دی جاتی ہیں۔

ایسی ہی وہ ایکسٹرا لڑکی بھی تھی جس کا میں یہاں ذکر کرنے والا ہوں۔ اس کا فرضی نام زبیدہ سمجھ لیں۔ ۱۹۵۲ء کی بات ہے میں ایک فلم کے مکالمے لکھ رہا تھا کہ میں نے اسے پہلی بار دیکھا۔ اگرچہ اس کا قد چھوٹا مگر وہ انتہائی خوش شکل لڑکی تھی۔ اسے ایک آدمی ہیروئن کا کام دلوانے وہاں لایا تھا۔ زبیدہ پہلے ایکسٹرا گرل تھی کھانے کا وقت ہوا تو پروڈیوسر نے ہوٹل سے کھانا منگوایا۔ ہم سب نے مل کر کھایا۔ زبیدہ نے باتوں ہی باتوں میں مجھ سے فرمائش کی کہ میں اس کے لیے سائیڈ ہیروئن کا کوئی چھوٹا سا کریکٹر نکالوں۔ میں اسکرپٹ تقریباً مکمل کر چکا تھا اور اب ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے زبیدہ سے وعدہ کیا کہ اگر مجھے کوئی دوسری فلم ملی تو میں اس کے لیے ضرور کوئی رول نکالوں گا۔ زبیدہ اس بات پر ہی خوش ہوگئی۔ اس کے بعد کسی فلم یونٹ کے دفتر میں، کسی اسٹوڈیو میں کبھی اس سے ملاقات ہو جاتی۔ ایک فلم میں اسے سائیڈ ہیروئن کا رول بھی مل گیا۔ مگر وہ اسے اچھی طرح سے نہ نبھا سکی یا لوگوں نے اسے پسند نہ کیا اور قسمت نے اسے ایک بار پھر ایکسٹرا عورتوں کی ٹولی میں دھکیل دیا۔ مگر زبیدہ اب وہاں اپنے آپ کو ایڈجسٹ نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے اونچی ہواؤں میں اڑنا شروع کر دیا۔ وہ پرانے لاہور کے فیشن ایبل ہوٹلوں میں دکھائی دینے لگی۔ یہ میری لائن نہیں تھی اس لیے زبیدہ سے دیر دیر بعد کبھی ملاقات ہوتی۔ پھر وہ میری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

وقت گزرتا گیا تین چار سال بیت گئے۔ ایک روز میں نے اخبار میں افسوسناک خبر پڑھی کہ زبیدہ لندن ایئر پورٹ پر ہیروئن اسمگل کرتے ہوئے گرفتار ہوگئی۔ مجھے افسوس ضرور ہوا لیکن حیرانی بالکل نہ ہوئی۔ وہ جس راستے پر چل نکلی تھی اس کی منزل عام طور پر یا تو جیل خانہ ہوتی ہے یا کسی ہسپتال کا مردہ خانہ۔ ایک سال بعد یہ خبر چھپی کہ زبیدہ کو چھ سال سزا ہوگئی ہے اور اسے انگلستان کی جیل میں ڈال دیا گیا۔ میں نے سوچا کاش زبیدہ اس راستے پر نہ نکلتی۔ کاش شروع میں اسے کوئی سمجھانے والا ہوتا۔ وہ کسی سے شادی کر کے اپنا گھر بسا لیتی۔ بھلے ہی اس کی خاوند سے نہ بنتی، غریبی ہوتی، گھر میں چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوتیں مگر اسے گھر کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں بھی ضرور ملتیں۔ اور یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہی اصل میں سب سے بڑی مسرتیں ہوتی ہیں۔ یہ چھوٹی چھوٹی

باتوں کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہی انسان کی روح کو زندگی کا اصل سکون عطا کرتی ہیں۔عورت کو کوئی سمجھانے والا نہ ہوتو اس کے بھٹک جانے کا بڑا امکان ہوتا ہے۔زبیدہ کو بھی ایسا ماحول ملا کہ ہر کسی نے اسے غلط مشورہ ہی دیا۔دو تین سال گزر گئے۔پھر ایک روز میں نے لاہور کے اخبار میں خبر پڑھی کہ زبیدہ نامی لاہور کی فنکارہ کا لندن کی جیل میں انتقال ہو گیا ہے۔

یہ ۴۹۔۱۹۴۸ء کے لاہور کی باتیں ہیں۔

میں ابھی پاکستان کی فلمی صنعت کے ابتدائی ایام ہی کی بات کرنا چاہوں گا۔اس زمانے میں جہاں چند ایک فلمی میوزک ڈائریکٹر شہرت اور دولت کما رہے تھے وہاں ایسے گمنام موسیقار بھی تھے جو شہرت کے لیے جدوجہد میں مصروف تھے۔ان میں ایک ایسے موسیقار بھی تھے جو فاقہ مستی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔مگر اس کے حوصلے بڑے بلند تھے۔لاہور میں ایک فلم کی تیاریاں شروع ہوئیں تو اسے بطور میوزک ڈائریکٹر لے لیا گیا۔یہ شخص بڑا خوش ہوا۔فلم بنانے والوں کے پاس بھی زیادہ سرمایہ نہیں تھا۔یہ فاقہ مست میوزک ڈائریکٹر بڑی محنت سے اس کی دھنیں تیار کرنے لگا۔کسی نہ کسی طرح فلم تیار ہو گئی۔لاہور کے سینما ہال میں لگی پہلے ہی شو میں فلاپ ہو گئی۔لوگوں نے سینما ہال کی کرسیاں توڑ ڈالیں اس فلم کا گانا تھا:

ساتھیو! مجاہدو!
جاگ اٹھا ہے سارا وطن

دوسرا گانا تھا:

اب وقت شہادت ہے آیا
اللہ اکبر! اللہ اکبر

یہ دونوں گانے بڑے مشہور ہوئے۔سن پینسٹھ کی جنگ میں جب بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا تو یہ گانے بچے بچے کی زبان پر تھے اور محاذ جنگ پر مجاہدوں کا خون گرما رہے تھے۔آج بھی جب فوجوں کا کوئی مارچ پاسٹ ہوتا ہے تو ان گانوں کی دھن سنائی دیتی ہے۔مگر وہ گمنام موسیقار کسی کو یاد نہیں ہے۔جو چونا منڈی سے پیدل شاہ نور اسٹوڈیو آیا کرتا تھا۔کبھی ایک دو آنے ہوتے تو میکلوڈ روڈ سے بس پر بیٹھ جاتا تھا۔آج اس کا نام کوئی نہیں جانتا مجھے خود معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہے۔کس حال میں ہے۔

فلم سازی بھی دوسرے کاروباروں کی طرح ایک کاروبار ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اس کاروبار میں ذرا رنگینیاں زیادہ ہی ہیں اور آدمی آزمائش میں ضرور پڑ جاتا ہے۔ مگر پاکستان کی فلم انڈسٹری میں شروع ہی سے زیادہ تعداد ایسے کاروباری لوگوں کی رہی ہے جو اس کاروبار کو پوری ذمہ داری، دیانت اور شرافت کے ساتھ چلاتے ہیں۔ جو نماز روزے کے پابند ہیں اور فلمی دنیا کی رنگینیوں سے اپنے آپ کو ہمیشہ دور رکھتے ہیں۔ وقت پر کام کرنے والوں کی ادائیگی کرتے ہیں اور ان نیک دل پروڈیوسروں یا تقسیم کاروں یا فنانسروں کی وجہ سے ہی پاکستان کی فلم انڈسٹری آج ترقی کی منزلیں طے کر رہی ہے۔

لیکن جیسے میں نے پہلے لکھا ہے کہ نقلی مال بھی مارکیٹ میں آجاتا ہے۔ اسی طرح کچھ ایسے پروڈیوسر فنانسر بھی اس کاروبار میں آتے رہے ہیں جن کی وجہ سے فلم انڈسٹری کو لوگ برا خیال کرنے لگے۔ ایسے پروڈیوسر اپنی چرب زبانی کی وجہ سے کسی نہ کسی فنانسر کو پھنسا کر فلم میں لے آتے۔ بڑے بڑے فنکاروں کو ایڈوانس دے کر فلم کا کوئی ڈرامائی سین فلماتے اور پھر اسے فروخت کر کے تقسیم کار سے قسطیں وصول کر کے عیاشیاں شروع کر دیتے۔ فلم درمیان میں ہی رہ جاتی اور وہ کسی دوسرے فنانسر کو پھنسا کر دوسری فلم کا اعلان کر دیتے۔ ایسے ہی ایک پروڈیوسر کو میں نے دیکھا کہ بڑی آن بان کے ساتھ وہ فلمی دنیا میں آیا۔ سیٹ پر وہ روپیہ پانی کی طرح بہاتا۔ مگر اس کا مقصد فلم بنانا نہیں بلکہ محض عیش کرنا ہوتا تھا۔ ذمے دار پروڈیوسر اس بات کو ناپسند کرتے اور اس نقلی پروڈیوسر کو منہ نہیں لگاتے تھے۔ مگر وہ اپنی چرب زبانی کی وجہ سے ہر چھ مہینے بعد کوئی نیا فنانسر پھانس لیتا۔ بڑا شاندار دفتر اس نے بنا رکھا تھا۔ لمبی گاڑی رکھی ہوئی تھی۔ چاندی کے ہولڈر میں سگریٹ سلگا کر پیتا تھا۔ آخر ان غلط کاریوں کا نتیجہ نکلنا ہی تھا۔ چنانچہ فنانسر اس سے کنارہ کش ہوتے گئے۔ پھر ایک وہ دن بھی آیا کہ میں ایک فلم کمپنی کے آفس میں بیٹھا ہوا تھا کہ وہ جعلی پروڈیوسر چق اٹھا کر کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ بکھرے ہوئے بالوں میں سفیدی آگئی تھی۔ بڑی عاجزی سے مسکرا کر اس نے سلام کیا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ میں آپ کو بالکل سچی تصویر دکھا رہا ہوں۔ وہ منظر آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ فلم کمپنی کے پروڈکشن منیجر نے نگاہ غلط سے اسے دیکھا اور اپنے کام میں مصروف ہوتے ہوئے بے نیازی سے کہا:

''پھر کسی وقت آنا۔''

جعلی پروڈیوسر جو کبھی لاکھوں میں کھیلتا تھا یعنی دوسروں کی کمائی ہوئی دولت پر عیش کرتا رہا تھا، لجاجت سے بولا:

''سر! صرف دو روپے ہی دے دیں، اس وقت گھر جانے کے لیے بس کا کرایہ نہیں ہے۔''

پروڈکشن منیجر نے جیب سے دو روپے نکال کر اسے دے دیے اور وہ عبرت کی تصویر دو روپے لے کر کمرے سے نکل گیا۔ کیا اس میں بصیرت رکھنے والوں کے لیے عبرت نہیں؟ یقیناً ہے اور ہمیں اس سے عبرت حاصل کرنی چاہیے۔ اس کے مقابلے میں جن فلم پروڈیوسروں اور تقسیم کاروں نے پاکستان کی انڈسٹری کو اپنے پاؤں پر کھڑا کیا۔ دیانت داری، نیکی اور ذمہ داری سے کاروبار کو چلایا۔ آج ان کی اولادیں ان کے پھلتے پھولتے کاروبار کو سنبھالے ہوئے ہیں اور وہ ہماری فلم انڈسٹری کا بلاشبہ قیمتی سرمایہ ہیں۔

اس دور میں لاہور کے واحد فلم اسٹوڈیو یعنی پنجاب آرٹ اسٹوڈیو کے سامنے والی نہر بڑی غریبانہ حالت میں بہتی تھی۔ گرمیوں میں اس میں پانی ضرور آجاتا تھا۔ سردیوں میں وہ خشک ہی رہتی۔ فیروز پور روڈ پر بھی انتشار بالکل نہیں ہوتا تھا۔ ابھی گلبرگ اور نہر کنارے کے آبادیاں نہیں بستی تھیں۔ صرف گارڈن ٹاؤن کے چند ایک زرد رنگ کی دیواروں والے کوارٹر سڑک سے دور کھیتوں سے پار دکھائی دیا کرتے تھے۔ آگے ماڈل ٹاؤن تھا جس کی متروکہ کشادہ کوٹھیاں اکثر خالی پڑی تھیں۔ میں پنجاب آرٹ اسٹوڈیو میں کبھی سیف صاحب کو ملنے آتا اور وہ اسٹوڈیو میں نہ ہوتے تو میں فیروز پور روڈ پر نہر کے پل کے قریب پھونس ہوٹل میں اداکار اجمل کے ساتھ چائے پینے بیٹھ جاتا۔ اس پھونس ہوٹل کی چھت گھاس پھونس کی تھی اسی لیے اس کا یہ نام پڑ گیا تھا۔ ہوٹل کیا ایک تندور تھا۔ جہاں پھونس کی چھت کے نیچے کچھ بنچ اور میلی سی لمبی میزیں پڑی تھیں۔ اجمل صاحب شروع ہی سے مجھ سے بڑی شفقت کا برتاؤ کرتے تھے۔ میں بھی ان کا بے حد احترام کرتا تھا۔ ایک تو وہ بڑے اداکار تھے۔ دوسرے ایک بہترین انسان بھی تھے۔ اب اس پھونس ہوٹل کا کہیں نام ونشان نہیں ہے۔ وہاں اونچی اونچی عمارتیں تعمیر ہوگئی ہیں اور اس قدر شور اور رش ہوتا ہے کہ آپ فیروز پور روڈ پار نہیں کر سکتے۔ مگر تب ایسی بات نہیں تھی۔ تب سارے لاہور شہر کی سڑکوں پر بڑا سکون ہوتا تھا۔ فیروز پور روڈ کو ہم ٹہلتے ٹہلتے پار کیا کرتے تھے۔ وہاں صرف قصور جانے والی

لاری دیر دیر بعد گزرتی تھی۔ کبھی کبھی کوئی تانگہ یا سائیکل گزر جاتا۔ دن میں صرف تین چار ٹرک ہی گزرتے۔ نہ کوئی ویگن تھی نہ کوئی اسکوٹر تھا نہ کسی رکشے کا شور تھا۔ ماڈل ٹاؤن کی ایک خاص رنگ کی بس ہوتی تھی جو آدھے آدھے گھنٹے کے بعد کہیں وہاں سے گزرتی۔ ہم پھونس ہوٹل کے بنچ پر بیٹھے چائے پی رہے ہوتے تو پل پر نہر کی جھال یعنی چھوٹی سی آبشار کی آواز بڑی صاف دکھائی دیتی تھی۔ اب آپ اس آبشار کے ساتھ کان بھی لگادیں تو آپ کو سوائے کسی رکشے، اسکوٹر یا ویگن کے شور کے دوسری کوئی آواز سنائی نہیں دے گی۔

بابا عالم سیاہ پوش ہماری لاہور کی شروع کی فلم انڈسٹری کا ایک بڑا نمایاں نام ہے جس کو زمانے نے فراموش کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے پنجابی فلم ''دلا بھٹی'' کا گانا آپ کو آج بھی یاد ہوگا۔

واسطہ ای رب دا تو جاویں وے کبوترا
چٹھی میرے ڈھول نوں پنچاویں وے کبوترا

مگر شاید ہی آپ کو یاد رہا ہو کہ یہ گانا بابا عالم سیاہ پوش نے لکھا تھا۔ سیاہ پوش انہیں اس لیے کہا جاتا تھا کہ شروع شروع میں وہ سیاہ لباس میں ملبوس ہوا کرتے تھے۔ بابا عالم مجھ سے بڑا پیار کرتے۔ بلکہ میرا بے حد احترام کرتے تھے جس سے میں شرمسار بھی ہوتا۔ کیونکہ عمر میں وہ میرے بزرگ تھے۔ بڑے نرم، بڑے ملائم بڑے کمزور دل کے آدمی تھے۔ بڑی گرمجوشی سے ملتے۔ ان کے ہاتھ ہمیشہ گرم رہتے تھے۔ پھونس ہوٹل کی بغلی گلی میں انہوں نے ایک مکان الاٹ کروایا تھا جہاں وہ اپنے بال بچوں کے ساتھ بڑی نارمل اور ذمے دارانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔

بابا عالم سیاہ پوش کی کٹورہ ایسی آنکھوں میں ہر وقت سرمہ لگا رہتا اور ان میں ایک مستی کی کیفیت تیرتی رہتی تھی۔ ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میں نے ٹھٹھرتی سردی میں تنور پر بیٹھی کسی گرم گرم بلی پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔ ایک بار انہوں نے مجھے اپنی زندگی کی ساری کہانی سنائی کہ وہ کس طرح ضلع گورداسپور کے شہر انبالہ میں رہا کرتے تھے۔ پھر وہاں سے کیسے سیالکوٹ آئے اور کیسے کیسے رومانی تجربوں سے گزرے۔

ان واقعات کو دہرانے کا یہ مقام نہیں ہے۔ بابا عالم سیاہ پوش نے پاکستان کی فلم انڈسٹری کو بڑے خوب صورت گیت دیے جنہیں زمانہ آج فراموش کر چکا۔ کبھی کبھی ریڈیو پر ان کا کوئی گیت سنائی دیتا ہے تو مجھے بے اختیار وہ زمانہ یاد آجاتا ہے۔ جب بابا عالم سیاہ پوش اپنا بھاری بھر کم جسم لیے کرسی یا صوفے یا چارپائی پر بیٹھے آہستہ آہستہ جھومتے رہتے تھے اور گیت بنتے چلے جاتے تھے۔

لاہور کے تاریخی ریستوران، چائے خانے

اس بات کی میں ایک بار پھر وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ میرا پرانا لاہور قیام پاکستان سے دو ایک سال پہلے اور پھر قیام پاکستان کے وقت کا لاہور ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے کا لاہور مجھے خواب کی طرح یاد ہے۔ مثلاً مجھے یاد ہے کہ میں شاہ عالمی کے تنگ بازاروں میں سے گزر رہا ہوں۔ جہاں اجناس کی بوجھل خوشبوئیں پھیلی ہوئی ہیں۔ ایک تانگہ تنگ بازار میں پھنس گیا ہے۔ گھوڑا پریشان ہے۔ کوچوان پریشان ہے۔ لوگ تانگے سے بڑی مشکل سے بچ بچا کر یا تانگے کے اوپر سے گزر رہے ہیں۔ ایک اور منظر قیام پاکستان سے ذرا پہلے کا بیان کرتا ہوں۔ میں لوہاری دروازے کے باہر کھڑا ہوں۔ بڑا گنجان دروازہ ہے دروازے کے اندر سے ایک دبلا پتلا سنہری بالوں والا گورا ہندو لڑکا نسواری سوٹ میں ملبوس باہر آ رہا ہے۔ وہ مجھ سے ہاتھ ملاتا ہے۔ یہ شاعر راج بلدیو راج ہے۔

انارکلی میں داخل ہوتے ہی بائیں جانب ایک سکھ حلوائی کی دکان ہے جس کی لسی بڑی مشہور ہے۔ اس زمانے کے لاہور کے ہوٹلوں یا ریستورانوں میں مجھے انارکلی کے نظام ہوٹل کے باہر لگا بڑا سائن بورڈ یاد ہے۔ یا پھر لاہور ہوٹل کے قریب ایک ہندو کا ہوٹل یاد ہے جس کے چبوترے پر تانبے کے بڑے بڑے گول پتیلے رکھے ہوتے تھے۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ ایسے ہوٹل کو ڈھابہ کہتے ہیں جو مجھے کوئی اچھا لفظ نہ لگا۔ چنانچہ میں نے کبھی اس لفظ کو استعمال نہیں کیا۔ آگے بھی میں ہندو سکھ ہوٹل کے لیے یہ لفظ استعمال نہیں کروں گا۔ اس ہوٹل کے اندر دائیں بائیں لکڑی کے چھوٹے چھوٹے کیبن بنے ہوئے تھے۔ ان کیبنوں میں میں نے پہلی بار لاہور کے مشہور مزاح نگار صحافی حاجی لق لق کو دیکھا تھا۔ یہ میری نوعمری کا زمانہ تھا اور ابھی میں نے لکھنا شروع نہیں کیا تھا۔

گوالمنڈی میں قیام پاکستان سے پہلے ایک ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ اس کا نام مجھے یاد نہیں۔ چوک گوالمنڈی سے اسلامیہ کالج کی طرف آئیں تو سرے پر یہ ہوٹل واقع تھا۔ اس کے باہر جلی

حروف میں اردو میں لکھا تھا:

''یہاں بیٹھ کر شراب پینے کی اجازت ہے۔''

مجھے اس ہوٹل میں بیٹھنے کا کبھی اتفاق یا حسن اتفاق نہیں ہوا تھا۔ ان کے سوا قیام پاکستان سے پہلے کے لاہور کا مجھے کوئی ہوٹل یا ریستوران یاد نہیں۔ ہاں یاد آیا۔ فلیمنگ روڈ پر ایک چائے خانہ ہوا کرتا تھا۔ یہ چائے کی ایک دکان تھی جس کے پھٹے پر انگیٹھیاں بنی تھیں۔ چائے خانے کا مالک یہاں بوری پر بیٹھا چائے تیار کیا کرتا۔ دکان میں دو تین میز کرسیاں رکھی تھیں۔ چونکہ رسالہ ''شاہکار'' کا دفتر سامنے والی گلی میں تھا۔ اس لیے میں اور راج بلدیو راج کبھی کبھی دفتر سے اٹھ کر یہاں چائے پینے آ جاتے تھے۔ اس ہوٹل کی مکس چائے بڑی ذائقے دار ہوتی تھی۔ اس زمانے میں ایسی ہی چائے چلتی تھی۔ خالص چیزوں کا زمانہ تھا۔ چائے بھی خالص ملتی تھی۔ دوسرے درجے کی چائے میں بھی ذائقہ اور خوشبو ہوتی تھی۔ اس زمانے میں اصفہانی کی گرین سپاٹ چائے بڑی عام تھی۔ ریستوران اور چائے خانوں کو اصفہانی کے ایجنٹ ڈسٹ یعنی چورا چائے سپلائی کرتے تھے جس کا رنگ کیتلی کے کھولتے پانی میں ڈالتے ہی نکل آتا تھا۔

قیام پاکستان کے بعد کے زمانے کا جو لاہور تھا اس کے سارے ہوٹل، سارے ریستوران مجھے آج بھی پوری طرح یاد ہیں۔ سب سے پہلے میں پاک ٹی ہاؤس کا ذکر کروں گا۔ پاک ٹی ہاؤس مال روڈ کی ایک بغلی سڑک پر واقع ہے جو نیلے گنبد کو جاتی ہے۔ جب میں پہلی بار اس ٹی ہاؤس میں آیا تو اس کی پیشانی پر انڈیا ٹی ہاؤس سیمنٹ کے انگریزی الفاظ میں لکھا ہوا تھا۔ پھر انڈیا کا لفظ توڑ کر وہاں سیمنٹ ہی سے پاک کا لفظ لکھ دیا گیا۔ یہ آج بھی ویسے کا ویسا لکھا ہوا ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ یہ پہلے پہل کیسے لاہور کے ادیبوں اور شاعروں کا ٹھکانا بن گیا۔ میں اپنی یادوں کے البم کی پہلی ہی تصویر میں اس ٹی ہاؤس میں ادیبوں کو بیٹھے، گرمجوشی سے باتیں کرتے اور چائے پیتے، سگریٹ اڑاتے دیکھتا ہوں۔ یہ ۱۹۴۷ء ہی کا زمانہ تھا، یا زیادہ سے زیادہ ۱۹۴۸ء کے وسط کا زمانہ ہوگا۔ بھارت سے ہجرت کر کے آئے ہوئے کچھ باذوق بھائیوں نے ٹی ہاؤس اور چینی لنچ ہوم کو الاٹ کرا کر اس کی تزئین و آرائش کی تھی۔ ان بھائیوں میں علیم، سراج صاحب، صادق اور حمید کے نام مجھے یاد رہ گئے ہیں۔ صادق نے چینی لنچ ہوم الاٹ کروایا تھا۔ مگر وہاں حمید بیٹھتا تھا۔ پاک ٹی ہاؤس سراج صاحب نے الاٹ کروایا تھا۔ یہاں ان کے علاوہ علیم الدین بھی بیٹھتا جو میرا

بڑا گہرا اور راز دار دوست تھا۔ راز دار ان معنوں میں کہ میرے ہر رومان کی اس کو خبر ہوتی تھی۔ کیونکہ مجھے لڑکیوں کے ٹیلی فون پاک ٹی ہاؤس میں ہی آتے اور علیم ہی انہیں سن کر پیغام پہنچا دیتا تھا۔ خیر یہ باتیں تو کم و بیش ہر شخص کی زندگی میں ہوتی ہی رہتی ہیں۔ علیم کو خود بھی چائے کا بڑا شوق تھا۔ اسے ادب میں شاعری، افسانہ اور موسیقی سے بھی بڑا لگاؤ تھا۔ پاک ٹی ہاؤس میں صبح کے وقت اگر ناصر کاظمی یا شہرت بخاری نہ آئے ہوتے تو میں چائے کی پہلی پیالی علیم الدین کے ساتھ بیٹھ کر ہی پیتا تھا۔ علیم بڑے اہتمام سے چائے تیار کرتا۔ اس کی بنائی ہوئی چائے کا ذائقہ آج بھی میری روح میں محفوظ ہے۔ علیم نے پاک ٹی ہاؤس کے کاؤنٹر پر ایک چھوٹا سا ریڈیو ٹرانسسٹر رکھا ہوتا تھا جس پر وہ لاہور سے فرمائشی گانوں کے ریکارڈ سنا کرتا۔ یہ ریڈیو اس نے بڑی دھیمی آواز میں لگا رکھا ہوتا۔ اس زمانے میں ابھی ٹیلی ویژن لاہور میں نہیں آیا تھا اور ریڈیو ہی سب سے بڑا نشریاتی ادارہ تھا۔

پاک ٹی ہاؤس میں تقریباً سبھی مشہور ادیب اور شاعر آ کر بیٹھتے تھے۔ چند ایک کو چھوڑ کر تقریباً یہ سبھی ادیبوں اور شاعروں کے شباب کا زمانہ تھا۔ بڑی یادگار شاعری، افسانے اور نظمیں، تخلیق ہو رہی تھیں۔ گورنمنٹ کالج کے پروفیسر، طالب علم اور کچھ لڑکیاں بھی ٹی ہاؤس میں آ کر بیٹھا کرتی تھیں۔ بڑا آزاد اور صاف ستھرا ماحول تھا۔ کوئی کسی کے معاملے میں دخل اندازی نہیں کرتا تھا۔ کسی ادیب یا شاعر کو اگر کوئی لڑکی ملنے آتی تو دوسرا شاعر ادیب کبھی حسد نہیں کرتا تھا۔ افسانہ نگار اشفاق احمد، شاعر ناصر کاظمی، شہرت بخاری، منیر نیازی، انجم رومانی، قیوم نظر، سجاد رضوی اور سجاد باقر رضوی سے میری پہلی ملاقات اسی پاک ٹی ہاؤس میں ہی ہوئی۔ یہ صرف ایک ریستوران ہی نہیں تھا اسے ایک ادبی مرکز اور ثقافتی گڑھ کی بھی حیثیت حاصل تھی۔ صبح سے شام تک یہاں ادبی محفلیں لگی رہتیں۔ چائے کے دور چلتے رہتے۔ تھوڑی دیر کو اٹھ کر ہم وہاں سے جاتے اور مال روڈ انارکلی کا ایک چکر لگا کر واپس اسی ہوٹل میں آ کر بیٹھ جاتے۔ کہیں افسانوں پر بات ہو رہی ہے۔ کہیں شاعری پر بحث ہو رہی ہے۔ کہیں آزاد نظم کا ذکر ہو رہا ہے۔ کہیں میرا جی کی ابہام پسندی پر گفتگو جاری ہے۔ کہیں پکاسو کی پینٹنگز پر اظہار خیال کیا رہا ہے۔ ناصر کاظمی میرے سامنے بیٹھا مجھے اپنی غزل سنا رہا ہے:

رونقیں تھیں جہاں میں کیا کیا کچھ

لوگ تھے رفتگاں میں کیا کیا کچھ
اب کی فصل بہار سے پہلے
رنگ تھے گلستان میں کیا کیا کچھ
کیا کہوں اب تمہیں خزاں والو
جل گیا آشیاں میں کیا کیا کچھ
دل ترے بعد سو گیا ورنہ!
شور تھا اس مکاں میں کیا کیا کچھ

ادب سے ہٹ کر فسادات پر بھی باتیں ہوتیں۔ زخم ابھی تازہ تھے۔ لوگ ہندوستان میں بہت کچھ چھوڑ کر، بڑی قربانیاں دے کر پاکستان میں داخل ہوئے تھے۔ اس عظیم تاریخی انقلاب کا اثر شاعری، ادب اور افسانے ناول پر بہت زیادہ تھا۔ ناصر کاظمی کہہ رہا تھا:

''ہمارے انبالے والے گھر میں نیم کا گھنا پیڑ ہوتا تھا۔ اس پر موسم بہار میں نمکولیاں لگتیں جنہیں ہم بڑے شوق سے کھایا کرتے تھے۔ میرے مکان کے اوپر کبوتروں کے ڈربے تھے۔ میں نے ہر نسل کے کبوتر پال رکھے تھے۔ آنے سے پہلے میں نے ان کبوتروں کو آزاد کر دیا۔ انہیں اڑا دیا۔ مگر میں نے گلی میں سے نکلتے ہوئے جب اپنے مکان پر آخری نگاہ ڈالی تو دیکھا میرے کبوتر مکان کی منڈیروں پر بیٹھے تھے۔''

ایک دوسرا ادیب اپنی روداد سنا رہا تھا:

''جب ہمارا قافلہ بے سروسامانی کے عالم میں دریائے بیاس پر پہنچا تو سکھوں کے جتھے نے حملہ کر دیا۔ کئی مسلمان شہید ہو گئے۔ کئی نے دریا میں چھلانگیں لگا دیں اور ڈوب گئے۔ میں لاشوں کے انبار کے نیچے دب گیا اور میری جان بچ گئی۔''

کوئی کہہ رہا تھا:

''ہمارے گاؤں والوں نے متعصب ہندو سکھوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا مگر جب ڈوگرہ فوج آ گئی تو ہمارے پاؤں اکھڑ گئے۔ بہت سے لوگ شہید ہوئے۔ میں اپنے گھر والوں کو نکال کر بڑی مشکل سے کیمپ میں پہنچا۔''

لیکن پاکستان آ جانے کی خوشی نے سارے دکھوں کو بہت حد تک بھلا دیا تھا۔ تقریباً سبھی

پاکستان بن جانے پر بڑے خوش اور مطمئن تھے کہ انہیں اپنا ایک آزاد وطن مل گیا ہے جہاں وہ اپنی مرضی کے مطابق آزادی سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ ترقی پسند ادیبوں کا ایک کوتاہ میں گروہ ایسا بھی تھا جو تقسیم کے خلاف تھا۔ لیکن آج جب میں ان سے بات کرتا ہوں تو ان میں سے اکثر یہی کہتے ہیں کہ پاکستان ٹھیک بنا تھا۔ اس کی واقعی بڑی ضرورت تھی۔ اگر پاکستان عمل میں نہ آتا تو آج ہمارا بھی وہی حال ہوتا جو ہندوستان میں بے یارومددگار مسلمانوں کا ہو رہا ہے۔ اب وہ بھی کہتے ہیں کہ ہندوستان میں ایک دوسرے پاکستان کی ضرورت ہے۔

پاک ٹی ہاؤس ویسے رات گیارہ بجے تک بند ہو جاتا تھا۔ لیکن اگر ادیبوں کی محفلیں دیر تک جاری رہتیں تو علیم الدین انتظار کر لیتا اور کبھی کبھی وہ رات کے ایک بجے ٹی ہاؤس بند کر کے اپنے پرانی انارکلی والے گھر جاتا۔ اس ریستوران، اس ٹی ہاؤس کی زندگی کی ساری رونق شاعروں ادیبوں کے دم سے تھی۔ لوگ دوسرے شہروں سے اردو ادب کے شہزادوں کو ملنے آتے تو سیدھے پاک ٹی ہاؤس کا رخ کرتے اور یہاں بیٹھ کر چائے پیتے، کھانا کھاتے اور اپنے پسندیدہ ادیبوں شاعروں کو جی بھر کے دیکھتے۔ ان کی باتیں سنتے۔ ان سے باتیں کرتے۔ پاک ٹی ہاؤس کی تاریخ پر ایک پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ میرا ایک ناول ''دھوپ اور شگوفے'' اسی پاک ٹی ہاؤس سے شروع ہوتا ہے اور اسی ٹی ہاؤس میں ختم ہو جاتا ہے۔

اس ناول میں یہاں بیٹھنے والوں کی کچھ جھلکیاں ملتی ہیں۔ لیکن جیسا کہ اس دنیا میں ہوتا رہتا ہے۔ پاک ٹی ہاؤس کی جوانی بھی گزر گئی۔ ادیب شاعر بکھر گئے۔ زندگی کے حادثات و واقعات نے انہیں ایک دوسرے سے، ایک مرکز سے الگ الگ کر دیا۔ اب پاک ٹی ہاؤس اپنی جگہ پر ضرور موجود ہے۔ یہاں کبھی کبھی کچھ پرانے ادیب و شاعر آ کر ضرور بیٹھ جاتے ہیں مگر پاک ٹی ہاؤس میں وہ پہلے سی بات نہیں جن کے دم سے اس ریستوران کی ساری رونقیں تھیں۔ جن کے قہقہے اس کی فضاؤں میں ہر وقت گونجتے رہتے تھے۔ وہ لوگ اب اس کی فضاؤں میں نظر نہیں آتے۔ اکثر اس دنیا سے کوچ کر گئے جو زندہ رہے انہیں حالات کی زنجیروں نے کچھ اس طرح جکڑ لیا کہ وہ ادھر کا رخ نہیں کرتے۔

کافی ہاؤس کا مقام بھی اپنی ایک نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔ لاہور کا کافی ہاؤس پاک ٹی ہاؤس چند قدموں کے فاصلے پر واقع تھا۔ مگر ان دونوں میں بڑا فرق تھا۔ پاک ٹی ہاؤس شاعروں ادیبوں

کا مرکز تھا جبکہ کافی ہاؤس میں وکلا، سیاستدان، صحافی اور نقاد حضرات زیادہ تر بیٹھتے تھے۔ کافی ہاؤس کی فضا دانشورانہ اور جرنلیسٹک یعنی صحافیانہ تھی۔ یہاں اکثر ملکی سیاست اور اخباروں کی پالیسیوں، اخباروں کے اداریوں اور لیڈروں کی شخصیات پر بحث ہوتی۔ کافی ہاؤس میں جو لوگ بیٹھا کرتے ان میں مولانا چراغ حسن حسرت، عبداللہ بٹ، ریاض قادر، سعید کے نام نمایاں ہیں۔ یہاں جمیل الزماں، م ش اور کچھ دوسرے اعلیٰ پائے کے صحافی، کالم نگار حضرات بھی آ کر بیٹھا کرتے تھے۔ کبھی کبھی حمید نظامی بھی نکل آتے تھے۔ کافی ہاؤس کا پہلا نام بھی انڈیا کافی ہاؤس تھا۔ قیام پاکستان کے بعد اس کے نام کے پہلے لگا ہوا انڈیا کاٹ دیا گیا اور صرف کافی ہاؤس ہی رہنے دیا گیا۔ کافی ہاؤس ایک وسیع ادارے کا ایک ریستوران تھا جس کی شاخیں برصغیر کے دوسروں شہروں میں بھی پھیلی ہوئی تھیں۔ مگر جو اہمیت لاہور کے کافی ہاؤس کو تھی وہ کسی کے نصیب میں نہ آئی تھی۔

ہم بھی پاک ٹی ہاؤس سے اٹھ کر کافی ہاؤس میں آ جایا کرتے تھے۔ ناصر کاظمی تو اکثر ریاض قادر سے باتیں کرنے کافی ہاؤس آ جاتا تھا۔ میں کافی ہاؤس سے اس لیے دور رہتا کہ مجھے یہاں کی جلی ہوئی کافی پسند نہیں تھی۔ میں نے مدراس، لنکا، رنگون، سنگاپور اور پانڈی چری میں جو کافی پی رکھی تھی اس کے مقابلے میں لاہور والے کافی ہاؤس کی کافی بہت ادنیٰ تھی۔ اس کے علاوہ شروع ہی سے میں اس نظریے کا قائل تھا کہ کافی ہم پنجاب والوں کو سوٹ نہیں کرتی۔ یہ مرطوب علاقے کا مشروب ہے، اور ہمارے لیے اس کا استعمال نقصان دہ ہے یا پھر اسے سرد ملکوں میں پینا چاہیے۔ لیکن ناصر کاظمی اور میرے کچھ دوسرے دوست جس بلا نوشی سے کافی پیتے میں اس طرح سے کافی نہیں پی سکتا تھا۔ اس کی ایک دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ میں افسانہ نگار ضرور ہوں مگر کھانے پینے کے معاملے میں میں بڑا محتاط اور نیچر پرست ہوں۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ میرا تعلق پہلوانوں کے خاندان سے ہے جہاں کھانے پینے کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ اپنے جسم کی حفاظت، ورزش، خوراک میں نفاست اور عمدگی مجھے ورثے میں ملی تھی۔ پاک ٹی ہاؤس میں چائے بھی میں زیادہ نہیں پیتا تھا۔ حالانکہ چائے سے میں عشق کرتا ہوں۔ میں جب پاک ٹی ہاؤس آتا تو صبح سیر دہی اور سیر دودھ کا ادھڑ کا پی کر آتا تھا۔ دودھ دہی آج بھی اسی فراوانی سے استعمال کرتا ہوں اور میں سب سے یہی کہوں گا کہ دودھ اگر نہیں پی سکتے تو دہی کا روزانہ استعمال ضرور کریں۔ آخر ہماری

روح بغیر جسم کے نظر نہیں آسکتی، نہ ہمارا جسم بغیر روح کے افسانے لکھ سکتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے جسم کی مشین کو زیادہ سے زیادہ دیر تک اور بہتر سے بہتر حالت میں زندہ اور صحت مند رکھیں تا کہ ہم زیادہ دیر تک کام کرتے رہیں اور دوسروں کے کام آتے رہیں۔ میرا خیال ہے کہ ناصر کاظمی نے چائے اور بے پناہ کافیاں پی پی کر اپنے معدے میں السر کر لیا تھا۔ ورنہ وہ تو شراب بھی نہیں پیتا تھا۔ کچھ وہ پان میں قوام بھی بہت زیادہ استعمال کرتا تھا۔ میں اسے زیادہ چائے کافی پینے سے منع کیا کرتا مگر بھلا وہ کہاں سنتا تھا۔ میں تو جس روز چائے کی دو تین پالیاں زیادہ پی لیتا اس دن رات کو کھانا کھانے کی بجائے سیر بھر ابلا ہوا دودھ پی کر سو جاتا تھا۔

اس تمہید سے میرا مقصد صرف یہ بات بتانا تھا کہ میں کافی ہاؤس میں کیوں زیادہ نہیں بیٹھتا تھا۔ ویسے دن میں ایک آدھ پھیرا وہاں ضرور لگتا۔ وہاں مولانا حسرت کی محفلیں خوب جمتی تھیں۔ عبد اللہ بٹ کی خوش گفتاری اور جگت بازیوں کا سلسلہ بھی سارا دن چلتا رہتا تھا۔ کیا خوش لباس، خوش گفتار اور خوش اطوار شخص تھا۔ ایک دن کی بات ہے کہ مولانا چراغ حسن حسرت کی محفل لگی تھی۔ بیرے کو انہوں نے کافی لانے کا آرڈر دے رکھا تھا۔ گفتگو اپنے شباب پر تھی۔ بیرے نے کافی لانے میں دیر کر دی۔ دو ایک بار حسرت صاحب نے یاد دہانی بھی کرائی۔ اس کے باوجود جب بیرا کافی نہ لایا، تو انہوں نے کافی ہاؤس کے منیجر کو اپنے پاس بلوایا اور شکایت کی کہ یہ کیسا بیرا آپ نے رکھا ہوا ہے۔ ابھی تک کافی نہیں لایا۔ منیجر نے بڑے ادب سے پوچھا:

''مولانا آپ نے کس بیرے کو آرڈر دیا تھا؟ وہ جس کی سفید ڈاڑھی ہے؟''

مولانا چراغ حسن حسرت نے برجستہ کہا:

''مولانا! جس وقت آرڈر دیا تھا اس وقت تو اس کی ڈاڑھی کالی تھی، اب سفید ہو گئی ہو گی۔''

کافی ہاؤس لاہور کی دانشورانہ زندگی کا مرکز تھا۔ سرچشمہ تھا۔ اس کی شہرت بھی ملک کے گوشے گوشے تک پھیلی ہوئی تھی۔ لوگ اس کا تذکرہ اردو انگریزی اخباروں میں پڑھ کر دور دور کے شہروں سے اسے دیکھنے اور یہاں بیٹھ کر کافی پینے اور دانشوروں کو دیکھنے آتے تھے۔ پاک ٹی ہاؤس تو تاج محل کے کھنڈر کی شکل میں آج بھی زندہ ہے اور عہد رفتہ کے سنہری ایام کی داستانیں سناتا ہے مگر کافی ہاؤس بند ہو گیا ہے اس کے دروازے پر لوہے کا جنگلا لگا ہے۔ اس کے اندر عہد

رفتہ کی تمام خوب صورت شکلیں گرد میں اٹ کر ختم ہو چکی ہیں۔ اس کی داستان سنانے والا کوئی نہیں۔ لوگ اس کے قریب سے بے نیازی سے گزر جاتے ہیں اور کسی کو احساس تک نہیں ہوتا کہ کبھی یہاں لاہور کی بعض تاریخی شخصیات بیٹھا کرتی تھیں اور ان کی شیریں گفتگو اور بلند بانگ قہقہوں سے یہاں کی فضا گونجا کرتی تھی۔

اسی علاقے میں ایک چھوٹا سا ریستوران نگینہ بیکری کے نام سے بھی آباد تھا۔ یہ بھی چند ایک اردو کے نامور ادیبوں اور نقادوں کی وجہ سے زندہ تھا۔ یہاں بیٹھنے والوں میں مولانا صلاح الدین احمد، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی، باری علیگ اور عبداللہ قریشی کے نام قابل ذکر ہیں۔ نگینہ بیکری کی فضا پاک ٹی ہاؤس اور کافی ہاؤس سے بالکل مختلف تھی۔ اس میں داخل ہوں تو دائیں جانب ایک اونچا تھڑا تھا جہاں بڑے سے توے پر قیمے کی ٹکیا اور کباب پکتے رہتے تھے۔ ان کا مصالحے دار دھواں بیکری کی فضا میں ہر وقت تھوڑا تھوڑا پھیلا رہتا۔ میں جب کبھی ان بزرگ دانشوروں کو وہاں بیٹھے باتیں کرتے دیکھنے جاتا تو بہت جلد وہاں پھیلے ہوئے دھوئیں کی وجہ سے باہر نکل آتا تھا۔ گوپال متل نے اپنی ایک کتاب ''لاہو کا جو ذکر کیا'' میں اس بیکری کا حال قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ کیونکہ پاکستان بننے سے ذرا پہلے وہ بھی یہاں باری علیگ کے ساتھ بیٹھا کرتا تھا۔ کیوں نہ میں اس کتاب کا ایک ٹکڑا یہاں نقل کر دوں۔ اس طرح آپ کے سامنے نگینہ بیکری کی ایک اور تصویر واضح ہو جائے گی۔

گوپال متل اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

''لاہور کے ادیبوں کا ایک اور ٹھکانا نگینہ بیکری تھی۔ نیلا گنبد لاہور میں چائے کی یہ مختصر دکان یو پی کے ایک قوم پرست مسلمان چلاتے تھے۔ شروع شروع میں یہاں آنے والوں میں زیادہ تر قوم پرست مسلمان ہی تھے لیکن پھر مسلم لیگی بھی آنے لگے اور اس طرح یہ بیکری سیاسی مناظرہ بازی کا ایک اڈا بن گئی۔ ادیبوں کا یہ اڈا اس وقت بنی جب چراغ حسن حسرت جو عرب ہوٹل کی مجلس کے میر تھے۔ سرکاری ملازمت میں چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی مجلس درہم برہم ہو گئی اور وہاں سے اکھڑ کر نگینہ بیکری میں آ گئی۔ باری علیگ جو پہلے عرب ہوٹل کے نواح میں رہتے تھے، اب پرانی انارکلی میں رہنے لگے تھے اور ان کا مکان نگینہ بیکری سے کچھ زیادہ دور نہیں تھا۔ خود میں نے بھی انارکلی میں مکان لے لیا تھا۔

عرب ہوٹل یہاں سے کافی دور تھا۔ اس لیے میں نے اور باری علیگ نے نگینہ بیکری میں ہی ڈیرے ڈال لیے۔ باری علیگ کی کشش مولانا صلاح الدین احمد کو بھی کھینچ لائی جن کے رسالے ''ادبی دنیا'' کا دفتر ہی مال روڈ پر تھا۔ مولانا صلاح الدین کے ہمراہ عاشق بٹالوی اور کچھ دوسرے ادیب بھی آنے لگے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ جوان دنوں اورینٹل کالج میں تھے پہلے ہی وہاں بیٹھا کرتے تھے۔ اس طرح اچھی خاصی محفل جمنے لگی۔ جو ادیب باقاعدگی سے وہاں نہیں بیٹھتے تھے وہ بھی ہفتے میں ایک دو بار ضرور ادھر آنکلتے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ ان دنوں ڈاڑھی رکھتے تھے۔ اور شیروانی بھی پہنتے تھے۔ سیاست میں قوم پرستانہ انداز نظر کے مالک تھے اور ان کے متعلق مشہور تھا کہ مجلس احرار کے بہت قریب ہیں مولانا صلاح الدین بحث میں شاذونادر ہی حصہ لیتے۔ صرف زیر لب مسکرادیتے تھے۔ جیسے کوئی بزرگ بچوں کی نادان حرکتوں پر مسکرادیتا ہے۔ عاشق حسین بٹالوی البتہ بحث میں سرگرم حصہ لیتے تھے۔ عاشق حسین بٹالوی سیاست میں ہنگامہ آرا بھی ہوئے اور رسوا بھی ہوئے لیکن اس سے ان کی دلچسپیاں ضمنی قسم کی تھیں۔ حقیقی دلچسپی انہیں ادب سے تھی۔ افسانہ نگار بھی تھے اور ناقد بھی۔ کچھ مدت ''ادبی دنیا'' کے ایڈیٹر بھی رہے۔ ایک زمانے میں انہوں نے اختر شیرانی کے ساتھ مل کر ''رومان'' رسالہ بھی نکالا تھا۔ لیکن کوئی کام باقاعدگی سے کرنے کے قائل نہیں تھے۔ جس میں کچھ دخل اس بات کو بھی تھا کہ روپے پیسے کے معاملے میں کافی بے نیاز تھے۔ ایک مرتبہ مولانا صلاح الدین نے ان کے لیے نصاب مرتب کرنے کا کام ڈھونڈ نکالا جس کے معاوضے میں انہیں کافی روپیہ مل سکتا تھا۔ لیکن عاشق حسین بٹالوی نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ مولانا کما کر کھانا میرے بس میں نہیں۔ شادی انہوں نے کی نہیں تھی اور اپنی ذات پر خرچ بھی کافی کفایت شعاری سے کرتے تھے۔ باری علیگ ادب اور سیاست دونوں ہی سے نالاں تھے۔ اور کلچر کے تحفظ کی بات پر تو خاص طور پر برہم ہو جاتے تھے۔ ایسے موقعوں پر ان کا خاص فقرہ ہوتا تھا: ''بھائی ہمارا کلچر لے لو۔ روٹی دے دو۔'' گاہے ماہے آنے والوں میں ایک عبداللہ بٹ تھے۔ اور ایک کامریڈ عبداللہ۔ عبداللہ بٹ مادی اعتبار سے خوش حال تھے اور ادب وسیاست سے الزام کی دلچسپی محض خون گرم رکھنے کا ایک بہانہ تھی۔ سیاست میں انہوں نے ہر کوچے کی سیر کی۔ لیکن قیام کہیں

نہیں کیا۔ کامریڈ عبداللہ ایک خوش شکل نوجوان تھا۔ کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ تھا اور پارٹی کے ایما پر مسلم لیگ میں شامل ہوا تھا۔ احراریوں نے اسے دلبر ملت کا خطاب دے رکھا تھا۔ لاہور کا شاید ہی کوئی سیاسی گروپ ہوگا جس کا کوئی نہ کوئی نمائندہ نگینہ بیکری کی محفل میں موجود نہ ہوتا ہو۔ جماعت اسلامی کی نمائندگی ایک صاحب قریشی کرتے تھے۔ انہیں یہ بات کسی قدر ناگوار گزرتی تھی کہ میں ہندو ہونے کے باوجود مسلمانوں کی سیاسی بحث میں بھرپور حصہ لیتا ہوں۔ انہیں چڑانے کے لیے عاشق حسین بٹالوی کہا کرتے تھے:

''بھائی یہ آنریری مسلمان ہے۔ اس سے کیوں جھگڑتے ہو؟''

لاہور میں فسادات شروع ہو چکے تھے۔ اس زمانے میں بھی میرے معمولات میں فرق نہیں آیا تھا۔ میں نیلا گنبد کی نگینہ بیکری میں چائے پیتا رہا۔''

لاہور کا عرب ہوٹل نگینہ بیکری سے پہلے کا ادبی اڈہ تھا۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو عرب ہوٹل کی محفلیں درہم برہم ہو چکی تھیں۔ صرف دو ایک بار میں نے وہاں چراغ حسن حسرت کو چائے پیتے دیکھا۔ چونکہ حسرت صاحب کے ساتھ ہمارے گھریلو مراسم بھی تھے۔ اس لیے میں ان کی خدمت میں وہاں کبھی کبھی حاضر ہو جایا کرتا۔ مگر یہ عرب ہوٹل کے آخری دن تھے۔ گوپال متل نے میری ہوش سے پہلے کے عرب ہوٹل کا نقشہ بھی کھینچا ہے اور اختر شیرانی کا ذکر بڑی حقیقت بیانی کے ساتھ کیا ہے۔ گوپال متل لکھتے ہیں:

''اسلامیہ کالج کے سامنے عرب ہوٹل لاہور کے آڑے ترچھوں کا اڈہ تھا۔ ان میں زیادہ تر ادیب شاعر اور صحافی تھے۔ یہ لوگ ایسے اداروں میں کام کرتے تھے جہاں تنخواہ قلیل ملتی تھی۔ وقت پر بھی نہیں ملتی تھی اور کسی ماہ ناغہ بھی ہو جاتا تھا۔ لیکن یہ ادیب شاعر صحافی اپنے حال میں مست رہتے تھے۔ اور اپنی زندہ دلی پر غم زمانہ کی پرچھائیں نہیں پڑنے دیتے تھے۔ عرب ہوٹل بڑا غریب نواز ہوٹل تھا۔ دو کبابوں نصف نان اور چائے کی ایک پیالی میں صبح کا ناشتہ ہو جاتا تھا۔ بھنے ہوئے گوشت کی نصف پلیٹ اور ایک نان میں ایک وقت کا کھانا ہو جاتا۔ وہاں کے بیٹھنے والوں میں بھائی چارہ بھی بہت تھا۔ اگر کسی کی جیب میں پیسے نہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ سگریٹ یا چائے یا کھانے سے محروم رہے۔ ہری چند چڈہ ''ملاپ'' اخبار میں ملازم تھے۔ عرب ہوٹل کے حاضر باشوں میں ان کی شخصیت کافی

نمایاں تھی۔ لاابالی پن میں وہ اپنی مثال آپ تھے۔ تنخواہ ملتی تو قرضوں کی ادائیگی کے بعد جو بچ رہتا اسے اسی دن اپنے دوستوں کی تواضع میں خرچ کر دیتے اور دوسرے دن پھر قرض کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ وہ دوراتیں ایک جگہ مشکل سے سوتے تھے۔ وہ اردو نثر بڑی اچھی لکھ لیتے تھے۔ اردو ادب کا ان کا مطالعہ بھی کافی تھا۔ لیکن قلندری ان کے مزاج پر اتنی غالب تھی کہ جم کر کام کرنا ان کے بس میں نہیں تھا۔ چراغ حسن حسرت عرب ہوٹل کی مجلس کے میر تھے۔ انہوں نے مولانا ابو الکلام آزاد کے ساتھ ''الہلال'' میں کام کیا تھا۔ ''زمیندار'' اخبار میں وہ فکاہات کے عنوان سے مزاحیہ کالم لکھتے تھے۔ جس کی ان دنوں بڑی دھوم تھی۔ اپنے اس کالم میں اتحاد پارٹی کا جو قصیدہ لکھا تھا وہ زباں زد خاص و عام تھا۔

تیرا یار نریندر ناتھ اتحاد پارٹی
سارے ٹوڈی تیرے یار اتحاد پارٹی

اپنے اسی انداز میں انہوں نے پنجاب کا سیاسی جغرافیہ بھی لکھا تھا۔ جس میں پنجاب کی سیاسی شخصیتوں پر بہت دلچسپ چوٹیں کی تھیں۔ اردو زبان پر مولانا کو بلا کا عبور تھا۔ عبد المجید بھٹی کا دفتر عرب ہوٹل کے پاس ہی تھا۔ پہلے وہ بچوں کی نظمیں لکھا کرتے تھے۔ ان دنوں بالغوں کے لیے نظمیں لکھ رہے تھے۔ وہ عرب ہوٹل میں بھی بیٹھتے تھے اور مادی طور پر وہ زیادہ خوشحال نہیں تھے مگر دوستوں کی دعوتیں کرنے میں بڑے فیاض تھے۔ بڑے خلیق مرنجان مرنج آدمی تھے۔ عرب ہوٹل کے بیٹھنے والوں میں سے سب سے دلچسپ شخصیت باری علیگ کی تھی جو خود کو اشتراکی ادیب لکھتے تھے۔ اصل نام غالباً عبدالباری تھا۔ اشتراکی بنے تو عبدیت پر سے ان کا ایمان اٹھ گیا اور صرف باری رہ گئے۔ ''کمپنی کی حکومت'' کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جو کئی بار چھپی۔ کچھ کتابچے بھی انہوں نے لکھے تھے اور مختلف اخباروں میں کام بھی کرتے رہے تھے۔ بڑے ہی آزاد خیال اور قلندر صفت آدمی تھے۔ جب وہ ''شہباز'' میں کام کرتے تھے تو کچھ دوستوں نے کہا کہ اگر وہ پتلون اتار کر ''شہباز'' کے دفتر سے عرب ہوٹل تک ہو آئیں تو ایک شاندار دعوت ہو گی۔ باری واقعی تیار ہو گئے اور جو کہا تھا کر گزرے۔ اس کا طریقہ انہوں نے یہ اختیار کیا کہ چلتے چلتے نعرے لگاتے جاتے تھے۔ راہ گیروں نے مجذوب سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ پنجابی نیشنلزم کے زبردست

دائی تھے۔ ترنگ میں ہوتے تو کہتے کہ جب کوئی پنجابی اردو بولتا ہے تو ایسے لگتا ہے جیسے وہ جھوٹ بول رہا ہو۔ عرب ہوٹل کے یہ قلندر ادیب دنیا و مافیہا سے بیگانہ نشاط کامیوں میں سرشار تھے۔ زندگی کا صرف ایک ہی مقصد تھا کہ اپنی کج کلاہی کی روش کو زندہ رکھا جائے۔ معاشرے سے ان کا رابطہ صرف اس حد تک تھا کہ جو جسم و جان کا رشتہ قائم رکھنے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ یعنی پیٹ پالنے کے لیے کسی اخبار کے دفتر میں چھوٹی موٹی نوکری کر لینا۔ کسی پبلشر کے لیے ترجمہ کر دینا۔ کوئی کتاب یا مجموعہ مرتب کر دینا۔ کامیابی کو یہ لوگ شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ کیونکہ ان کے نزدیک یہ طے تھا کہ کامیابی ناجائز طریقوں سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ ان میں کبھی کسی بات پر اتفاق ہوتے دیکھا نہ جھگڑا۔ اتفاق اس لیے نہیں ہوتا تھا کہ سب لاعلاج حد تک انفرادیت پسند تھے، اور جھگڑا یوں نہیں ہوتا تھا کہ ان کے نزدیک یہ ان کی انفرادیت میں مداخلت تھی۔ حاصل زندگی یہ تھا کہ محفل میں کوئی چلتا ہوا جملہ کہہ دیا جائے یا کوئی ادب پارہ لکھ دیا جائے۔ جو ادیب جتنا زیادہ غیر معروف ہوتا اتنی ہی اسے زیادہ داد ملتی۔ یہ بھی ایک طرح سے ناکامی کی پرستش تھی۔ یہ اس زمانے کا کمال تھا کہ گدڑیوں میں لعل مل جاتے تھے۔ لاہور کے گھٹیا ہوٹلوں میں بارہا ایسے گمنام لوگ ملے جو بہت عمدہ شعر کہتے تھے۔ یہ ایسے فرہاد تھے جو دریوزۂ شہرت گہہ خسرو کو اپنے لیے باعث ننگ سمجھتے تھے۔ سرکاری درباری شاعر اس زمانے میں بھی تھے۔ لیکن ادبی حلقوں میں انہیں نہ تو قابل تقلید سمجھا جاتا تھا نہ مستحق رشک۔“

یہاں گوپال متل کی کتاب کا اقتباس ختم ہوتا ہے۔



اب میں لاہور کے پیسہ اخبار والے ہوٹل کا ذکر کروں گا۔ گوپال متل کی کتاب میں سے اقتباس میں نے اس لیے یہاں دیا ہے کہ اس میں ہماری ہوش سے پہلے کے عرب ہوٹل اور نگینہ بیکری کا تفصیل سے ذکر تھا۔ اور میں چاہتا تھا کہ ان ہوٹلوں میں بیٹھنے والے ادیبوں کی محفلوں کا ذکر اذکار ایک طرح سے اس کتاب میں ریکارڈ ہو جائے۔ پیسہ اخبار والے جس ہوٹل کا میں تذکرہ کرنے والا ہوں وہ بھی ایک معمولی سا چائے خانہ تھا۔ اس کا مقابلہ آپ کافی ہاؤس اور پاک ٹی ہاؤس ایسے ریستورانوں سے نہیں کر سکتے۔ یہ چائے خانہ بھی ایک چھوٹی سی دکان میں تھا جس کے

باہر تھڑے پر انگیٹھیاں بنی ہوئی تھیں جہاں چائے وغیرہ پکتی اور کھانا تیار ہوتا تھا۔ چونکہ مکتبہ اردو اور رسالہ ''سویرا'' کے دفتر قریب تھے اور میرا وہاں تقریباً روز جانا ہوتا تھا اس لیے میں اپنے کسی شاعر ادیب دوست کے ساتھ پیسہ اخبار والے اس چائے خانے میں چائے پینے آ جاتا۔ لاہور کا ایک قلندر صفت آرٹسٹ مسٹر مائیکل اکثر اس چائے خانے میں آ کر بیٹھتا تھا۔ مائیکل اپنی طرز کا منفرد آرٹسٹ تھا۔ اونچا لمبا، چوڑے شانوں والا یہ ادھیڑ عمر کا آرٹسٹ رائل پارک کی ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں ڈیرے ڈالے ہوئے تھا۔ وہ آرٹ پر گفتگو بڑی اثر دار کرتا تھا۔ آزاد خیال آزاد منش تھا۔ دو وقت کی روٹی کے واسطے تھوڑا بہت کمرشل کام کر لیتا اور پھر بے نیاز ہو جاتا۔ پیسہ اخبار والی اسٹریٹ والے ہوٹل کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ یہ ہوٹل یا چائے خانہ آج بھی اپنی جگہ پر موجود ہے۔

ایک بار میرے ساتھ امرتسر کا ایک گویا بھی تھا جس کا نام نذیر امرتسری تھا۔ ہم دونوں اس چائے خانے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ مائیکل آرٹسٹ بھی آ گیا۔ میری اس سے سلام دعا تھی۔ وہ ہمارے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ ہم نے اس کے لیے بھی چائے منگوائی۔ وہ اپنی ایک تصویر کے بارے میں گفتگو کرنے لگا جو وہ ان دنوں اپنی کوٹھڑی میں بنا رہا تھا۔ اس کی باتیں بڑی دلچسپ اور معنی خیز ہوتی تھیں۔ اپنے فن کی تاریخ پر اس کی گہری نظر تھی۔ میں اس کی باتیں بڑے غور سے سنا کرتا۔

انارکلی کے شروع میں ایک ممتاز ہوٹل بھی ہے۔ قیام پاکستان کے وقت اس ہوٹل میں ہم کچھ ادیب آ کر بیٹھا کرتے۔ مکتبہ اردو یا نیا ادارہ سے اپنی کتاب کا ایڈوانس یا بقایا وصول کرتے اور ممتاز ہوٹل میں چائے پینے آ جاتے۔ میں، ابن انشا، ساحر لدھیانوی، ابراہیم جلیس وغیرہ۔ اس ہوٹل کے مالک کو موسیقی سے بڑا لگاؤ تھا۔ اس نے ہوٹل میں اپنے کاؤنٹر کے پاس گراموفون ریکارڈوں کے ڈھیر لگا رکھے تھے اور سارا دن ان کی ریکارڈنگ ہوتی رہتی تھی۔ وہ آواز اتنی اونچی رکھتا تھا کہ کبھی کبھی ہوٹل کے کیبن میں بیٹھے ہمیں بات کرنی مشکل ہو جاتی تھی۔ پھر ہم میں سے کوئی جا کر لاؤڈ اسپیکر کی آواز کو دھیمی کرواتا۔ اس زمانے میں ہمینت کمار کا گانا:

نہ یہ چاند ہو گا نہ تارے رہیں گے

بڑا مقبول تھا۔ ہمیں بھی یہ گانا بڑا پسند تھا۔ چنانچہ ہم جب بھی ممتاز ہوٹل میں چائے پینے آتے یہ گانا فرمائش کر کے سنا کرتے۔ اس ہوٹل کا کھانا بھی بڑا معیاری اور عمدہ ہوتا۔ جس روز ہمارے پاس زیادہ پیسے ہوتے تو دوپہر کا کھانا بھی اسی ہوٹل میں کھاتے۔ یہ ہوٹل آج بھی ہے مگر وہاں نہ تو

ریکارڈنگ ہوتی ہے اور نہ ہی وہ صاحب نظر آتے ہیں جو کاؤنٹر کے پاس ریکارڈوں کا ڈھیر رکھے بیٹھے ہوتے تھے۔

لاہور کی مال روڈ کے اس زمانے کے ایک خاموش خاموش پرسکون ریستوران کو میں کبھی نہیں بھول سکوں گا۔ یہ ریستوران فیروز سنز کے شوروم کے سامنے اس جگہ ہوتا تھا جہاں بعد میں پی آئی اے نے اپنا دفتر کھولا تھا۔ اس ریستوران کا نام ''لورینگز'' تھا۔ اگرچہ وہ زمانہ افراتفری کا نہیں تھا۔ لاہور کی آبادی بھی زیادہ نہیں تھی۔ مال روڈ پر بھی ٹریفک کا یہ شور یہ ہنگامہ نہیں ہوتا تھا۔ مگر یہ ریستوران بعض ادیب دوستوں کے بقول ضرورت سے زیادہ خاموش اور پرسکون تھا۔ مجھے اس ریستوران کی فضا بہت پسند تھی۔ بڑا صاف ستھرا ماحول تھا۔ فرش پر قالین بچھے ہوتے۔ تانبے کی چوکور میزیں چمک رہی ہوتی تھیں۔ کونے میں پیتل کے گول گلدان میں موسمی پھول سجے ہوئے ہوتے۔ بیرے خاموش بے آواز قدموں سے چل کر میزوں تک آتے۔ اس ریستوران کی چائے بہت اعلیٰ معیار کی تھی مگر کم لوگ ادھر کا رخ کرتے تھے۔ کبھی کبھی میں ''نوائے وقت'' کے چیف ایڈیٹر اور مایہ ناز صحافی جناب حمید نظامی کو دیکھتا کہ اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھے چائے پی رہے ہیں اور اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں باتیں کر رہے ہیں۔

میرا ایک ہم نام امرتسری کشمیری دوست ہوا کرتا تھا۔ وہ کراچی میں قالینوں کا کاروبار کرتا تھا۔ جب بھی لاہور آتا تانگہ پکڑ کر سیدھا میرے گھر مصری شاہ پہنچ جاتا۔ پھر ہم دونوں تانگے میں سوار مال روڈ پر آجاتے۔ اسے بھی میری طرح ''لورینگز'' ریستوران کا ماحول اور چائے بڑی پسند تھی۔ وہ جتنے دن لاہور میں قیام کرتا ہم روزانہ ''لورینگز'' ریستوران میں جاکر چائے پیتے۔ کچھ عرصے بعد یہ ریستوران بند ہوگیا جس کا ہم سب کو بڑا ملال ہوا۔ بعد میں یہاں پی آئی اے کا دفتر کھل گیا۔ آج کل یہ دفتر بھی یہاں سے چلا گیا ہے۔ اب یہ جگہ بند پڑی ہے۔ برآمدے کا فرش جو کبھی چمکا کرتا تھا گرد آلود رہتا ہے۔ برآمدے کی دیواروں کا چونا گرنے لگا ہے۔ چھت کے کونوں میں جالے لٹک رہے تھے۔ کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسے ایسے خوب صورت تاج محل کھنڈر بن جائیں گے اور پہچانے بھی نہیں جائیں گے۔

شیزان ہوٹل بھی مال روڈ پر ہی واقع ہے۔ یہ بھی لاہور کے جدید ریستورانوں میں تھا۔ اس کا ماحول ارسٹوکریٹ قسم کا تھا اور یہاں کے مستقل بیٹھنے والوں میں ارسٹوکریٹ قسم کے سیاست

دانوں اور بیوروکریٹس کی تعداد زیادہ تھی۔ ہم ادیب شاعر لوگ محض یہاں کی چائے کے شوق میں آ جاتے تھے۔ شیزان کی چائے اور پیسٹری کا معیار بہت اعلیٰ درجے کا تھا۔ میرے ساتھ یہاں آرٹسٹ انور جلال، شجاع، حبیب اور بڈی بھی شامل تھے۔ پاک ٹی ہاؤس والے میرے شاعر ادیب دوست یہاں شاذ و نادر ہی آتے۔ اس ریستوران کی انگریزی فضا انہیں پسند نہیں تھی۔ کچھ کمیونسٹ پارٹی والے بھی یہاں آکر بہترین چائے اور پیسٹری اڑاتے اور مزدوروں کی بھوک اور انقلاب پر گفتگو کرتے تھے۔

پاک ٹی ہاؤس اور کافی ہاؤس کے مقابلے میں ''شیزان'' اس دور کے مہنگے ریستورانوں میں شمار ہوتا تھا۔ انور جمال شمزا شیزان کے پیچھے ایک گلی میں رہتا تھا۔ میں کبھی اس کے گھر جاتا تو ہم چائے پینے شیزان آجاتے۔ ابھی شیزان میں انتارش نہیں ہوتا تھا۔ دیوار کے ساتھ لگے صوفوں پر کہیں کہیں گاہک بیٹھے مدھم آوازوں میں باتیں کر رہے ہوتے۔ شیشے کی میزوں پر پیسٹری کے پنجرے سجے ہوتے۔ فضا میں چائے اور پیسٹری کی مہک پھیلی ہوتی۔ مال روڈ کی طرف شیشے کی دیوار والی سیٹ کبھی خالی مل جاتی تو ہم وہاں بیٹھ کر مال روڈ کا نظارہ کرتے۔ ابھی مال روڈ کے درخت ویگنوں، اسکوٹروں اور رکشوں کے دھویں سے کالے اور پژمردہ نہیں ہوئے تھے۔ ابھی وہ سنہری دھوپ میں شیشے کی طرح چمکتے تھے۔ ایک خوبصورت دن کی تصویر آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ میں اور انور جلال شمزہ شیزان میں شیشے کی دیوار والے صوفے پر بیٹھے تھے۔ ہمارے ہاتھوں میں خوشبودار تلخ چائے کی پیالیاں تھیں اور ہماری نظریں مال روڈ پر جمی ہوئی تھیں۔ کیونکہ باہر بارش ہو رہی تھی۔ یہ جنوری کی بارش تھی۔ ریستوران کی فضا نیم گرم تھی۔ جبکہ باہر سرد برفیلی ہوائیں چل رہی تھیں۔ فٹ پاتھوں کے اوپر جھکے ہوئے پیپل کے درختوں کے زرد پتے بارش اور ٹھنڈی ہواؤں میں گر رہے تھے۔

شیزان کی پیشانی پر ابھی ویسی لکھائی میں بورڈ نہیں لگا تھا جیسا کہ بعد میں لگایا گیا۔ شیزان کے مالک نے انور جلال شمزہ سے کہا کہ وہ ریستوران کے لیے اپنے خاص انداز میں انگریزی میں شیزان کے حروف لکھ دے تاکہ اس کا بورڈ بنا کر باہر لگایا جائے۔ انور جلال جس طرح انگریزی میں شمزہ نام کے دستخط کرتا تھا اس نے ویسے ہی الفاظ میں شیزان لکھ دیا۔ S اور Z بالکل ویسا ہی تھا جیسا انور جلال کے دستخطوں میں تھا۔ مجھے اس نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ ایک روز میں بیڈن روڈ پر سے

ہوتا ہوا اس کے گھر گیا تو وہ کہنے لگا۔

''اے حمید! میں نے اپنے دستخط شیزان والوں کے ہاں فروخت کر دیے ہیں۔''

پھر وہ مجھے مال روڈ پر شیزان کے سامنے لے آیا اور اس کی پیشانی پر لگا بورڈ دکھایا۔ وہ ہو بہو انور جلال کے دستخط تھے۔ ویسے ہی ایس اور زیڈ اور آخر میں اے کے حروف بنے ہوئے تھے۔ انور جلال ٹھنڈا سانس بھر کر کہنے لگا:

''میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ اپنے دستخطوں کا سودا کروں۔ مگر مجبور ہو گیا۔ ان لوگوں کو میری یہ لیٹرنگ پسند تھی اور مجھے پیسوں کی ضرورت تھی۔ بس میں نے اپنے دستخط فروخت کر دیے۔ اب میں ایسے دستخط نہیں کیا کروں گا۔''

انور جلال شمزہ اس کے بعد انگلینڈ چلا گیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ شیزان ہوٹل بھی بند ہو گیا۔ آج اس کی ایک چھوٹی سی شاخ مال روڈ پر دیال سنگھ مینشن میں قائم ہے مگر اس میں وہ بات نہیں رہی۔ مال روڈ پر ہی ایک ہوٹل ''سٹفلز'' ہوا کرتا تھا۔ قیام پاکستان سے پہلے یہاں جام بھی کھنکتے تھے۔ مگر پاکستان کے قیام کے بعد جام و مینا توڑ دیے گئے اور یہاں صرف چائے ملنے لگی۔ پھر اس کی جگہ ''لارڈز'' نام کا ریستوران کھل گیا۔ لارڈز میں بھی زیادہ تر صحافی حضرات ہی بیٹھتے تھے۔ اس کے پہلو میں ایک ہوٹل کیفے اورینٹ ہوا کرتا تھا۔ یہ لارڈز سے کچھ کم درجے کا ریستوران تھا مگر اس کی سب سے بڑی خوبی یا شناخت یہ تھی کہ شام کے وقت یہاں باہر کرسیاں ڈال دی جاتیں جہاں سیاستدان اور اخبار نویس حضرات بیٹھ کر چائے پر تبادلہ خیالات کرتے۔ یہاں بھی میں نے جناب مجید نظامی، مظفر احسانی اور جمیل الزماں کے علاوہ دوسرے اس وقت کے مشہور صحافیوں کو اکثر دیکھا۔ کبھی کبھار ہم بھی اس مجلس میں شریک ہو جاتے اور ان بزرگوں کی باتیں سنتے۔

مال پر ہی ریگل کے چوک میں دو ہوٹل ہوا کرتے تھے۔ ایک کا نام تھا ''پال کیفے'' اور دوسرے کا نام اسٹینڈرڈ ہوٹل تھا۔ یہ دونوں ریستوران پاکستان بننے سے پہلے کے تھے۔ اسٹینڈرڈ ہوٹل میں بھی قیام پاکستان سے پہلے مے نوشی ہوتی تھی جو بعد میں ختم کر دی گئی۔ اسٹینڈرڈ میں شام کو ایک رقاصہ میوزک کے شور میں رقص بھی کرتی۔ ۱۹۴۷ء کے بعد یہ ہوٹل کچھ عرصہ ہی چل سکا۔ پھر اس پر بھی تالا پڑ گیا۔ پال کیفے کا مالک ایک باکسر ٹائپ کا ہندو تھا جس کا نام پال تھا۔

پاکستان بننے کے بعد بھی کافی دنوں تک وہ لاہور میں ہی رہا۔ مجھے یاد ہے وہ کیفے کے باہر ایک طرف آرام کرسی لگا کر مال روڈ کی سیر دیکھتا رہتا۔ اس کی بیوی بھی کبھی کبھی کیفے میں نظر آ جاتی تھی۔ ساڑھی پوش یہ خاتون دبلی پتلی تھی اور دونوں میاں بیوی ایک دوسرے سے بڑی محبت کرتے تھے۔ پال بہت خاموش طبع اور خلیق تھا۔ یہاں چائے اور کھانا بھی ملتا تھا۔ کبھی کبھی ہم یہاں بھی چائے پینے آ جاتے تھے۔ چائے کی کوالٹی بس نارمل سی تھی۔ کچھ مدت بعد پال اور اس کی بیوی اچانک غائب ہو گئے۔ یہ ہوٹل کسی مسلمان نے خرید لیا تھا۔ لاہور کے ہوٹلوں میں ان دنوں ایک شخص کا نام بہترین کھانا پکوانے کے حوالے سے بڑا مشہور تھا۔ نثار صاحب۔ یہ صاحب جس ہوٹل میں بطور منیجر جاتے وہاں کے کھانے کی دھوم مچ جاتی۔ ہر کوئی کھانا کھانے اسی ہوٹل کا رخ کرتا۔ وہ اپنی نگرانی میں نہایت لذیذ کھانا تیار کرواتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ نثار صاحب جن دنوں چینی لنچ ہوم میں تھے تو وہاں تنوری روٹیاں ملتی تھیں اور لوگ دور دور سے دوپہر اور رات کا کھانا کھانے چینی لنچ ہوم میں آتے تھے۔ پال کیفے جب کسی مسلمان کے پاس آ گیا تو اس نے نثار صاحب کو بلوا لیا۔ نثار صاحب کے آتے ہی پال کیفے کی دنیا ہی بدل گئی۔ اس کا طوطی بولنے لگا۔ ہر کوئی کھانا کھانے پال کیفے میں ہی آتا۔ پھر نثار صاحب کہیں چلے گئے اور پال کیفے کی رونقیں ماند پڑنے لگیں۔ یہاں تک کہ ایک روز یہ کیفے بھی بند ہو گیا۔ آج کل یہاں کتابوں کی دکان ہے۔

ریگل سینما کے مال روڈ والے گیٹ کے سامنے ایک ہوٹل ''گارڈینیا'' ہوا کرتا تھا۔ اس ہوٹل نے بھی چند روز اپنی بہار دکھائی اور پھر گمنامی کی تاریکیوں میں ڈوب گیا۔ اب ہم دوبارہ چیئرنگ کراس کی طرف آتے ہیں۔ جہاں آج کل واپڈا ہاؤس ہے۔ یہاں اسی زمانے میں میٹرو ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ یہ ایک پرانی وضع کی زرد رنگ کی دو منزلہ عمارت تھی۔ اوپر رہائشی کمرے تھے صحن میں ایک گول چبوترہ تھا۔ سرِ شام یہاں کرسیاں میزیں لگ جاتیں۔ گاہک یہاں بیٹھ کر چائے وغیرہ پیتے اور ایک خاص وقت پر جب رات بھیگنے لگتی تو انجلا نام کی ایک ڈانسر رنگ برنگی روشنیوں میں نیم عریاں لباس میں نمودار ہوتی اور چبوترے پر آ کر رقص کرنے لگتی۔ شروع میں میٹرو ہوٹل میں مے نوشی عام ہوتی تھی۔ پھر جب شراب پر جزوی پابندی لگی تو کسی کو ہوٹل میں بیٹھ کر بھی سرِعام مے نوشی کی اجازت نہیں تھی۔ چنانچہ میٹرو ہوٹل میں پھر چائے کی کیتلیوں میں شراب سپلائی ہونے لگی۔ شوقین لوگ سرِ شام لان میں بچھی کرسیوں پر آ کر بیٹھ جاتے اور چائے کا آرڈر دیتے۔ بیروں کو

معلوم تھا کہ چائے پینے والے کون ہیں اور چائے کی آڑ میں دختِ رز سے جی بہلانے والے کون ہیں۔ چنانچہ مے نوشوں کے آگے چائے کی جو کیتلیاں لا کر رکھی جاتیں وہ شراب سے بھری ہوتی تھیں ساتھ ہی بل بھی آ جاتا تھا جس کی ادائیگی اسی وقت کرنی ہوتی تھی۔ مے نوش حضرات شغل مے نوشی چائے کی پیالیوں سے کرتے۔ انہیں دیکھ کر ایسا لگتا کہ وہ بغیر دودھ کے چائے پی رہے ہیں۔ لیکن وہ پیالی پر پیالی چڑھائے جاتے۔ لاہور کا یہ واحد ہوٹل تھا جہاں عرف عام میں لوگ چائے پی کر مدہوش ہو جاتے تھے۔ کچھ دیر بعد شراب پر مکمل پابندی لگ گئی اور میٹرو کی رونقیں بھی ختم ہو گئیں۔ اینجلا کا رقص بھی ختم ہو گیا۔ اس کے بعد ایک وقت ایسا بھی آیا کہ میٹرو ہوٹل پر کسی آسیبی کھنڈر کا گمان ہوتا۔ اخبار ''مغربی پاکستان'' کا دفتر اسی ہوٹل کی بلڈنگ میں چڑیا گھر کے گیٹ کے بالکل سامنے تھا۔ ہم کبھی اس دفتر کی طرف جاتے ہوئے میٹرو ہوٹل کی طرف دیکھتے تو وہاں ویرانی برس رہی ہوتی تھی۔ لوگوں نے وہاں رہائش بھی ترک کر دی تھی۔ آہستہ آہستہ یہ ہوٹل بھی بک گیا اور ایک دن دیکھا کہ اسے گرایا جا رہا ہے۔

یہاں سے تھوڑا آگے جہاں آج کل ہلٹن یا آواری نام کا فائیو اسٹار ہوٹل ہے وہاں اس زمانے میں نیڈوز ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ یہ انگریزی طرز کا رہائشی ہوٹل تھا۔ دونوں طرف لمبے لمبے برآمدوں والے کمروں کی قطاریں تھیں۔ درمیان میں ایک گنبد بنا ہوا تھا۔ یہ گنبد بالکل ویسا تھا جیسا لاہور کے جنرل پوسٹ آفس والی بلڈنگ کا ہے۔ یہ صرف رہائشی ہوٹل تھا اور بڑا مہنگا تھا۔ کبھی ہمارا کوئی دوست یا ملنے والا یہاں آ کر ٹھہرتا تو اس کے کمرے میں بیٹھ کر یہاں کی چائے پینے کا موقع مل جاتا تھا۔ لوگ بڑی شان سے بتایا کرتے کہ میں نیڈو ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ اسی قبیلے کا دوسرا ہوٹل اسمبلی ہال کے پیچھے فلیٹی بھی تھا جو آج بھی اپنی پرانی روایت کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ نیڈو ہوٹل ختم ہو گیا اور اس کی جگہ ہلٹن ہوٹل نے لے لی۔ اس ہوٹل کے پیچھے ایک چھوٹی سی کٹڑی ہوا کرتی تھی جہاں مزدور پیشہ لوگوں نے چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیاں بنا رکھی تھیں۔ تعمیر نو کے سیلاب میں یہ کوٹھڑیاں بھی بہہ گئیں اور وہاں کے غریب مسکین خدا جانے کدھر چلے گئے۔

میکلوڈ روڈ پر بھی کچھ ہوٹل لاہور کے بعض ادیبوں اور صحافیوں کے ٹھکانے ہوا کرتے تھے۔ برسٹل اور ویسٹ اینڈ ہوٹل کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ جہاں زیادہ تر فلمی دنیا سے تعلق رکھنے والے لوگ ہی بیٹھتے تھے۔ ان کے علاوہ میکلوڈ روڈ کا ایک بڑا مشہور ہوٹل لاہور ہوٹل کے نام سے ہوا کرتا

تھا۔ یہ درمیانے درجے کا بڑا صاف ستھرا شریفانہ ہوٹل ہوتا تھا۔ اس کے ہال میں کئی آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ اس کے کیبن بھی تھے جہاں لوگ فیملی کے ساتھ بیٹھ کر چائے پیتے اور کھانا کھاتے تھے۔ یہ ہوٹل بھی قیام پاکستان سے پہلے کا تھا۔ یہ ایک جہازی بلڈنگ تھی جس کے نیچے لاہور کی شاید پہلی لانڈری کی دکان ہوتی تھی جس کا نام پارسی لانڈری تھا۔ اس کے ساتھ پرانی انگریزی کتابوں کی دکان ہوتی تھی جہاں اب اورینٹ ہوٹل ہے وہاں ایک پرانی کوٹھی ہوا کرتی تھی۔ لاہور ہوٹل میں زیادہ تر جرنلسٹ بیٹھ کر چائے پیتے تھے۔ جن دنوں یعنی ۱۹۵۲ء میں میں فلیمنگ روڈ پر رہتا تھا تو میں اخلاق احمد دہلوی یا فاروق عادل یا نواز کے ساتھ اکثر لاہور ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پیتا۔ چھ آنے کا ہاف سیٹ ملتا تھا۔ اس ہوٹل کی چائے بڑی معیاری تھی۔ خاص قسم کے سیدھے سادے سفید رنگ کی پیالیاں ہوتیں جن پر نیلا حاشیہ لگا ہوتا۔ ہال کمرے میں گھوڑوں کی ایک بڑی تصویر بھی لگی ہوتی تھی۔ مشہور صحافی فاروق مظہر یہاں کے مستقل بیٹھنے والوں میں سے تھے۔ لاہور میں جب ٹیلی ویژن شروع ہوا تو اس ہوٹل کے ایک بڑے کمرے میں ٹی وی سیٹ لگا دیا گیا۔ یہاں بیٹھ کر چائے پینے والوں سے چار چھ آنے ٹی وی دیکھنے کے بھی وصول کیے جاتے۔ یہاں چائے منگوائے بغیر ٹی وی دیکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ لاہور ہوٹل میں میں اپنے دوستوں کے ساتھ بہت بیٹھا ہوں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میرا پاک ٹی ہاؤس میں روزانہ جانا کم ہو گیا تھا۔ باہر سے مجھے کوئی دوست ملنے کے لیے آتا تو میں اسے لاہور ہوٹل میں چائے ضرور پلاتا۔ دو تین روپوں میں ہم چائے بھی پیتے اور کیک پیسٹری بھی کھالیا کرتے تھے۔ چار آنے کی بڑی تازہ اور ملاوٹ سے پاک اس ہوٹل کی پیسٹری ہوتی تھی۔ مگر مجھے لاہور ہوٹل کے فروٹ کیک بڑے پسند تھے۔ مگر اس ہوٹل کو بھی زمانے کی ہوا لگ گئی اور ایک روز یہ ہوٹل بھی گرا دیا گیا اور اس کی جگہ ایک کمپلیکس تعمیر ہو گیا۔ آج میکلوڈ روڈ پر سے گزرتے ہوئے لاہور ہوٹل کی کوئی نشانی دیکھنے میں نہیں آتی۔

لاہور ریلوے اسٹیشن کے سامنے ایک پرانی طرز کا کوٹھی نما برگینزا ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ یہ بھی رہائشی ہوٹل تھا اور قیام پاکستان سے پہلے کہا جاتا ہے کہ یہاں صرف انگریز لوگ ہی آ کر ٹھہرا کرتے تھے۔ قیام پاکستان کے تھوڑی مدت بعد یہ ہوٹل بھی مٹ گیا۔ اب اس کی جگہ فلک بوس کمرشل ہوٹلوں کی عمارتیں کھڑی ہیں۔ اب میں آپ کو ایک ایسے چائے خانے میں لیے چلتا

ہوں جس کا بہت کم لوگوں کو علم ہوگا۔ اس چھوٹے سے چائے خانے کا نام بڑا عجیب وغریب اور مشکل تھا، یعنی ''پرائنس ٹی ہاؤس''۔ ہے نا عجیب نام۔ یہ چائے خانہ یا ٹی ہاؤس پرانی انارکلی میں نابھہ ہاؤس کے قریب ایک مکان کی نچلی منزل میں تھا اور اسے دو عیسائی عورتیں چلاتی تھیں۔ اس ہوٹل میں میں اور منیر نیازی چائے پینے چلا یا کرتے تھے۔ مگر کبھی کبھی ہی جاتے تھے۔ ہمیں اس ٹی ہاؤس کی ٹھنڈی ٹھنڈی، سیل زدہ فضا پسند تھی۔ یہاں بالکل گھر کا سا ماحول تھا اور عیسائی خاتون اس شفقت سے چائے بنا کر لاتی جیسے وہ اپنے بچوں کے لیے چائے لا رہی ہو۔ اب یہ ٹی ہاؤس بھی کہیں نظر نہیں آتا۔

غالباً ۱۹۴۹ء میں مال روڈ کی رنگا سنگھ بلڈنگ سے ایک ہفتہ وار ادبی رسالہ ''نظام ویکلی'' کے نام سے نکلا کرتا تھا۔ میں اس کا ایڈیٹر بنا دیا گیا۔ یہاں اکثر شاعر ادیب آتے رہتے۔ ان میں ناول نویس احمد شجاع پاشا کا نام نمایاں ہے۔ نمایاں اس لیے کہ وہ اکثر وہاں آتے کیونکہ ان کی رسالے کے مالکان چودھری برادرز سے دوستی تھی۔ میرے بھی ان سے مراسم تھے۔ اس دفتر کے نیچے جہاں آج کل اسٹیٹ بنک آف پاکستان کی عظیم الشان عمارت کھڑی ہے وہاں لب سڑک ایک گھنے درخت کے نیچے ایک چائے کا کھوکھا ہوا کرتا تھا۔ ہم لوگ دفتر سے اتر کر اکثر اس کھوکھے کے اندر بیٹھ کر چائے پیتے۔

ہمارے ساتھ کئی دوسرے ترقی پسند ادیب بھی ہوتے تھے۔ یہاں ٹوٹی پھوٹی کرسیوں پر بیٹھ کر چائے پیتے ہوئے ادب، سیاست، شاعری اور دیگر فنون لطیفہ پر گرما گرم بحثیں ہوتیں۔ اس کھوکھے سے قریبی دفاتر کو بھی چائے سپلائی کی جاتی تھی۔ اس زمانے میں مال روڈ بڑی خاموش ہوا کرتی تھی۔ پیپل کے گھنے درختوں کے درمیان گزرتی مال روڈ کسی بہت بڑے باغ کی کشادہ روش لگا کرتی تھی۔ اتنی موٹریں کہاں تھیں۔ رکشا، اسکوٹر، ویگنیں ابھی کسی کے خواب وخیال میں بھی نہیں آئی تھیں۔ کافی دیر کے بعد کرشن نگر سے آرائے بازار جانے والی صرف ایک دو منزلہ بس ہی گزرتی۔ کبھی کبھار کوئی موٹر بھی گزر جاتی۔ عام طور پر تانگے اور سائیکل ہی دکھائی دیتے تھے۔ فٹ پاتھ سے ہٹ کر سبز گھاس کی ایک پٹی ہائی کورٹ سے اپر مال تک دونوں طرف چلی گئی تھی۔ کبھی دل چاہتا تو ہم مال روڈ کے کنارے اس گھاس کی پٹی کی ہری ہری دوب پر بیٹھ کر چائے کا لطف اٹھاتے۔ آج مال روڈ پر کسی ایسی جگہ بیٹھ کر چائے پینے کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اول تو ایسی

سرسبز گھاس کی پٹی اب کہیں نہیں ہے۔ اگر ہم کہیں مال روڈ کے کنارے کوئی سبز سپاٹ تلاش کر کے تھرمس میں چائے ڈال کر بیٹھ بھی جائیں تو ایک منٹ کے اندر اندر ہمارے اوپر سے نہ جانے کتنی ویگنیں اور سکوٹر گزر جائیں۔ آج جب میں اسٹیٹ بنک آف پاکستان کی نئی عظیم الشان عمارت کے سامنے سے گزرتا ہوں تو مجھے وہ چائے کا چھوٹا ساغریبانہ کھوکھا بہت یاد آتا ہے۔ جس کی ٹوٹی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ کر ہمیں چائے کا صحیح لطف آتا تھا۔

لاہور منٹگمری روڈ پر ایک ایسا ہوٹل بھی تھا (اور آج بھی ہے) جہاں شاذونادر ہی کبھی کوئی آتا جاتا نظر آتا تھا۔ کسی چھوٹے سے جرمن قلعے کے ماڈل ایسے اس ہوٹل پر ایک ابدی خاموشی چھائی رہتی۔ بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ یہ جگہ آسیبی ہے اور اس ہوٹل میں کبھی ایک عورت کا خون ہوا تھا۔ اس کی روح اس کے کمروں میں پھرتی ہے۔ وہاں کبھی کوئی رہنے نہیں آیا تھا۔ ہمارے لیے یہ ہوٹل ایک اسرار کی حیثیت رکھتا تھا۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ اس ہوٹل پر ماہ و سال کی گرد جمتی چلی گئی، اور آج یہ ہوٹل ایک ایسے گرد آلود چھوٹے سے ماڈل کی طرح ہو گیا ہے جسے کوئی شخص کسی عجائب گھر سے چرا کر لایا ہو اور اسے سڑک کے کنارے رکھ کر بھول گیا ہو۔ آج بھی وہاں شاید ہی کسی ذی روح کی شکل نظر آتی ہو۔

علاوہ ازیں پرانے لاہور کے کچھ ایسے چائے خانے بھی تھے جو اندرون شہر واقع تھے۔ ان میں سے بعض اب بھی دکھائی نہیں دیتے۔ بعض اجناس کی دکانوں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ گوالمنڈی چوک میں آمنے سامنے جو دو ہوٹل ہیں وہاں ہم لوگوں نے بڑا وقت گزارا ہے۔ ان کا ذکر میں گوالمنڈی کے باب میں تفصیل سے کروں گا۔ فی الحال میں مذکورہ چائے خانوں اور لاہور کے پرانے ریستورانوں کے بیان پر اکتفا کرتے ہوئے اس باب کو ختم کرتا ہوں۔ ہاں پاک ٹی ہاؤس کے بارے میں اتنا ضرور کہوں گا کہ یہ ریستوران میری حسین ترین یادوں کا تاج محل ہے۔

سال چھ ماہ میں کبھی یہاں جاتا ہوں تو مجھے اپنے ان پیارے دوستوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں، ان کے چہرے دکھائی دیتے ہیں جو اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔



قیام پاکستان کا لاہور

ہماری نئی نسل ۱۹۴۷ء کے لاہور شہر کا شاید ہی کوئی تصور اپنے ذہن میں قائم کر سکے۔ وہ لاہور آج کے لاہور سے بڑا مختلف تھا۔ ہم لوگ امرتسر سے ہجرت کر کے لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر آئے تو پلیٹ فارم پر مسلم لیگ کے رضا کاروں نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ لاہور کے زندہ دل اپنے بھائیوں کے لیے دیگیں پکا کر وہاں لائے ہوئے تھے۔ مسلم لیگ کے ایک رضا کار نے مجھ سے کہا:

''ڈاک خانے کی طرف سے باہر جائیں۔''

لیگ کے رضا کار امرتسر کے مہاجروں کو پلیٹ فارم نمبر ۴ والے گیٹ کی بجائے ریلوے پوسٹ آفس والی بغلی گلی سے ہو کر باہر جانے کی ہدایت کر رہے تھے۔ میں نے رضا کار سے سوال کیا:

''ہم عام گیٹ سے کیوں نہ باہر جائیں؟''

اس پر مسلم لیگی رضا کار نے شہید گنج کی طرف اشارہ کر کے کہا:

''سکھ شہید گنج کے اوپر سے فائرنگ کر رہے ہیں۔''

میں تو حیران رہ گیا۔ میں نے تلخ لہجے میں کہا:

''ہم نے تو امرتسر اس لیے چھوڑا کہ وہاں ڈوگرہ فوج آگئی تھی مگر تم لوگوں نے یہاں بھی دشمن کو اپنے سر پر سوار کر رکھا ہے۔''

بہر حال ہم لوگ ریلوے پوسٹ آفس والی گلی کی طرف آ گئے۔ ان دنوں اسٹیشن کی اس طرف تانگوں کا اڈہ ہوا کرتا تھا۔ جوں ہی ہم گلی سے نکل کر کھلی جگہ پر آئے، شہید گنج کی طرف سے فائرنگ شروع ہوگئی۔ ہم فوراً سڑک پر لیٹ گئے اور رینگتے ہوئے سامنے والے چھوٹے سے پلاٹ میں پہنچے جہاں ایک تمبو قنات لگی تھی۔ یہاں بھی مسلم لیگ کے رضا کار خدمت کے لیے موجود تھے۔ ہم وہاں بیٹھ گئے۔ فائرنگ بند ہوگئی۔ اس جگہ سے مہاجروں کو رفیوجی کیمپ پہنچا دیا جاتا تھا۔ ہم سے بھی پوچھا گیا کہ ہم لاہور میں اپنے کسی رشتے دار کے پاس جائیں گے یا والٹن کے

مہاجرین کیمپ میں۔ میں نے کہا کہ ہم اپنے عزیزوں کے پاس جانا چاہتے ہیں۔ رضا کار نے کہا:

''ابھی لاری آجائے گی۔ آپ کو یہاں سے شہر پہنچا دیا جائے گا۔''

میں نے کہا، ''ہم خود چلے جاتے ہیں۔''

وہ بولا، ''یہاں ہندو سکھ غنڈے شہید گنج سے فائرنگ کر رہے ہیں آپ کچھ دیر ٹھہر ہی جائیں۔''

اس وقت اسٹیشن کے احاطے میں لوگ مسلم لیگ کی جھنڈیاں اٹھائے پاکستان زندہ باد کے نعرے لگاتے اسٹیشن کے احاطے کے اندر جا رہے تھے۔ اسٹیشن کے سامنے والی سڑک پر دو لاشیں پڑی تھیں۔ جہاں آج اسٹیشن کے سامنے ماڈرن ہوٹلوں کی عمارتیں کھڑی ہیں اس وقت یہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ صرف ایک گھاس کا دائرہ نما چھوٹا سا میدان تھا جہاں حجام بیٹھ کر لوگوں کی ڈاڑھیاں مونڈھتے تھے۔ دائیں جانب نصف دائرے کی شکل میں چائے اور کھانے پینے کی دکانیں تھیں۔ ان کے اوپر چھت پر بے شمار خالی چار پائیاں بچھی رہتیں۔ یہاں دو آنے رات پر مسافروں کو منجی بستر امل جاتا تھا۔

میرے ساتھ امرتسر سے میرا ایک چھوٹا بھائی، دو چھوٹی بہنیں اور والدہ ہی آئی تھیں۔ باقی بہن بھائی اور والد صاحب امرتسر میں ہی رہے تھے۔ والد صاحب کہتے کہ ہم اپنا جدی پشتی مکان اچانک چھوڑ کر کیوں جائیں؟ اکثر لوگ اسی طرح سوچتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ یہ وہ لوگ تھے جو سیاسی طور پر بہت سے حقائق سے ناواقف تھے۔ لیکن آخر کار انہیں بھی اپنا شہر اور گھر بار چھوڑنا پڑا۔ کچھ لوگوں کا خیال ابھی تک یہی تھا کہ امرتسر گورداسپور پاکستان میں آجائیں گے۔ میں اپنے گھر والوں کو لے کر لاری میں سوار ہو گیا۔ لاری نے ہمیں وسن پورہ کے چوک میں پہنچا دیا۔ یہاں میری بڑی بہن کا مکان تھا۔ وسن پورہ اس زمانے میں ایک چھوٹی سی آبادی تھی۔ اس کے آگے کھیت ہی کھیت تھے۔ شاد باغ کے نام سے بھی ابھی کوئی واقف نہیں تھا۔ ہر مکان کے آگے حوض بنی ہوئی تھی جس میں مکان کا گندہ پانی جمع ہوتا تھا۔ کمیٹی کی گاڑی آ کر وہ پانی نکال کر لے جاتی تھی۔ لاہور ہمارے لیے کوئی اجنبی شہر نہیں تھا۔ رات ہم نے وسن پورہ مکان میں گزاری۔

دوسرے دن میں گھر سے نکل کر سیدھا ریلوے اسٹیشن آ گیا۔ میرا خیال تھا کہ شاید کسی ٹرین میں ہمارے گھر کے لوگ بھی پاکستان پہنچ جائیں۔ لاہور اسٹیشن کے ایک پلیٹ فارم پر ہندو سکھ

عورتیں اور مرد ٹولیوں کی شکل میں سہمے ہوئے بیٹھے تھے۔ مگر مسلمانوں نے انہیں کچھ نہ کہا تھا اور وہ امرتسر جانے والی شرنارتھی ٹرین میں بیٹھ کر وہاں سے چلے گئے۔ جبکہ فیروز پور کی طرف سے کئی ہوئی ٹرینیں آ رہی تھیں۔ امرتسر کی طرف سے بھی دوپہر کے بعد مسلمان مہاجرین کی ایک گاڑی آ گئی جس میں مسلمانوں کی لاشیں اور کٹے ہوئے اعضا بکھرے ہوئے تھے۔ ڈبوں میں سے ابھی تک خون باہر گر رہا تھا۔ لوگوں نے لاشوں کو باہر نکال کر ٹرالیوں پر لادنا شروع کر دیا۔ میں ایک خالی ڈبے میں داخل ہوا تو مجھے سیٹ پر ایک کٹا ہوا انگوٹھا دکھائی دیا۔ وہ نیلا پڑنے لگا تھا۔ پلیٹ فارم نمبر ۳ پر مسلم لیگ کا ایک ڈاکٹر ایک دم توڑتے ہوئے مسلمان مہاجر سے پاکستان میں اس کے کسی رشتے دار کا پتہ پوچھ رہا تھا۔ مہاجر پر نزع کا عالم طاری تھا۔ اس کی آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ وہ لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ اس کے ہونٹ آہستہ سے ہلے مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا اس کی روح پرواز کر گئی۔

میں تقریباً ہر روز اپنے باقی لوگوں کا پتہ کرنے اسٹیشن پر جاتا۔ ابھی میں نے کوئی افسانہ نہیں لکھا تھا۔ میں ناصر کاظمی اور اشفاق احمد کو بھی نہیں جانتا تھا۔ یہ سب دوستیاں، یہ سب رشتے بعد میں قائم ہونے والے تھے۔

لاہور ریلوے اسٹیشن پر روز ہی میں دل فگار منظر دیکھتا۔ انہی دنوں وہاں ہیضہ پھیل گیا۔ مہاجروں نے پلیٹ فارموں پر ہی ڈیرے لگا رکھے تھے۔ ان کیمپوں میں موت کا رقص جاری ہو گیا۔ کئی مہاجر انتقال کر گئے۔ ہر کسی کو پاکستان میں آنے کی خوشی بھی تھی لیکن ایک بے سروسامانی کا عالم بھی تھا۔ کسی کو کسی کی خبر نہ تھی۔ والٹن کا مہاجر کیمپ بھر گیا تھا۔ مشرقی پنجاب سے لٹے پٹے مہاجرین کے قافلے چلے آ رہے تھے۔ ریل گاڑیوں کی آمدورفت تقریباً بند ہو گئی تھی۔ ہمارے گھر کے باقی لوگ لاہور پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ہمیں پہلا مکان فیض باغ میں الاٹ ہوا۔ یہ بوسیدہ سا مکان تھا جس کے نچلے پورشن میں بٹالے کا ایک کوچوان اپنی بیوی بچوں کے ساتھ پہلے سے رہ رہا تھا۔ ہم دوسری منزل پر تھے۔ ہمارے پاس کوئی سامان نہیں تھا۔ فرش پر دری بچھا کر سو جاتے۔ والدہ امرتسر سے کچھ پیسے بچا کر لے آئی تھیں۔ ان سے گزارا ہو رہا تھا۔ شاہ عالمی سے ایک بارونق کارپٹ روڈ چوک رنگ محل کی طرف جاتی ہے۔ وہاں تب ملبوں کے ڈھیر جگہ جگہ پڑے تھے۔ یہ ڈھیر ٹیلوں کی شکل میں تھے۔ کمیٹی کے بلڈوزروں نے جلے ہوئے مکانوں کو گرا کر

ان کے ملبے ٹیلوں کی شکل میں ادھر ادھر لگا دیے تھے۔رنگ محل جانے کے لیے ان ٹیلوں کے درمیان اونچے نیچے راستے سے گزر کر جانا پڑتا تھا۔ابھی دائیں بائیں کچھ نیم جلے مکان کھڑے تھے۔بعد میں ان مکانوں کو بھی گرا دیا گیا۔شاہ عالمی کے شروع میں واقع بائیں جانب والی لال مسجد کو ذرا بھی نقصان نہیں پہنچا تھا۔حالانکہ یہاں بڑی زبردست آگ لگی تھی جو کئی روز تک جلتی رہی تھی۔مسجد کے دائیں بائیں والے مکان جل کر راکھ کا ڈھیر بن گئے تھے۔مگر مسجد کو کوئی گزند نہیں پہنچا تھا۔اسی طرح موچی دروازے سے نور گلی کی طرف آتے ہوئے بائیں جانب والی مسجد بھی آگ سے بالکل محفوظ رہی تھی۔

کرشن نگر کے آدھے مکان خالی پڑے تھے۔مہاجرین اتنی تیزی سے ابھی آباد ہونا نہیں شروع ہوئے تھے۔قلعہ گوجر سنگھ والی عبد الکریم روڈ کا بھی یہی حال تھا۔امرتسر کے مہاجروں کا اسی طرف رخ زیادہ تھا۔جس کو جو مکان اچھا لگتا وہ اس میں بیٹھ جاتا۔اس کے باوجود ابھی لاتعداد متروکہ مکان خالی تھے۔ایک روز میں بھی اپنے گھر والوں کے لیے کوئی مکان حاصل کرنے لاہور ہوٹل والی سڑک سے گزر کر قلعہ گوجر سنگھ کی عبد الکریم روڈ پر آ گیا۔لوگ ادھر ادھر مکانوں کی تلاشیاں لے رہے تھے۔یہاں سے غیر مسلم کچھ ایسی سراسیمگی اور افراتفری کی حالت میں بھاگے تھے کہ اکثر مکانوں میں ان کا زیادہ سامان ویسے کا ویسا لگا رہ گیا تھا۔میں ایک مکان کے باورچی خانے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ وہاں دال، چینی، اچار، مربے سے بھرے ہوئے چکنی مٹی کے سفید بیام کارنس پر لگے ہوئے تھے۔کونے میں آٹے دال کی بوریاں بھی تھیں۔برتن بھی اسی طرح لگے تھے۔چولہے میں لگتا تھا کہ کسی نے جلدی میں پانی ڈال دیا تھا۔لکڑی کے کوئلے ابھی تک گیلے تھے۔

میں دوسرے مکان کی طرف بڑھا۔یہ چار منزلہ مکان کافی بڑا تھا۔کچھ لوگ اس کی دوسری منزل کے برآمدے میں رکھے ہوئے لکڑی کے چھ سات صندوقوں کے تالے توڑ رہے تھے۔میں یہاں سے نکل کر تیسرے مکان میں داخل ہو گیا۔یہ مکان بالکل خالی تھا۔فرش پر کاغذ اور کچھ چاول بکھرے ہوئے تھے۔یہ ایک منزلہ مکان تھا اور اس کے صحن میں ایک بیل بھی لگی تھی۔مجھے یہ مکان پسند آ گیا۔میں نے سوچا کل گھر والوں کو یہاں لے آؤں گا۔اس کے بعد مجسٹریٹ سے یہ مکان الاٹ کروا لیں گے۔اتنے میں وہاں ایک تھانیدار بھی آ گیا۔اس نے آتے ہی کہا:

''اوئے منڈیا! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ یہ مکان میرے دوست کو الاٹ ہو گیا ہے۔ تم کوئی دوسرا مکان دیکھو۔''

یہاں مجھے اپنے محلے کا ایک امرتسری دوست مل گیا۔ میں نے اسے کہا:

''یار کوئی مکان دلا دو۔''

وہ ہنس کر کہنے لگا، ''جو چاہے لے لو۔ ادھر سارے خالی پڑے ہیں، میں نے تو سامنے والے مکان پر اپنا تالا لگا دیا ہے۔''

پھر وہ مجھے ایک خالی مکان میں لے آیا جس کے کچن میں کچھ برتن باقی رہ گئے تھے کہنے لگا:

''بس یہ تمہارے لیے ٹھیک رہے گا۔ باہر اپنا تالا لگا کر گھر والوں کو لے آؤ۔''

مکان مجھے بھی اچھا لگا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک کمرے میں میز کے نیچے چھوٹا سا ٹیبل فین پڑا ہے۔ ہمارے فیض باغ والے مکان میں بجلی تو تھی مگر پنکھا نہیں تھا اور رات کو کمرے میں سخت گرمی اور مچھر تنگ کرتے تھے، میں نے کہا:

''یار! یہ ٹیبل فین میں ساتھ لے چلوں؟''

وہ بولا، ''اب یہ تمہارا مال ہے۔ بے شک لے جاؤ۔ مگر تم لوگوں کو اسی مکان میں تو آنا ہے۔''

میں نے کہا، ''وہ تو ٹھیک ہے مگر فیض باغ والے مکان میں رات کو بڑی گرمی ہوتی ہے۔''

''تو اٹھا لو۔ سب لوگ لے جا رہے ہیں۔''

چھوٹا سا جاپانی ٹیبل فین تھا۔ میں نے اسے اٹھا لیا اور اپنے دوست کے ساتھ عبدالکریم روڈ پر آ گیا۔ یہاں سے لاہور ہوٹل کی طرف چل پڑا کہ میکلوڈ روڈ سے ہوتا ہوا ریلوے اسٹیشن اور پھر وہاں سے گندے نالے کے ساتھ ساتھ فیض باغ پہنچ جاؤں گا۔ میرا آنے جانے کا یہی روٹ ہوا کرتا تھا۔ فوراً ہی مجھے احساس ہو گیا کہ ٹیبل فین اٹھا کر میں نے سخت غلطی کی ہے کیونکہ لاہور ہوٹل کے سامنے جہاں عبدالکریم روڈ ختم ہوتی ہے اس کے سرے پر پولیس کے سپاہی علاقے سے باہر نکلنے والوں کی تلاشی لے رہے تھے جو کوئی متروکہ مکان سے کوئی شے اٹھا کر لے جا رہا ہوتا، اسے وہیں پکڑ کر بٹھا لیا جاتا۔ ٹیبل لیمپ میں نے ایک ہاتھ میں لٹکا رکھا تھا اور میں پولیس والوں کے سامنے پہنچ گیا تھا۔ اس وقت میں نے دل میں دعا مانگی کہ یا اللہ اس وقت میری عزت بچا لے

آئندہ سے چوری نہیں کروں گا۔ میری اس غلطی کو معاف کر دے۔ آپ یقین کریں کہ میں ٹیبل فین ہاتھ میں لیے پولیس کے سپاہیوں کے بالکل سامنے سے گزرا مگر کسی نے میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ میرا ایمان ہے کہ اگر انسان اپنے گناہوں کی دل سے توبہ کر لے تو اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرتا ہے۔ حالانکہ میں اس وقت ایک عامیانہ لباس یعنی دھوتی کرتے میں تھا۔ شروع شروع میں، میں گرمیوں میں دھوتی کرتہ ہی پہنا کرتا تھا۔

دوسرے دن ہم اس مکان میں آئے تو وہاں پہلے ہی سے ایک سب انسپکٹر پولیس کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی، اور اس کا مہاجر کنبہ وہاں آباد ہو چکا تھا۔ چنانچہ ہم فیض باغ والے مکان ہی میں رہے۔

ہمارے پاس کوئی ریڈیو وغیرہ نہیں تھا۔ ساتھ والے گھر سے رات کے نو بجے ریڈیو پاکستان لاہور یا پاکستان براڈ کاسٹنگ لاہور سے خبروں کی آواز آتی تو ہم دیوار کے ساتھ کان لگا کر خبریں سنتے۔ امرتسر میں گرمیوں سردیوں مجھے صبح کو مسجد کے سقادے میں نہانے کی عادت تھی۔ میں کمپنی باغ کی میر سے واپس آ کر گھر سے تولیہ صابن اٹھاتا اور سامنے والی مسجد عیداون میں آجاتا تھا۔ کنویں سے پانی کے بوکے نکال کر سقادے کو بھرتا اور پھر سقادے کی پھنسائی ہوئی مسواک کو نکال کر کنویں کے پانی کی دھار کے نیچے بیٹھ جاتا۔ گرمیوں میں کنویں کا پانی ٹھنڈا اور سردیوں میں نیم گرم ہوتا تھا۔ یہاں فیض باغ میں بھی ہم نے ایک مسجد تلاش کر لی جہاں پہلے روز میں اور میرا چھوٹا بھائی نہانے گئے تو لوگوں نے ہمیں گھور کر دیکھا کہ یہ لڑکے کون ہیں جو نماز پڑھنے تو کبھی مسجد میں نہیں آئے اور اب نہانے آ گئے ہیں۔ سقادے بھی بڑے گندے تھے۔ ہم نے سقادے میں نہانا بند کر دیا۔ اسی دن سے میں کنویں کے تر و تازہ پانی سے جدا ہو گیا۔ نہریں امرتسر میں ہی بچھڑ گئی تھیں۔ لاہور آ کر کنویں کا پانی بھی بچھڑ گیا۔ لیکن ہمیں پاکستان آ جانے کی بڑی خوشی تھی۔ اب سب کو علم ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کے لیے پاکستان کی کتنی ضرورت تھی۔

لیکن پاکستان میں ابھی بے سروسامانی کا عالم تھا۔ مہاجرین ابھی تک چلے آرہے تھے۔ یہ بڑی اچھی بات تھی کہ یہاں کے مسلمانوں نے اپنے مہاجر بھائیوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ انہیں اپنے سینے سے لگایا تھا اور ان کی ہر طرح سے مدد کر رہے تھے۔

مہاجرین بھی پاکستان کے شہروں میں پھیل گئے تھے۔ لاہور کو زیادہ تر مرکز نہیں بنایا گیا تھا۔

چنانچہ امرتسر کے مسلمان پشاور اور کوہاٹ تک جا کر آباد ہو گئے۔ حالانکہ امرتسری لاہور کے بہت قریب تھے۔ لاہور میں گوالمنڈی کے علاقے میں امرتسری مہاجروں کی خاصی تعداد نے متروکہ مکان الاٹ کروائے اور یہ علاقہ امرتسریوں کا گڑھ بن گیا۔ اس وقت گوالمنڈی میں بھی کئی مکان خالی تھے۔ ہم نے اس علاقے میں مکان الاٹ کروانے کی کوشش نہیں کی تھی کیونکہ فیض باغ کا علاقہ گندہ ہونے کے باوجود کھلی جگہ پر تھا۔ یعنی اس کے آگے کھیت اور باغ تھے اور یہ بات ہمارے سب گھر والوں کو پسند تھی۔ امرتسر میں بھی ہمارا کٹڑہ میاں سنگھ والا علاقہ شہر کے اندرونی علاقے کی طرح گنجان نہیں تھا اور اس کے باہر چالی کھوہ کے کھیت اور کمپنی باغ تھا۔

گوالمنڈی میں لوگ پاکستان میں آ کر اپنی نئی زندگی کا آغاز کر چکے تھے۔ اس علاقے میں کوئی رش نہیں ہوتا تھا۔ صرف تانگے سائیکل ہی چلتے تھے۔ امرتسری مہاجروں نے دکانیں الاٹ کروا کر اپنا اپنا کاروبار شروع کر دیا تھا۔ نئی دوستیوں کا آغاز ہو رہا تھا۔ ان دوستیوں کی بنیاد پڑ رہی تھی جنہیں آگے چل کر گہرے رشتوں میں استوار ہونا تھا۔ گوالمنڈی سے چوک چیمبر لین کی طرف آئیں تو ایک طرف چار منزلہ خوشنما متروکہ عمارت تھی جس کے باہر روزنامہ ''سفینہ'' کا بورڈ لگا دیا گیا تھا۔ اس اخبار کو وقار انبالوی صاحب ایڈٹ کرتے تھے۔

گوالمنڈی کی گلیاں بھی ابھی صاف ستھری تھیں۔ کہیں آج کی طرح گندگی کے ڈھیر نظر نہیں آتے تھے۔ گاندھی پارک کے باہر گوالمنڈی کے چوک میں مشہور مزدور لیڈر بشیر بختیار کے بھائیوں نے ایک کولہو الاٹ کروایا اور وہاں اصلی گھانی کا کڑوا تیل اور بعد میں آملہ تیل کا کاروبار شروع کر دیا۔ چوک میں آمنے سامنے دو کشادہ دکانیں تھیں جہاں امرتسری مہاجروں نے ہوٹل کھول لیے۔ ان ہوٹلوں میں صبح سے رات تک فلمی گانوں کی ریکارڈنگ ہوتی۔ ہمارا پہلا پاک ٹی ہاؤس اور کافی ہاؤس گوالمنڈی کے یہ ہوٹل ہی تھے۔ ابھی پاک ٹی ہاؤس کی طرف ہماری بھرپور توجہ نہیں ہوئی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے کچھ امرتسری دوست گوالمنڈی میں ہی رہتے تھے اور ہم اسی جگہ ہوٹل میں بیٹھ کر اپنی محفل سجاتے۔ شروع میں ہماری گفتگو کا موضوع امرتسر کے مسلم کش فسادات تھے۔ ہر کوئی اپنے اپنے علاقے میں ہوئے فسادات اور وہاں سے نکلنے کی داستان سناتا۔ پھر کوئی بات کاٹ کر اچانک پوچھتا:

''یار رفیق سنار یا نکل آیا تھا اپنی گلی سے؟''

کیونکہ امرتسری مسلمانوں کے محلوں پر متعصب ہندو سکھوں نے آخری دنوں میں ڈوگرہ فوج کے ساتھ حملے کیے تھے۔ جب تک فوج نہیں آئی تھی امرتسری اپنے اپنے محلوں میں ڈٹے رہے تھے اور بڑی دلیری سے دشمن کا مقابلہ کرتے رہے تھے لیکن جب ڈوگرہ فوج نے آ کر دستی بم مار کر گلی کے آہنی دروازوں کو اڑانا شروع کر دیا اور مشین گنوں سے فائرنگ ہونے لگی تو مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے۔

گوالمنڈی کی ایک گلی میں ہمارے ایک ساتھی نے اردو نیوز سروس شروع کر دی۔ اس کا پورا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ تخلص حسرت تھا۔ حسرت بڑا سوکھا سا کھا لڑکا تھا۔ تیز اور منہ پھٹ تھا۔ اسے جوانی میں ہی دمے کی شکایت ہو گئی تھی۔ اسے بڑی جلد غصہ آ جاتا اور پھر ہانپنے لگتا۔ میرا دوست تھا۔ میں گوالمنڈی میں اس کے مکان میں جاتا تو وہ ایک چھوٹا سا پرانا میز لیے بیٹھا خبریں لکھ رہا ہوتا۔ ایک لڑکا بھی اس نے رکھ چھوڑا تھا جو ان خبروں کی کاپیاں کرتا۔ حسرت ان خبروں کو لے کر خود سائیکل پر نوائے وقت اور امروز کے دفتروں میں تقسیم کرنے جاتا۔ گوالمنڈی سے میو ہسپتال کی طرف آئیں تو دائیں جانب ایک پرانی حویلی ہوتی تھی (یہاں آج کل پرنٹنگ پریس والوں کی ایک منی مارکیٹ بن گئی ہے)۔ ۴۸-۱۹۴۷ء میں یہ حویلی خستہ حالی کی حالت میں تھی۔ اصل میں یہ ایک چھوٹی سی کٹڑی تھی۔ حویلی کی طرح اس کا محرابی دروازہ تھا۔ اندر کچھ پرانے بوسیدہ خالی مکان تھے۔ یہ متروکہ جگہ تھی۔ یہاں جو ہندو سکھ رہا کرتے تھے وہ ہندوستان جا چکے تھے اس کٹڑی میں مہاجر آ کر آباد ہو گئے۔ ہمارے ایک غیر معروف شاعر دوست نے یہاں ایک ایسا مکان الاٹ کروا لیا جس میں جانے کے لیے کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ دوسری منزل میں رہتا تھا۔ اس نے بانس کی ایک سیڑھی اپنی کوٹھڑی میں رکھی ہوئی تھی۔ کوئی اسے ملنے آتا تو وہ سیڑھی لگا دیتا۔ خود بھی اس سیڑھی سے اتر کر گوالمنڈی کے ہوٹل میں چائے پینے، ناشتہ وغیرہ کرنے آتا۔ آتے ہوئے بانس کی سیڑھی گلی کے کونے میں نالی کے ساتھ لٹا دیتا۔ جب ناشتہ کر کے واپس اپنی کوٹھڑی میں جاتا تو سیڑھی اٹھا کر کوٹھڑی میں دیوار کے ساتھ لگا دیتا۔

اس کٹڑی کے بالکل سامنے بھی ایک کٹڑی کا محرابی گیٹ تھا۔ اس کے اندر کوئی پرنٹنگ پریس ہوا کرتا تھا۔ مظفر احسانی صاحب نے یہاں سے مسلم لیگ کا اخبار ''منشور'' نکالا تھا۔ پھر وہ اس اخبار کا دفتر اسی بازار میں ایک ہوٹل کی دوسری منزل میں لے آئے تھے۔ انہوں نے مجھے اپنے

اخبار میں ملازم رکھ لیا اور میں نے کچھ مہینے یہاں کام بھی کیا۔

کبھی کبھی ہم ''زمیندار'' اخبار کے دفتر میں بھی جا نکلتے۔ اس اخبار کا آفس میکلوڈ روڈ کے آخر میں پولیس لائن کے پہلو میں ہوتا تھا۔ یہاں میں نے پہلی بار مولانا ظفر علی خان کو دیکھا۔ وہ کافی ضعیف ہو گئے تھے۔ یہاں حاجی لق لق، اشرف عطا صاحب سے بھی تعارف ہوا۔ بھائی جان کیپٹن ممتاز کی وجہ سے میری مولانا کے پوتے منصور علی سے دوستی ہو گئی تھی۔ اس اخبار میں میرا امرتسر کا ایک دوست ظہور الحسن ڈار بھی کام کرتا تھا۔ میں اس سے ملنے بھی یہاں آ جاتا تھا۔ مولانا اختر علی خان کو بھی میں نے پہلی مرتبہ اسی دفتر میں دیکھا۔ ان کا کمرہ دفتر میں داخل ہوں تو بائیں جانب ایک کمرے میں تھا۔

لاہور کی ایبٹ روڈ بھی ابھی خالی خالی تھی۔ وہاں صرف نشاط سینما اور کیپٹل سینما ہی پرانے تھے۔ رتن سینما اس کے ہندو مالک نے نیا نیا بنایا تھا۔ ابھی اس کی رسم افتتاح بھی نہیں ہوئی تھی کہ پاکستان بن گیا اور سینما کا ہندو مالک ہندوستان چلا گیا۔ کیپٹل سینما کے ساتھ ایک طرف ابن انشا کا الاٹ شدہ گھر تھا۔ دوسری طرف فلم ساز پنچولی کی کوٹھی تھی جو ابھی تک پاکستان میں ہی تھا۔ وہاں سے شملہ پہاڑی کی طرف دائیں جانب ایک پرانی وضع کی چھوٹے سے باغیچے والی کوٹھی تھی جو آج بھی موجود ہے۔ مگر آگے دکانیں بن جانے کی وجہ سے نظروں سے چھپ گئی ہے۔ اس کوٹھی کے آگے میدان تھا۔ جہاں اب ریڈیو پاکستان لاہور کی عمارت ہے۔ اس جگہ ایک بہت بڑے لان والی چھوٹی سی کوٹھی ہوا کرتی تھی جہاں کوئی میجر صاحب رہتے تھے۔ ان کے نام کی لکڑی کی ایک چھوٹی سی تختی لگی ہوئی تھی۔ مجھے ان کا نام یاد نہیں رہا۔ پھر یہاں فوجی بھرتی کا دفتر کھل گیا۔ ہم پرانے ریڈیو اسٹیشن کی طرف جاتے تو اس کوٹھی کے لان میں بھرتی ہونے والے رنگروٹوں کو دیکھتے کہ وہ قمیضیں اتارے قطار میں کھڑے ہیں اور ان کے سینے اور قد ناپے جا رہے ہیں۔ گوالمنڈی سے ہم دوست اٹھ کر کبھی پرانے ریڈیو اسٹیشن اور کبھی امروز اخبار کے دفتر میں آ جاتے۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں پاک ٹی ہاؤس ابھی ہمارا مستقل ٹھکانہ نہیں بنا تھا۔ یہ پاکستان کے بالکل شروع کا زمانہ تھا۔ امروز اخبار کا دفتر نشاط سینما کی بغل میں تھا۔ اصل میں یہاں کسی ہندو کا متروکہ پرنٹنگ پریس تھا۔ یہ لاہور کے ایک معرف صحافی کو الاٹ کر دیا گیا تھا جسے پرنٹنگ کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ پریس کے اندر اس زمانے کے حساب سے بڑی ماڈرن مشینری لگی ہوئی تھی۔ پریس بھی بہت بڑا

تھا۔ ساری مشینیں خالی پڑی تھیں اور ان پر گرد جم رہی تھی۔ اس پرنٹنگ پریس کے آگے ایک لمبا کمرہ تھا جس میں پارٹیشن ڈال کر ''امروز'' کا دفتر بنا دیا گیا تھا۔ پریس کے اندر داخل ہوں تو ڈیوڑھی کی بائیں جانب کسی ٹرانسپورٹ کمپنی کا دفتر تھا، اور دائیں جانب چق اٹھائیں تو امروز کے کاتب حضرات تخت پوشوں پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے کتابت کرتے نظر آتے۔ ٹرانسپورٹ کمپنی والوں کا ایک آدھ ٹرک باہر کھڑا رہتا اور مستری یا ڈرائیور لوگ بنچ پر بیٹھے سگریٹ چائے سے لطف اندوز ہو رہے ہوتے۔

''امروز'' کے دفتر میں ایک طرف کاتب بیٹھتے تھے۔ دو تین ڈبہ نما کمروں میں اسسٹنٹ ایڈیٹر اور بالکل سامنے ایک ڈبے میں مولانا چراغ حسن حسرت ایڈیٹر ''امروز'' بیٹھا کرتے تھے۔ بین الاقوامی سیاست پر سید کرمانی اداریہ لکھتے۔ حسرت صاحب زیادہ تر اپنا فکاہیہ کالم ''حرف و حکایت'' تحریر کرتے۔ میں کبھی کبھار ان کے نیاز حاصل کرنے چلا جاتا۔ وہ بڑی محبت اور شفقت کا اظہار کرتے۔ ابن انشا چونکہ سامنے رہتا تھا اس لیے اکثر وہاں آ جاتا۔ وہ حسرت صاحب کا شاگرد بھی تھا۔ عبدالشکور احسن ادارتی نوٹ وغیرہ لکھا کرتے۔ حمید اختر، عبداللہ ملک، ابراہیم جلیس، ابن انشا اور دوسرے ترقی پسند ادیبوں کا یہاں اکثر پھیرا رہتا۔ حمید اختر اور عبداللہ ملک تو امروز کے ادارے سے ہی وابستہ تھے۔ اس زمانے میں عبداللہ ملک بڑا خوش شکل نوجوان ہوتا تھا اور حمید اختر کا سر بھی بالوں سے بھرا ہوا تھا۔ مال روڈ پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے کرفیو لگنے والا ہے اور لوگ پہلے ہی اپنے اپنے گھروں میں چلے گئے ہیں۔ انگریزی اخبار ''سول ملٹری گزٹ'' اور اس کے پرنٹنگ پریس کی ایک منزلہ عمارت کافی کشادہ تھی۔ اس کا ایک لمبا برآمدہ تھا۔ جہاں ایک کمرے کے باہر پیتل کی تختی پر انگریزی میں کندہ تھا کہ ''یہاں انگریزی کے نامور ناول نویس بیٹھا کرتے تھے، ایک طرف برآمدے کے کونے میں چیف ایڈیٹر بیٹھتے تھے۔

پاکستان بننے کے کچھ ہی دنوں بعد اس اخبار کے دفتر میں ہی میری ملاقات صحافی جمیل الزماں سے ہوئی۔ سول ملٹری گزٹ کے پریس کا ایک گیٹ بیڈن روڈ کی گلی میں کھلتا تھا۔ یہاں لوہے کے جنگلے کے باہر دربان پہرے پر کھڑا رہتا۔ کافی ہاؤس کے ساتھ ایک سن لائٹ بلڈنگ تھی۔ اس کی ایک کشادہ دکان امرتسر کی مشہور خواجہ محمد صادق فیملی کو الاٹ ہو گئی۔ یہاں خواجہ صادق حسن جو بعد میں وزیر بھی رہے، بیٹھتے تھے۔ امرتسر میں ان کا قالینوں کا کاروبار تھا۔ ان کے جو

کاریگر امرتسر سے لٹ لٹا کر آئے وہ اکثر کافی ہاؤس کے سامنے والے باغیچے میں صبح سے شام تک بیٹھے رہتے۔ صرف اس امید پر کہ جب خواجہ صاحب قالینوں کا کارخانہ لگائیں گے تو انہیں کام مل جائے گا۔ خواجہ صادق حسن کی فیملی کو لاہور میں سیکرٹریٹ کے پاس جہاں لیگل ریمیبرنس کا دفتر ہے وہاں ایک عالیشان کوٹھی الاٹ ہوگئی تھی۔ یاد نہیں میں کس کے ساتھ اس کی کوٹھی میں ایک بار گیا تھا۔ یہ کسی ہندو تاجر کی متروکہ کوٹھی تھی جو قالینوں کا کاروبار کرتا تھا۔ اسے اپنا سارا مال کوٹھی میں ہی چھوڑ کر بھاگنا پڑا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اس کوٹھی کے دو کشادہ کمرے قالینوں سے بھرے پڑے تھے۔ اتنے قالین ایک جگہ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے اور میرے اندازے اور مشاہدے کے مطابق خواجہ فیملی کے پاس بھی امرتسر میں کبھی اتنے قالین نہیں ہوتے تھے۔ امرتسر میں ہال دروازے سے لے کر ہاتھی دروازے تک جو فصیل باقی تھی اس فصیل کے اندر چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ ایم اے او اسکول اسی فصیل کے سامنے تھا۔ میں آٹھویں جماعت میں وہاں پڑھتا تھا۔ بازار والے کمرے میں اپنی ڈیسک پر بیٹھے یہ کوٹھڑیاں نظر آتی تھیں۔ ان میں ہلکا ہلکا اندھیرا چھایا رہتا۔ دوسری طرف روشندان میں سے جو ہلکی روشنی آتی تھی اس میں یہاں قالین بنانے والے لکڑی کے خالی اڈے دکھائی دیتے جو خالی پڑے رہتے تھے۔ کہا جاتا تھا کہ یہ ویران دکانیں خواجہ صادق فیملی کی ہیں۔

جو کچھ بھی تھا خواجہ صادق حسن ایک دلکش شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا ایک لطیفہ بڑا مشہور تھا۔ ان دنوں ایک بار ان کا ایک امرتسری پرانا کاریگر ان سے ملنے سن لاٹ بلڈنگ والی میں آیا اور سلام کر کے کھڑا ہو گیا۔ خواجہ صاحب نے اس کی طرف دیکھ کر کہا:

"بھئی تم کون ہو؟"

کاریگر نے کہا:

"خواجہ صاحب آپ نے مجھے پہچانا نہیں، میں رحمت ہوں۔ امرتسر میں آپ کے کارخانے میں کام کرتا تھا۔"

خواجہ صاحب نے بڑے بھولپن سے کہا:

"اچھا تم رحمت ہو۔ اصل میں مجھے تمہارا نام تو یاد ہے۔ مگر شکل بھول گیا ہوں۔"

کافی ہاؤس نیا نیا آباد ہونا شروع ہوا تھا۔ اس کے سامنے کمرشل بلڈنگ کی ایک منزلہ

دکانوں کا سلسلہ تھا۔لوگوں نے نے یہ دکانیں الاٹ کروا کر اپنی اپنی پسند کا کاروبار شروع کر دیا تھا۔کونے پر ایذل جی کی وائین کی دکان تھی۔ذرا آگے ایک کھلونوں کی دکان تھی جس کے مالک کے پاس سعادت حسن منٹو آ کر بیٹھا کرتے تھے۔پھر ''لیڈیز کارنر'' جنرل مرچنٹ کی دکان تھی۔یہ سارے امرتسری تھے اور ادب کا بڑا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ان کے ہاں بھی ادیب اور شاعر آ کر بیٹھتے تھے۔آگے ہیلتھ ویز دوائیوں کی دکان نئی نئی کھلی تھی۔

ان دکانوں کے سامنے جو باغیچہ اب بے سروسامانی کی حالت میں ہے،ان دنوں بڑا سرسبز و شاداب ہوا کرتا تھا۔ٹولنٹن مارکیٹ پرانی مارکیٹ تھی اور وہاں عام طور پر لاہور کے کرسچین لوگ ہی آ کر اشیا خریدتے تھے۔ابھی لاہور کے لوگوں کو مارکیٹوں میں آ کر آٹا چاول اور سبزی خریدنے کی عادت نہیں پڑی تھی اور اجناس خوردنی دکانوں یا ریڑھیوں پر سے خرید لی جاتی تھیں۔پنجاب یونیورسٹی اور اورینٹل کالج کا ماحول بڑا پرسکون تھا۔طلبا کی تعداد بڑی مناسب تھی۔کہیں کہیں طالب علم لڑکے لڑکیاں چھوٹی چھوٹی ٹولیوں کی شکل میں باغیچوں میں بیٹھی نظر آتی تھیں۔یونیورسٹی اور گورنمنٹ کالج کی پرانی باوقار عمارتوں کے ٹھنڈے برآمدے اکثر خالی نظر آتے۔ہم پاک ٹی ہاؤس سے اٹھ کر محض علمی فضاؤں میں سانس لینے کی خاطر پنجاب یونیورسٹی یا گورنمنٹ کالج کے ماحول میں آ جاتے تھے اور برآمدوں میں ٹہلتے،لان میں بیٹھ کر باتیں کرتے یا کینٹین میں چائے پیتے۔

یونیورسٹی کے باہر مال روڈ کے فٹ پاتھ پر پروفیسر نکلسن کا بت ایک علمی علامت تھی۔یہاں کرشن نگر سے آرائے بازار جانے والی اکیلی بس آ کر رکتی تو اندر سے زیادہ تر طالب علم ہی باہر نکلتے۔بس اسٹینڈ پر بھی نہ ہونے کے برابر سواریاں کھڑی ہوتی تھیں۔

ٹولنٹن مارکیٹ کے عقب میں پنجاب پبلک لائبریری والی سڑک تھی۔آج اس سڑک پر بھی بے پناہ رش ہوتا ہے۔مگر ان دنوں یہ سڑک تقریباً سارا دن خالی پڑی رہتی۔کبھی اس سڑک پر سے کوئی تانگہ گزرتا اس کی آواز دیر تک سنائی دیتی رہتی۔پنجاب پبلک لائبریری کا ماحول بے حد پرسکون ہوتا تھا۔وہاں بیٹھ کر مطالعہ کرتے ہوئے باہر سے کوئی آواز نہیں آتی تھی۔اب وہاں پر ہر وقت اسکوٹروں،رکشوں اور ویگنوں کا شور بپا رہتا ہے۔میں کبھی کبھی ٹولنٹن مارکیٹ میں بے مقصد گھومنے نکل جاتا تھا۔اس مارکیٹ میں سبزیوں،گوشت اور پھلوں کی ملی جلی خوشبو ہر وقت پھیلی رہتی

جس سے مجھے رنگون، کولمبو اور سنگاپور کی مارکیٹیں یاد آجاتی تھیں۔ کچھ مدت بعد اس مارکیٹ کے مال روڈ والے کونے میں ایک چھوٹی سی کافی شاپ کھلی جس میں پہلی بار ایئر کنڈیشنڈ لگایا گیا۔ گرمیوں میں یہاں آئس کریم ملتی اور سردیوں میں کریم کافی۔ کافی ہاؤس کی جلی ہوئی کافی کے مقابلے میں مجھے اس کافی شاپ کی کافی بہت پسند تھی اگرچہ یہ مہنگی تھی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے کافی ہاؤس میں کافی کی ایک پیالی کے تین یا چار پانچ آنے لیے جاتے تھے جبکہ اس کافی شاپ میں ان دنوں میں کافی کی ایک پیالی کا ایک روپیہ چارج کیا جاتا تھا۔ لیکن اس کافی کے ساتھ ڈھیر ساری کریم بھی ملتی تھی۔ میں شروع ہی سے کافی میں کریم ملا کر پینے کا عادی تھا۔ اس لیے سردیوں میں اپنے کسی دوست یا کسی دوست لڑکی کے ساتھ ٹولنٹن مارکیٹ والی اس کافی شاپ میں کافی پینے ضرور آجاتا تھا۔

انارکلی میں بھی انتشار نہیں ہوتا تھا۔ لوگوں کو نئی نئی دکانیں الاٹ ہوئی تھیں اور انہوں نے کاروبار کا آغاز کیا ہی تھا۔ ایک روڈ کے سامنے انارکلی میں بیلی رام کی ادویات کی دکان پر ابھی بیلی رام خود بیٹھتا تھا۔ میں نے اسے دیکھا ہے۔ وہ بھاری بدن کا آدمی تھا۔ سر کے بال خشخشی تھے۔ بھلہ شوز کی جگہ کرنال بوٹ ہاؤس کھل گیا تھا۔ بخشی مارکیٹ بھی ابھی غیر آباد سی تھی۔ یہاں ایک کھلونوں کی دکان ہمارے ایک امرتسری دوست کو الاٹ ہوئی تو ہم کبھی کبھار وہاں جا کر بیٹھا کرتے۔ یہاں ہمارا ایک مشترکہ امرتسری نوجوان دوست بھی آیا کرتا تھا۔ وہ سگریٹ پیتا تھا مگر بڑا پھڑ باز تھا۔ اکثر کہتا کہ میں نے انگریزوں کے ساتھ آسام کے علاقے میں کام کیا اور دن میں ایک ایک سیر اعلیٰ ولایتی تمباکو پائپ میں ڈال کر پی جاتا تھا۔ ایک بار ہمارے ایک ساتھی نے اسے کہا کہ تمہاری باتوں کا ہمیں اعتبار نہیں ہے۔ تم ہمیں پائپ پی کر دکھاؤ۔ پھڑ باز دوست میں جان نہیں تھی۔ بڑا دبلا پتلا لڑکا تھا۔ ناک طوطے کی چونچ کی طرح تھی۔ کہنے لگا:

"ابھی دکھاتا ہوں۔ پائپ منگواؤ مگر تمباکو ولایتی ہونا چاہیے۔"

کونے والی دکان میں ایک ڈاکٹر کالڑ کا پائپ پیا کرتا تھا۔ اس کے ہاں سے پائپ اور تمباکو اسی وقت منگوایا گیا۔ ابھی تمباکو ولایتی ہی ملتے تھے۔ یہ تھری اسکویرز تمباکو تھا جو زیادہ اسٹرانگ نہیں ہوتا تھا۔ ہمارے پھڑ باز دوست نے پائپ میں تمباکو بھرا، منہ میں لگایا ماچس جلا کر اسے سلگایا اور ہم پر رعب ڈالنے کے لیے اوپر نیچے چھ سات لمبے لمبے کش کھینچے۔ پھر فوراً ہی پائپ کو منہ سے الگ

کیا۔ آنکھیں اوپر کو چڑھ گئیں اور وہ دھڑ کر کے دکان کے فرش پر گر گیا۔

انارکلی کے نیلا گنبد والے کونے میں عطریات کی جو روایتی دکان تھی وہاں سے گزرتے ہوئے قسم قسم کے دیسی عطریات کی مہک آتی تھیں۔ اب ان خالص دیسی عطریات کی مہک نیلے گنبد کے شور اور گرد و غبار میں دب گئی ہے۔ انارکلی کے آخر میں ایک روڈ پر بادشاہ قطب الدین ایبک کا مزار زبوں حالی کی عبرت ناک داستان سنا رہا تھا۔ اس کے ایک پہلو میں واقعی اوپر والے مکان کا پرنالہ گرتا تھا۔ سامنے ویران چھوٹا سا میدان تھا جہاں گندگی کے ڈھیر پڑے رہتے تھے۔ یہاں سے ایک گلی لوہاری کی طرف نکلتی ہے۔ اس گلی میں ابھی ایک بھی دکان نہیں کھلی تھی۔ صرف مکان ہی تھے۔ یا پھر ایک پرنٹنگ پریس تھا۔ اس پریس میں ہمارے محلے کے ایک بزرگ گارڈ ملازم ہو گئے تھے۔ ان کا چھوٹا بیٹا سردار امرتسر میں فسادات شروع ہوئے تو جموں چلا گیا تھا۔ خدا جانے وہ امرتسر چھوڑ کر جموں کیوں چلا گیا۔ پاکستان بن گیا مگر سردار واپس نہ آیا۔ سردار ہماری گلی کا لڑکا تھا اور ہم ایک دوسرے کے اچھے واقف کار تھے۔ اس کا بڑا بھائی نیاز میرا دوست تھا۔ سردار کا باپ ہر وقت اپنے بیٹے کے غم میں گھلتا رہتا۔ کچھ عرصے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ مگر جس زمانے کی میں بات کر رہا ہوں ابھی یہ گارڈ صاحب زندہ تھے۔ میں ایک بار اس سے ملنے گیا تو انہوں نے ہم سب گھر والوں کی خیر خیریت پوچھی۔ پھر آہ بھر کر بولے:

''میرا سردار ابھی تک نہیں آیا شاید اگلے ہفتے آ جائے۔''

سب کو معلوم تھا کہ سردار کو وہاں غیر مسلموں نے شہید کر دیا ہے۔ مگر انہیں کوئی نہیں بتاتا تھا۔ انہیں بتا بھی دیا جاتا تو شاید وہ کبھی یقین نہ کرتے۔ زندگی کے آخری سانس تک انہیں یقین تھا کہ ان کا بیٹا جموں سے ضرور واپس آ جائے گا۔

لوہاری دروازے کے باہر ابھی مسلم مسجد نہیں بنی تھی۔ یہاں ٹوٹی پھوٹی دکانیں ہوتی تھیں۔ ایک روڈ پر ہی احسان دانش کا مکان تھا جس کے نیچے مکتبہ کاروان ادب کا دفتر ہوا کرتا تھا۔ لوہاری دروازے کے سامنے انارکلی کے شروع میں بھنگ کی ایک دکان ہوا کرتی تھی۔ ایک تنگ سا راستہ دکان کے اندر جاتا تھا۔ اس دکان میں لوگ بنچوں پر بیٹھ کر بھنگ کے گلاس پیتے تھے۔ باہر افیون کا ٹھیکہ تھا۔ افیون کا ایک ٹھیکہ انارکلی میں بھی تھا۔ جب بھٹو کے زمانے میں منشیات پر پوری پابندی لگا دی گئی تو افیون کے ٹھیکے بھی بند ہو گئے۔ میں نے کئی بوڑھوں کو ان ٹھیکوں کے باہر سوکھے منہ لٹکائے

اس انتظار میں بیٹھے دیکھا کہ شاید دکان کھل جائے اور وہ دو چھ آنے کی افیون خرید کر اپنا نشہ پورا کر لیں۔ مگر افیون کے ٹھیکے پھر نہ کھلے اور یہ نشئی ایک ایک کر کے دم توڑتے گئے۔

میں واپس گوالمنڈی میں آتا ہوں۔ گوالمنڈی کی بھی کئی دکانیں ابھی بند پڑی تھیں۔ ہندو سکھوں کو گئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا لوگوں کے گھروں میں ہندو سکھوں کے تانبے پیتل کے برتن ابھی تک گردش کرتے تھے۔ گوالمنڈی تھانے کے سامنے ایک چوبارے کی کھڑکی میں ایک عمر رسیدہ موٹی ہندو عورت ابھی تک بیٹھی تھی۔ وہ کسی وقت بلند آواز میں پکارتی:

"میں لاہور سے نہیں جاؤں گی۔ لوگ کہتے ہیں ہمیں قتل کر دیں گے۔ میں نہیں جاؤں گی۔ میں اپنا گھر نہیں چھوڑوں گی۔"

یہ میں کوئی افسانہ بیان نہیں کر رہا۔ یقین کریں کہ میں نے تھانے کے باہر کھڑے ہو کر اس ہندو عورت کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ لوگ اسے پاگل کہتے تھے۔ مگر اسے کبھی کسی نے کچھ نہیں کہا تھا۔ اگر ایسی کوئی مسلمان عورت امرتسر یا جالندھر میں پیچھے رہ جاتی تو اسے ضرور قتل کر دیا جاتا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ عورت غائب ہو گئی۔

گوالمنڈی کا ذکر دوبارہ شروع کرنے سے پہلے میں سیکرٹریٹ کے پیچھے ہندوؤں کے ڈی اے وی کالج ہوسٹل کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔ اس لیے کہ یہ مجھے اس وقت یاد آ گیا اور اس خیال سے کہ کہیں بھول نہ جاؤں۔ میں اسے قلمبند کر دینا چاہتا ہوں۔ لوئر مال پر سیکرٹریٹ اور پوسٹ ماسٹر جنرل لاہور کے دفاتر کے پیچھے آج آپ جائیں تو آبادی کی کثرت، ٹریفک کا شور اور نئی موٹر کاروں اور اسکوٹروں کی کثرت اور آمد و رفت کو دیکھ کر آپ کو یقین نہیں آئے گا کہ قیام پاکستان کے وقت لاہور کا یہ علاقہ سنسان پڑا تھا۔ خاص طور پر ڈی اے وی کالج کے سامنے والی سڑک اور گلیاں تو قبرستان کا منظر پیش کرتی تھیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ڈی اے وی کالج ہوسٹل کو رفیوجی کیمپ بنا دیا گیا تھا۔ یہاں کرشن نگر، سنت نگر کے علاقے کے وہ ہندو آ کر پناہ گزیں ہو گئے تھے جو لاہور سے نکل نہ سکے تھے۔ ہوسٹل کا آہنی گیٹ بند رہتا اور باہر گورکھا فوجی پہرہ دے رہے ہوتے۔ آس پاس کے سارے ہندوؤں کے مکان ابھی خالی تھے اور کسی مہاجر کو الاٹ نہیں ہوئے تھے۔ ایک بار میں لاہور کی آوارہ گردی کرتا لوئر مال کی طرف سے ڈی اے وی کالج کے دروازے کی طرف بڑھا۔ دائیں بائیں مکان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ گیٹ کے باہر گورکھا سپاہی

رائفل لیے پہرہ دے رہا تھا۔ میں اس کے قریب گیا تو ہوسٹل کے باغیچے میں کچھ ہندو عورتیں اپنے سامان کے پاس بیٹھی پنکھا جل رہی تھیں۔ گورکھا سپاہی نے دور ہی سے مجھے اشارہ کیا کہ واپس جاؤ۔ آگے مت آنا۔ میں وہیں سے واپس مڑ گیا۔

آج میں جب کبھی اس گلی سے گزرتا ہوں تو گاڑیوں کا رش دیکھ کر اندازہ نہیں لگا سکتا کہ ۱۹۴۷ء۔۴۸ میں یہاں ہو کا عالم ہوا کرتا تھا۔ اسی ڈی اے وی کالج ہوسٹل سے ۲۰ اگست ۱۹۴۷ء کو ایک چھوٹی مائیکرو بس ہندو شرنارتھیوں سے بھر کر ریلوے اسٹیشن کی طرف بھیجی گئی تاکہ شرنارتھی کسی ٹرین میں سوار ہو کر انڈیا جا سکیں۔ ایک عینی شاہد نے مجھے بتایا کہ جب وہ مائیکرو بس ریلوے اسٹیشن کے احاطے میں پہنچی تو اس پر لوگوں نے حملہ کر دیا۔ اس سے تھوڑی دیر پہلے فیروز پور کی طرف سے مسلمانوں کی ایک کٹی ہوئی ٹرین آئی تھی اور لوگوں کے جذبات بے حد مشتعل تھے۔ ہندوؤں کی بس میں عورتیں اور بچے بھی سوار تھے۔ ڈرائیور نے ابھی بس روکی ہی تھی کہ اس پر حملہ ہو گیا۔ لوگوں کے پاس سوائے ڈنڈوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ بس کے شیشے چڑھے ہوئے تھے۔ دو چار کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ گئے۔ ہندو ڈرائیور نے بے حد ہوش مندی کا مظاہر کرتے ہوئے ایکسلیٹر دبایا اور رکتی ہوئی بس کو فل اسپیڈ دے کر وہاں سے بھگا کر لے گیا۔

ویسے لاہور میں ہندوؤں سکھوں پر وہ ظلم نہیں ہوا تھا جو انہوں نے مشرقی پنجاب میں مسلمانوں پر کیا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مسلمان کبھی کسی نہتے پر ہاتھ نہیں اٹھاتا۔ اگر کہیں کچھ وارداتیں ہوئی بھی تھیں تو وہ اشتعال کا نتیجہ تھیں۔ علامہ اقبال نے بالکل صحیح فرمایا ہے:

مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دل نوازی کا
مروت حسن عالمگیر ہے مردان غازی کا

گوالمنڈی تھانے کے سامنے والی ہندو عورت کی مثال میرے سامنے ہے۔ وہ کئی روز تک اپنے مکان میں بیٹھی واویلا کرتی رہی تھی۔ مگر کسی نے نہ تو اس کا مکان لوٹا اور نہ اسے قتل کیا تھا۔ جبکہ مشرقی پنجاب میں غیر مسلموں نے عورتوں کی گودیوں سے دودھ پیتے بچوں کو چھین کر ہوا میں اچھالا اور نیزوں پر پرو دیا تھا۔ ان کی درندگی کے واقعات بیان کرتے وقت تک قلم بھی کانپ اٹھتا ہے۔

گوالمنڈی میں میو ہسپتال کی طرف جاتے ہوئے ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا جہاں سبز چائے

خاص طور پر بنائی جاتی تھی۔ ہم گوالمنڈی کے دوست وہاں بیٹھ کر سبز کشمیری چائے پیتے تھے۔ میرے دوستوں میں نذیر میراثی، حکیم صاحب، شاعر احمد مشتاق، ضبط قریشی، ساغر صدیقی اور شفیع پان والا شامل تھے۔ نذیر میراثی کے سراپا میں زنانہ پن کی جھلک تھی۔ وہ بڑا شرما شرما کر باتیں کرنے کا عادی تھا، اور دوست اکثر اسے چھیڑتے۔ مگر وہ کسی کی بات کا برا نہ مانتا تھا۔ وہ گاتا بڑا اچھا تھا۔ بڑا سریلا تھا۔ گاتے ہوئے پرانی طوائفوں کی طرح نرت بھاؤ بھی کرتا جس سے محفل کا مزہ دگنا ہو جاتا۔ حکیم صاحب بھی گاتے تھے مگر ان کی آواز بہت زیادہ بھاری بھرکم تھی۔ جب وہ ہوٹل کے اندر والے کمرے میں گا رہے ہوتے تو کئی بار ایسا ہوتا کہ باہر سے لوگ آ کر ہوٹل کے مالک سے پوچھتے:

''اندر کوئی سانڈ ذبح ہو رہا ہے۔''

ایک بار حکیم صاحب نے پنکج ملک کے گانے کی نقل اتاری تو مجھے برا لگا۔ کیونکہ میں نیو تھیٹر کے اس موسیقار کا بڑا مداح تھا۔ ہمارے ساتھ پنجاب کے کچھ شاعر بھی وہاں بیٹھا کرتے تھے جن میں معراج دین اختر سب سے نمایاں تھا۔ اختر ان پڑھ شاعر تھا مگر بڑے کمال کے پنجابی شعر کہتا۔ وہ اپنے شعر مجھ سے لکھوا کر اپنے پاس جمع کر لیا کرتا تھا۔ ایک بار اس نے ہمیں بابر کی ایک جنگ کے بارے میں اپنی نظم سنائی۔ یہ بڑے کمال کی نظم تھی۔ اس ان پڑھ شاعر نے ایسے زبردست اور گھن گرج والے الفاظ کے ساتھ میدان جنگ کا نقشہ کھینچا تھا کہ ہمیں تلواروں کے ٹکرانے اور زخمیوں کے کراہنے، ہاتھیوں کے چنگھاڑنے اور طبل جنگ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

معراج الدین اختر نے اس زمانے کے سیاسی لیڈروں پر بھی ایک طویل طنزیہ نظم لکھی تھی جس کے مجھے صرف دو تین مصرعے ہی یاد رہے ہیں۔ وہ کہتا ہے:

اسیں زور لا کے بازی جتنے آں
لیڈر کرسی تے بیٹھ کے ہار دیندا
اختر لاٹو سمجھیا اے ایناں لیڈراں نے؟
جہڑا اٹھ دا اے جالی مار دیندا

اختر کی ساری زندگی رزق حلال کی کمائی اور فاقہ مستی میں کٹی۔ وہ خوددار تھا اور کسی کے آگے کبھی اس نے ہاتھ نہیں پھیلایا تھا۔ اپنے بچوں کا پیٹ حلال کی کمائی سے بھرنے کے لیے وہ طرح

طرح کے کام کیا کرتا۔ایک بار اس نے قوالی کرنا شروع کر دی۔ پھر دہی بھلے لگا لیے۔ایک دفعہ میں دہلی دروازے کی طرف جا رہا تھا تو میں نے اختر کو دیکھا کہ بانس کے چھابے پر کھدر کی صدریاں ڈالے بیچ رہا ہے۔کبھی کبھی وہ ہم امرتسری دوستوں سے ملنے پاک ٹی ہاؤس بھی آ جاتا تھا۔زندگی کی چکی میں وہ اناج کی طرح پس رہا تھا اور آخر ایک دن ہم نے سنا کہ معراج دین اختر کا انتقال ہو گیا۔

گوالمنڈی کے سبز چائے والے ہوٹل میں رات گئے تک ہماری محفلیں جاری رہا کرتی تھیں۔اب وہاں میرے دوستوں میں کہانی نویس نواز اور حسن طارق بھی شامل ہو گئے تھے۔ شاعر ساغر صدیقی اسی ہوٹل کے اوپر ایک کمرے میں رہتا تھا۔ابھی اس نے پوری طرح اپنے آپ کو درویشی میں نہیں رچایا تھا۔ابھی وہ عام شہریوں کی طرح کپڑے پہنتا۔یعنی کبھی پتلون قمیص اور کبھی شیروانی پاجامہ۔اس کے بالوں میں بھی باقاعدہ کنگھی پھری ہوتی تھی۔ چرس وہ ضرور پیتا تھا۔مگر یہ نشہ وہ اپنے پیسوں سے پورا کرتا تھا۔ایک دن وہ کہنے لگا:

''امرتسر والی اپنی بیٹھک مجھے بہت یاد آتی ہے۔''

اس وقت وہ اپنی خاص کیفیت میں تھا۔ساغر صدیقی امرتسر میں پیدا نہیں ہوا تھا۔مگر اس کے والد صاحب کا کاروبار امرتسر میں تھا۔ان کی دکان بھی ہمارے محلے میں ہی تھی۔ چنانچہ ساغر صدیقی سے ہماری دوستی امرتسر کی تھی۔

گوالمنڈی چوک کے دو آمنے سامنے والے ہوٹلوں یا ریستورانوں کی آپس میں دوستانہ لاگت بازی چلتی رہتی تھی۔اس زمانے میں ہوٹلوں میں ریکارڈنگ عام ہوتی تھی۔ریکارڈ پلیئروں پر عام طور پر فلمی گیت بجائے جاتے تھے۔ابھی لاہور میں انڈین فلموں کی نمائش جاری تھی۔آوارہ فلم کا گانا ''گھر آیا میرا پردیسی'' لوگوں میں بڑا مقبول تھا۔مگر ابھی اس گانے کے ریکارڈ مارکیٹ میں نہیں آئے تھے۔مگر ریڈیو پاکستان لاہور سے یہ ریکارڈ اکثر بجائے جاتے تھے۔ایک ہوٹل کے مالک نے کسی نہ کسی طرح اس گانے کا ریکارڈ حاصل کر لیا اور بڑی اونچی آواز میں سارا دن بجاتا رہتا۔سامنے والے ہوٹل کے مالک نے بھی دوڑ دھوپ شروع کر دی۔وہی گانا اس نے بھی کہیں نہ کہیں سے منگوا لیا اور اپنے ریکارڈ پلیئر پر اونچی آواز میں لگا دیا۔صورت حال یہ تھی کہ دونوں ہوٹلوں کے اسپیکروں پر ایک ہی گانا بج رہا تھا اور وہ بھی اونچی آواز میں۔ایک ہوٹل والا آواز اونچی

کرتا اور دوسرے ہوٹل والا بھی اسپیکر کی آواز تھوڑی بلند کر دیتا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کے محلے کے لوگ جمع ہو گئے۔ سب نے اپنے کانوں میں انگلیاں دے رکھی تھیں اور چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے "بند کرو اے بک بک" بڑی مشکل سے محلے والوں کو گھر آیا میر اپردیسی کے شور سے نجات ملی۔

گوالمنڈی کے ہوٹلوں میں ہر ٹائپ کے لوگ آ بیٹھتے تھے۔ ہمارے ساتھ ہمارے ایک امرتسری یار کا چھوٹا بھائی بیٹھا کرتا جسے بدمعاش بننے کا بڑا شوق تھا۔ اس کے پاس ایک کمانی دار چاقو تھا جیسے بڑے بدمعاش اپنے پاس رکھتے تھے۔ یہ چاقو کڑ کڑ کی آواز کے ساتھ کھلتا تھا۔ یہ لڑکا ہوٹل میں بیٹھ کر اسے بڑی شان سے کھولتا اور اتنے بڑے چاقو سے اپنے چھوٹے چھوٹے ناخن کاٹنے لگتا۔ مطلب یہ کہ وہ لوگوں پر رعب ڈالنا چاہتا تھا کہ میں بھی بدمعاش ہوں۔ اس نے ایک اپنا پٹھہ بھی پال رکھا تھا۔ ایک روز اپنے پٹھے کی کوئی بات غور سے سنتے ہوئے کمانی دار چاقو سے میز کو کرچ رہا تھا کہ اچانک چاقو بند کر کے بولا:

"تم نے تو اسے ہاتھ کاٹ کر دے دیے۔ اس عدالت میں تم کیا جواب دو گے؟"

اس نے فوجداری مقدمات کی چھوٹی چھوٹی دفعات بھی ازبر کر رکھی تھی، اور چھوٹے چھوٹے بدمعاشوں کو قانونی مشورے بھی دیتا تھا۔ اس بات کو ایک جگ بیت گیا۔ اس زمانے کا لاہور بہت بدل گیا ہے۔ اتنا بدل گیا ہے کہ بعض جگہیں، بعض صورتیں پہچانی نہیں جاتیں۔ گوالمنڈی بھی بدل گیا ہے۔ کبھی اس چوک میں اتنا رش نہیں دیکھا تھا جو اب وہاں ہوتا ہے۔ ہمارے ساتھ کے اکثر دوست یا بچھڑ کر لندن امریکہ چلے گئے یا اللہ کو پیارے ہو گئے۔ کبھی سال میں ایک بار ادھر جانے کا اتفاق ہوتا ہے تو پرانے دوست آج بھی اس گرمجوشی اور محبت سے ملتے ہیں۔ ان کی محبت اور خلوص دیکھ کر میرے دل میں یہ خیال بار بار پیدا ہوتا ہے کہ لاہور باہر سے چاہے کتنا بدل جائے مگر اس کا اندر نہیں بدل سکتا۔ اس کے لوگوں میں جو گداز، دوستی اور پیار نبھانے کا جذبہ ہے وہ کبھی نہیں بدل سکتا۔



لاہور کا پرانا ریڈیو پاکستان

آج کی نئی نسل نے شاید ہی لاہور کا پرانا ریڈیو اسٹیشن دیکھا ہو۔ وہ صرف ایمپریس روڈ والے نئے ریڈیو اسٹیشن کی عمارت سے ہی واقف ہے۔ پرانا ریڈیو اسٹیشن شملہ پہاڑی سے جو سڑک گورنر ہاؤس کے ذیلی دروازے کو جاتی ہے وہاں پر ہوا کرتا تھا۔ یہ ایک پرانی کوٹھی میں بنایا گیا تھا اور قیام پاکستان کے پہلے بھی اس جگہ سے پروگرام نشر ہوا کرتے تھے۔

قیام پاکستان سے پہلے میں دو تین بار یہاں آیا تھا۔ یہاں میں نے میوزک کمپوزر جیون لال مٹو کو دیکھا۔ اختری بائی فیض آبادی کو دیکھا۔ بس قیام پاکستان سے پہلے کے ریڈیو اسٹیشن کے صرف یہی دو چہرے مجھے یاد ہیں۔ جیون لال مٹو کشمیری نژاد گورے چٹے دہرے بدن کے تھے۔ ان کی بیگم مادھوری لال مٹو بھی کلاسیکل گاتی ہیں اور بڑی سریلی آواز ہے ان کی۔ اس کے بعد میری یادوں کی اسکرین پر دھند آجاتی ہے اور یہ دھند قیام پاکستان کے بعد کے ریڈیو اسٹیشن کے ساتھ پوری طرح سے چھٹ جاتی ہے۔ قیام پاکستان کے ساتھ ہی لاہور ریڈیو اسٹیشن پر میرا اس لیے بھی آنا جانا زیادہ ہو گیا تھا کہ میں نے کہانیاں ناول لکھنے شروع کر دیے تھے اور ریڈیو کے لیے فیچر بھی لکھنے لگا تھا۔ کبھی گیتوں بھری کہانی لکھتا۔ کبھی کوئی تقریر لکھ دیتا، کبھی ڈرامہ وغیرہ۔ میرے کچھ دوست بھی ریڈیو اسٹیشن پر تھے جن میں شاد امرتسری، اکرم بٹ، رضی ترمذی، سلیم شاہد، اخلاق احمد دہلوی کے نام نمایاں ہیں۔

ریڈیو پاکستان لاہور کی پرانی عمارت کا زمانہ بڑا بارونق اور تخلیقی زمانہ تھا۔ اردو ادب کے بڑے معتبر اور نامور ادیب شاعر ریڈیو کے لیے لکھتے تھے، مثلاً سید امتیاز علی تاج، سید عابد علی عابد، رفیع پیر، حفیظ جالندھری، حفیظ ہوشیارپوری، تاجور نجیب آبادی اور کئی دوسرے مشہور لوگ۔ فنکاروں میں ایک سے ایک بڑھ کر تھا۔ موہنی حمید عرف آپا شمیم کی آواز پہلی بار اسی پرانے ریڈیو اسٹیشن سے سنائی دی تھی۔ آفتاب احمد، محمد حسین، عقیل احمد، میرا جی کے چھوٹے بھائی کامی، سلیم طاہر، ایس ایم سلیم، یاسمین طاہر، سلطان کھوسٹ، مرزا سلطان بیگ اور عبداللطیف مسافر اس

ریڈیو اسٹیشن کی پہچان تھے۔ اناؤنسروں میں مصطفیٰ علی ہمدانی، اخلاق احمد دہلوی اور عزیز الرحمٰن کی آوازیں آج بھی لوگوں کو یاد ہیں۔ عزیز الرحمٰن کی آواز اور لہجہ تو ریڈیو پاکستان کا سرمایہ تھا۔ اس زمانے میں یہ سب لوگ زندگی کی حرارت اور صلاحیتوں سے بھرپور تھے۔ اس ریڈیو اسٹیشن کے دو گیٹ تھے۔ ایک گیٹ کا آہنی دروازہ ہمیشہ بند رہتا تھا جس کے باہر بشیر نامی ایک نوجوان نے پان کی چھابڑی لگائی ہوئی ہوتی تھی۔ بشیر ریڈیو اسٹیشن کے ایک ایک شخص کے نام سے واقف تھا۔ دوسرے گیٹ میں سے لوگ آتے جاتے تھے۔ اس گیٹ کا دربان شیر محمد تھا۔ آرٹسٹ اور فنکار تانگوں پر ہی آتے تھے۔ گاڑی جہاں تک مجھے یاد ہے صرف اسٹیشن ڈائریکٹر کی ہی ہوا کرتی تھی۔ جو پورچ میں آ کر خاموشی سے کھڑی ہو جاتی۔ سامنے والی سڑک سارا دن سنسان سی رہتی۔ ایک تو ابھی لاہور میں ٹریفک کا شور اور افراتفری نہیں مچی تھی۔ دوسرے یہ چھوٹی سی سڑک آگے جا کر گورنر ہاؤس کے گیٹ پر ختم ہو جاتی تھی۔

گانے والوں اور گانے والیوں میں پاکستان کے نامور ترین فنکار شامل تھے۔ استاد برکت علی خاں، خان صاحب مبارک علی خاں، بڑے غلام علی خاں، چھوٹے غلام علی خاں، سلامت علی، نزاکت علی خاں، طلبہ نواز فلو سے خاں، سارنگی نواز استاد نبی بخش خاں، شریف غزنوی، روشن آرا بیگم، وحیدہ خانم، فریدہ، ثریا ملتانیکر، امید علی خاں، دلی والے سردار خان بھائی لعل، شہناز اور نہ جانے کتنے ہی مایہ ناز گلوکار اور گلوکارائیں تھیں جو پروگرام کرتیں۔ قوالوں میں جالندھر والے مبارک علی خاں، فتح علی خان کا ڈنکا بج رہا تھا۔ استاد سنتو خان کے بھی عروج کا زمانہ تھا۔ آغا بشیر احمد قوال اور رشید احمد فریدی قوال کا بھی کوئی جوڑ نہیں تھا۔ یہ لوگ اپنے اپنے انداز کے بہترین قوال تھے۔

میوزک کمپوزروں میں نیاز حسین شامی، طفیل فاروقی اور صادق علی مانڈو کے نام نمایاں تھے۔ سلطان کھوسٹ نے اس زمانے میں ہمارے پنجاب ادب کو پرانے ریڈیو اسٹیشن کی وساطت سے پنجابی کے ہمیشہ زندہ رہنے والے گیت دیے جن میں یہ گیت آج بھی سب کو یاد ہوگا:

چہ غہ گل کر دو

یہ بڑا تخلیقی دور تھا۔ پرانے ریڈیو اسٹیشن سے زندہ پروگرام ہوتے تھے۔ ابھی ریکارڈنگ کا زمانہ شروع نہیں ہوا تھا۔ ڈرامے میں صوتی اثرات دینے والوں میں قدیر ملک اور الطاف الرحمٰن کا

کوئی ثانی نہیں تھا۔ یہ دونوں اپنے اپنے فن کے درجہ کمال تک پہنچے ہوئے تھے۔ سازندوں میں مجھے صادق علی مانڈو کلارنٹ نواز، نبی بخش سارنگی نواز، کالے خاں ستار نواز، بابو خاں بانسری نواز اور شوکت حسین طبلہ نواز کے نام اور شکلیں یاد رہ گئی ہیں۔ ریڈیو کی کینٹین کوٹھی کے گیراج میں بنا دی گئی تھی۔ گیراج کے اندر باہر کرسیاں لگی تھیں۔ بنچ بھی لگے ہوتے تھے جہاں بیٹھ کر آرٹسٹ اور ادیب شاعر لوگ چائے پیتے، باتیں کرتے، جگت بازی بھی ہوتی اور قہقہے بھی گونجتے تھے۔ یہ میرا بھی شروع شروع کا زمانہ تھا۔ میں نے لکھنا شروع ہی کیا تھا مگر اپنے رومانوی اسلوب کی وجہ سے پہلے ہی افسانے سے مقبول ہو گیا تھا۔ لوگ مجھ سے بڑا پیار کرنے لگے تھے۔ آج مقبول گلوکار غلام علی ابھی استاد برکت علی خاں کی بیٹھک پر اپنے استاد کی خدمت کر رہا تھا اور مشہور گلوکار مہدی حسن کے نام سے بھی ابھی کوئی واقف نہیں تھا۔ فیض فرید سرور نواز بھی ہوا کرتے تھے۔ بڑے کم گو، شریف اور مرنجاں مرنج تھے۔

پرانے ریڈیو اسٹیشن کی ایک روایت تھی کہ موسم بہار میں اس کے لان میں میوزک کانفرنس منعقد ہوتی۔ یہ دو دن جاری رہتی اور اس کی بڑی دھوم مچتی تھی۔ ٹکٹ لگانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اعزازی پاس جاری ہوتے تھے جس کے حصول کے لیے لوگ بڑی بڑی سفارشیں ڈالتے تھے۔ اس میوزک کانفرنس میں ملک کے بڑے نامور گلوکار اور گلوکارائیں شرکت کرتیں۔ ایک رات ہلکی پھلکی موسیقی کے پروگرام پیش کیے جاتے اور دوسری رات کلاسیکل موسیقی کی محفل جمتی۔ ریڈیو اسٹیشن کے لان میں اسٹیج لگتی۔ روشنیاں لگائی جاتیں صوفے اور کرسیاں بچھا دی جاتیں۔ لان چھوٹا تھا۔ چنانچہ جب محفل موسیقی شروع ہوتی تو لوگ سڑک پر کھڑے ہوتے۔ درختوں پر بھی چڑھے ہوتے اور دیواروں پر بھی بیٹھے ہوتے۔ میں بھی اپنے دوستوں کے ساتھ اس محفل موسیقی میں بڑے شوق سے شرکت کرتا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ لوگوں کا ہجوم اتنا زیادہ بڑھ گیا کہ نقص امن کا خطرہ لاحق ہو گیا۔ چنانچہ پولیس نے ہلکا سا لاٹھی چارج بھی کیا اور شائقین کو دھکیل کر سڑک کے سرے پر کر دیا۔ کسی کو پاس دکھائے بغیر جانے کی اجازت نہ تھی۔ اس رات کو پاس والوں کو بھی اندر نہیں جانے دیا جاتا تھا کیونکہ رش بہت بڑھ گیا تھا۔ میں اپنے دوست کے ساتھ ذرا لیٹ یعنی رات کے دس بجے کے قریب پہنچا تو ہمیں شملہ پہاڑی کے پاس ریڈیو اسٹیشن کو جاتی سڑک پر ہی پولیس نے روک لیا۔ میں نے پاس دکھایا مگر ہمیں پھر بھی آگے جانے کی اجازت نہ دی گئی عذر یہ

پیش کیا گیا کہ لان میں تل دھرنے کی بھی جگہ نہیں ہے۔

ہم بھی ایڈونچرس تھے۔ میں نے اپنے دوست سے کہا، ''میرے ساتھ آؤ۔ ہم ایک اور ترکیب آزماتے ہیں۔''

ریڈیو اسٹیشن کی کینٹین والی دیوار دوسری کوٹھی کے ویران لان کی طرف تھی۔ میں نے اپنے دوست سے کہا ہم یہ دیوار پھاند کر ریڈیو اسٹیشن میں داخل ہوں گے۔ یہ دونوں کوٹھیوں کے لان کی مشترکہ دیوار تھی۔ یہ کوٹھی ایجرٹن روڈ پر ہوا کرتی تھی۔ اب یہاں ایک شادی گھر ''شہنائی'' کے نام سے کھل گیا ہے۔ ان دنوں اس کوٹھی میں کوئی کلب ہوا کرتا تھا۔ یہ بڑی ویران ویران سی کوٹھی تھی اور دن کے وقت بھی وہاں کوئی آدمی نظر نہ آتا تھا۔ اس وقت رات کے دس بجنے والے تھے۔ میرا خیال تھا کہ کوٹھی ویران ہوگی اور ہم بڑی آسانی سے اس کی دیوار پھاند کر ریڈیو اسٹیشن میں داخل ہو جائیں گے۔ اس ویران اور نیم آسیبی کوٹھی کا ایک چھوٹا سا گیٹ ہوتا تھا جس کا ایک پٹ غائب تھا۔ کوٹھی کے چاروں طرف میدان میں جنگلی گھاس اگی ہوئی تھی۔ درمیان میں چھوٹی سی کاٹیج نما ایک منزلہ بوسیدہ سی عمارت تھی۔ ہم گیٹ میں داخل ہو کر میدان کے گھاس پر سے گزرتے ریڈیو والی دیوار کی طرف بڑھ ہی رہے تھے کہ ایک پٹھان چوکیدار ڈنڈا لیے اندھیرے میں سے نکل کر ہمارے سامنے آ گیا۔

''کدھر جاتا ہے؟''

ہم رک گئے۔ مجھے کسی چوکیدار کے آ جانے کی بالکل توقع نہیں تھی۔ میں نے کہا:

''خان صاحب ہم ریڈیو پاکستان کے آدمی ہیں۔ گیٹ پر بڑا رش ہے اس لیے دیوار پھاند کر اندر جانا چاہتے ہیں۔''

پٹھان چوکیدار نے کہا:

''منیجر صاحب سے بات کر و چل کر۔ وہ اجازت دے گا تو ہم تم کو جانے دے گا۔ نہیں تو یہاں سے بھاگ جاؤ۔''

کوٹھی میں دھیمی سی روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے دوست کو ساتھ لیا اور کلب کے منیجر سے ملنے پٹھان کے ساتھ کوٹھی کی طرف بڑھے۔ اس نے بوسیدہ سا دروازہ کھول کر منیجر سے کہا:

''صاحب دو آدمی ادھر دیوار پھاند رہا تھا۔ ہم اسے یہاں آپ کے پاس لایا ہے۔

کیا حکم ہے؟''

اندر جو صاحب بیٹھے تھے انہوں نے ہمیں اندر بلوالیا۔ میں نے دیکھا کہ اونچی چھت والے پرانی طرز کے چھوٹے سے کمرے میں آتشدان کے پاس میز لگی ہے جس کے قریب لال لال چہروں اور چڑھی ہوئی آنکھوں والے دو ادھیڑ عمر آدمی بیٹھے ہماری طرف گھور رہے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں سگریٹ سلگ رہے ہیں۔ میز پر کریون اے سگریٹ کا پیکٹ اور شراب سے بھرے ہوئے گلاس پڑے ہیں۔ ان میں جو صاحب اس گمنام ویران کلب کے منیجر تھے بولے:

''کون ہو تم؟ کیا چوری کرنے آئے ہو؟''

دوسرا کہنے لگا، ''ہمارے پاس تھوڑی سی شراب رہ گئی ہے۔ اگر چاہو تو ہمارے ساتھ شامل ہو سکتے ہو۔''

میں نے کہا:

''سر! بات یہ ہے کہ میرا نام استاد سلامت علی خاں ہے۔ یہ استاد شوکت علی خاں طبلہ نواز ہے، ریڈیو کے لان میں جو محفل موسیقی ہو رہی ہے مجھے وہاں ایک آئٹم پیش کرنی ہے اور استاد شوکت صاحب کو روشن آرا بیگم کے ساتھ طبلے کی سنگت کرنی ہے۔ ہمارا ریڈیو اسٹیشن کے اندر جانا بہت ضروری ہے۔ گیٹ پر پولیس کسی کو اندر نہیں گھسنے دے رہی۔''

روشن آرا کا نام سن کر منیجر کے سینے سے ایک دل دوز آہ نکلی اور وہ سر پر ہاتھ مار کر بولا:

''روشن آرا بیگم تو ہمارے ملک کی شاندار کلاسیکل سنگر ہیں۔ ان کا گانا تو میں بھی سنوں گا۔ چلو، میں بھی تمہارے ساتھ دیوار پھاندوں گا۔''

یہ کہہ کر منیجر صاحب اٹھے مگر لڑکھڑا کر پھر وہیں بیٹھ گئے۔

''سوری دوستو! اس وقت میں بہت مصروف ہوں۔ پھر کبھی روشن آرا بیگم کا گانا سنیں گے۔''

میرے دوست نے پوچھا، ''تو کیا ہمیں اجازت ہے؟''

منیجر نے ہاتھ بلند کر کے ہوا میں ایک دائرہ بنایا اور کہا:

''اجازت ہے۔ استاد صاحب اجازت ہے۔ جاؤ روشن آرا بیگم جی کے

پاس جاؤ اور انہیں ہمارا اسلام پہنچاؤ۔"

پھر وہ اپنے ساتھی کو کوئی کلاسیکل راگنی بھدی آواز میں گا کر سنانے لگا۔ پٹھان نے ہماری طرف متوجہ ہو کر کہا:

"ٹھیک ہے۔ تم لوگ جاؤ۔"

وہ ہمیں دیوار کے پاس لے گیا اور دیوار پر چڑھنے میں اس شریف آدمی نے ہماری مدد کی۔ جب ہم دیوار کی دوسری طرف گرے تو استاد علی بخش ظہوری مانڈو صاحب کے ساتھ بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ہمیں دیوار سے چھلانگ لگاتے دیکھ کر مانڈو صاحب نے بے ساختہ کہا:

"یہ لوگ آسمان سے گرے ہیں یا کسی کھجور سے گرے ہیں۔"

اس زمانے میں غزل گانے والوں میں استاد برکت علی خاں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ویسے تو آج بھی برکت علی خاں ایسی غزل کوئی نہیں گا سکتا۔ اس کی نقل بہت کی جاتی ہے۔ ان کے بعد ان دنوں غزل گانے والوں میں دو نام بڑے مشہور اور مقبول تھے۔ ان میں ایک علی بخش ظہور تھے اور دوسرے علی بخش قصوری۔ یہ دونوں اپنے اپنے انداز، اپنے اپنے رنگ کے بادشاہ تھے۔ علی بخش ظہور کی آواز بڑی گونج دار تھی اور وہ غزل کی گائیکی میں کلاسیکل رنگ کا رچاؤ اس مہارت سے کرتے تھے کہ غزل کی اصلیت بھی مجروح نہیں ہوتی تھی۔ دوسری طرف علی بخش ظہور کے پاس قصور کا سوز و گداز تھا۔ وہ اپنی طرز کے واحد غزل گانے والے تھے۔ ان کے رنگ میں غزل گانے والا بھی پھر پیدا نہ ہوا۔ ان لوگوں میں خاص بات یہ تھی کہ ان کا رنگ خالص پنجاب کا رنگ تھا جو سوز و گداز اور سروں کے رچاؤ اور پھیلاؤ میں منفرد ہے۔ اور برصغیر کے کسی صوبے کو یہ انداز یہ رنگ نصیب نہیں ہوا سوائے پنجاب کے۔ اس کے بعد اگرچہ مہدی حسن نے غزل گانے والوں میں بڑا نام پیدا کیا اور اس میں کوئی شک شبہ نہیں کہ مہدی حسن بے حد سریلا ہے اور وہ سروں پر سواری کرتا ہے۔ مگر اس کا رنگ پنجاب کا رنگ نہیں ہے۔ ہمیں آج بھی پنجاب کا رنگ اگر کہیں اپنی پوری شان اور روشنی کے ساتھ ملتا ہے تو وہ صرف غلام علی ہی ہے۔

بہر حال میں ان دنوں کی بات کر رہا ہوں جب یہ دونوں فنکار ابھی گوشہ گمنامی میں جدوجہد کر رہے تھے۔ اور ملک میں علی بخش ظہور اور علی بخش قصوری کا طوطی بولتا تھا۔ قصور کو اللہ تعالیٰ نے سر کی بے بہا دولت بخشی ہے اور یہاں کے فنکاروں نے سارے برصغیر میں اپنے شہر کا نام اونچا کیا

ہے۔ بڑے بڑے گنی لوگ بھی ان کے فن کے رچاؤ اور دل گدازیوں کا اعتراف کرتے ہیں اور ان کا بھی یہی خیال ہے کہ قصور پر اللہ کا بڑا فضل ہے۔

''میرا سوہنا شہر قصور نی!''

ہم دیوار پر سے چھلانگ لگاتے ہی مسکراتے ہوئے اٹھے۔ میں نے صادق علی مانڈو کو بتایا کہ اصل قصہ کیا تھا۔ وہ بڑا ہنسے۔ اس وقت اسٹیج پر فریدہ خانم غزل سرا تھیں۔ ساز بج رہے تھے۔ لوگ خاموش بیٹھے اس نامور گلوکارہ کو سن رہے تھے۔ ہم بھی ایک طرف جامن کے درختوں کے نیچے جا کھڑے ہوئے۔ ان درختوں کے جامن بڑے میٹھے ہوتے تھے۔ ساون کی جھڑی لگتی تو ان درختوں پر سے کالے کالے جامن ٹپ ٹپ گرا کرتے مجھے اپنے شہر امرتسر کے کمپنی باغ کے جامن یاد آ جاتے۔ کمپنی باغ میں رام باغ والے دروازے کی طرف سے داخل ہوں تو دونوں جانب جامن کے درخت تھے۔ ان کے جامن بڑے میٹھے ہوتے تھے۔ یہ لمبوترے، پتلے اور کالے سیاہ ہوتے تھے۔ ایسے جامن بڑے میٹھے ہوتے ہیں جبکہ موٹے جامن عام طور پر ذرا ترش ہوتے ہیں۔ امرتسر میں موٹے جامنوں کا تریجہ بھی بکا کرتا تھا۔ پھیری والے بڑے بڑے چھابوں میں ان جامنوں کے ڈھیر اٹھا کر لاتے تھے۔ یہ سارے کے سارے پھٹے ہوئے اور گلے ہوئے جامن ہوتے تھے۔ یہ لوگ انہیں تریجہ کہتے تھے۔ مجھے آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ اس نام کے معنی کیا ہیں۔ یہ جامن سستے بھی بکتے تھے اور بڑے میٹھے بھی ہوتے تھے۔

بہر حال ریڈیو پاکستان کے اندر لان کی ایک جانب دوسرے بند گیٹ کے سامنے جامن کے درختوں کے جامن بھی پتلے، گہرے سیاہ اور لمبوترے اور بڑے ہی میٹھے تھے۔ جس زمانے میں وہاں مشہور شاعر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم بطور اسٹاف آرٹسٹ معاہدے پر ملازم ہو گئے تھے تو وہ میرے ساتھ مل کر بچوں کی طرح زمین پر گرے ہوئے جامن اٹھا کر کھایا کرتے تھے۔ جامن اٹھا کر وہ رومال سے صاف کرتے اور منہ میں ڈال کر کہتے:

''یار یہ بڑے میٹھے جامن ہیں۔''

صوفی تبسم کے ریڈیو اسٹیشن پر آ جانے سے وہاں کی فضا میں مزید رنگینی اور چمک دمک آ گئی تھی۔ صوفی صاحب بڑے زندہ دل اور زندگی سے بھرپور شخصیت کے مالک تھے۔ وہ حقہ پیتے تھے مگر ریڈیو اسٹیشن میں اپنا حقہ ساتھ نہیں لاتے تھے۔ یہاں وہ سگریٹ پی کر ہی گزارا کر لیتے

تھے۔ ریڈیو کی عمارت کے بغل میں سیڑھیوں کے پاس ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ صوفی صاحب اس کمرے میں بیٹھتے تھے۔ اس وقت میں بھی ریڈیو پر بطور اسٹاف آرٹسٹ ملازم ہو گیا تھا اور میری کرسی بھی اسی کمرے میں ڈال دی گئی تھی۔ یوں مجھے صوفی صاحب کی ہم نشینی سے فیض پہنچنے لگا تھا۔ وہ کبھی کبھی کوئی فارسی کا شعر سنا کر مجھے اس کی مشکل الفاظ کے معنی بھی بتاتے جس کے لیے میں آج بھی ان کا شکر گزار ہوں۔ صوفی صاحب کی وجہ سے وہاں کئی دوسرے مشہور گانے والے اور گانے والیاں اور دانشور لوگ آ کر بیٹھتے تھے، اور مجھے ان کی باتیں سننے اور انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا تھا۔ اسی کمرے میں، میں نے پہلی اور آخری بار مشہور موسیقار رفیق غزنوی کو دیکھا اور ان سے باتیں بھی کیں۔ یہ اس حسین اور ہر دلعزیز خوش اطوار خوش گفتار موسیقار کے زوال کا زمانہ تھا اور اس کے بال سفید ہو رہے تھے۔ پھر بھی اس کی شخصیت میں بلا کی کشش تھی۔

آج کے نامور اور بزرگ نعت خواں اعظم چشتی کا وہ شباب کا زمانہ تھا۔ وہ بڑے خوش لباس اور خوب صورت تھے۔ رخساروں پر سرخی جھلکتی تھی۔ گرمیوں میں اکثر بوسکی کی قمیض اور لٹھے کی شلوار میں ملبوس ہوتے۔ سردیوں میں گرم کشمیرے کا نسواری سوٹ پہن لیتے تھے۔ قمیض میں سونے کے بٹن لگے ہوتے۔ بڑے خلیق، ملنسار، ہنس مکھ اور خوش گو شاعر تھے۔ صرف سگریٹ پیتے تھے۔ موسیقی اور علم و ادب پر بھی انہیں کافی عبور حاصل تھا۔ فارسی زبان پر بھی گہری نظر تھی۔ سید امتیاز علی تاج اور بخاری صاحب بھی صوفی صاحب سے باتیں کرنے اسی کمرے میں آ کر بیٹھتے۔ وہ آپس میں گفتگو کرتے اور میں ان کی باتیں بڑے غور اور دلچسپی سے سنا کرتا تھا۔

تب ایسا ہوا کہ میرے اور انور جلال شمزہ کے مشترکہ دوست سلیم شاہد اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہو کر ریڈیو لاہور پر آ گئے۔ اب ہماری محفلیں ان کے کمرے میں لگنے لگیں۔ سلیم شاہد ہندو سے مسلمان ہوا تھا۔ اسے انگریزی ادب سے اس حد تک لگاؤ تھا کہ اس نے اپنی شخصیت کو انگریزی کلچر میں ڈھال لیا تھا۔ وہ دھیمی آواز میں بات کرتا، اچھا سگریٹ پیتا اور سردیوں میں اپنے کمرے کے آتشدان میں آگ جلوا دیتا۔ پھر چائے منگوا کر کہتا:

"آؤ آتشدان کے پاس بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔"

آتشدان کے پاس دو صوفے آمنے سامنے رکھے ہوتے تھے۔ ہم وہاں بیٹھ کر چائے پیتے، اور سلیم شاہد انگریزی ادب کی باتیں شروع کر دیتا۔ اس کی دھیمی آواز میں شارلٹ برونٹے کے

ناولوں اور شخصیت کی باتیں ہمیں بڑی اچھی لگتی تھیں۔اس زمانے میں ٹینیسی ولیم کے ڈراموں کا لاہور میں بڑا شہرہ تھا۔ریگل سینما میں اس کے ایک ڈرامے کی فلم بھی لگی تھی جس کا نام ''اے اسٹریٹ کار لیمنڈ ڈیزائر'' تھا۔ہم دیر تک وہاں بیٹھے اس فلم پر گفتگو کیا کرتے۔

ریڈیو اسٹیشن کی کوٹھی کے سامنے ایک تکونا پلاٹ تھا جہاں جامن کے سات آٹھ گھنے درخت تھے۔خدا جانے یہ درخت کس کی ملکیت تھے۔ساون کے دنوں میں جب جامن پک جاتے تو یہ درخت ٹھیکے پر دے دیے جاتے۔ٹھیکیدار کے آدمی وہاں آ کر اپنی جھونپڑی بنا لیتے۔ان کی لمبی لمبی سیڑھیاں درختوں کے ساتھ لگ جاتیں۔جب وہ جامن اتارتے تو سڑک پر بھی کئی جامن گرتے۔ اردگرد کے لڑکے وہاں پہلے سے موجود ہوتے جو جامن اٹھا کر مزے سے کھاتے۔ٹھیکیدار کے آدمی سڑک پر گرنے والے جامنوں کو نہیں اٹھاتے تھے،وہ لڑکوں کو کچھ نہیں کہتے تھے۔

شاد امرتسری ریڈیو اسٹیشن کی دوسری منزل پر بیٹھتا تھا۔بعد میں وہ پہلی منزل پر عقبی باغیچے کے ایک کمرے میں آ گیا تھا جہاں اس کے ساتھ ظہیر صدیقی بھی بیٹھتا کرتا تھا۔دوسری منزل پر ہی میں نے پہلی بار امراؤ ضیاء بیگم کو دیکھا تھا۔یہ وہی امراؤ ضیاء بیگم تھیں جن کا بچپن میں ہم یہ ریکارڈ بڑے شوق سے سنا کرتے تھے:

میرا سلام لے جا ، یثرب کو جانے والے

گجرات کے چودھری اقبال صاحب بھی یہاں اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائریکٹر ہوتے تھے۔وہ بڑا ادبی ذوق رکھتے تھے۔انگریزی ادب پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔میرا پہلا ناول ''ڈربے'' چھپ چکا تھا۔یہ ناول انہیں بہت پسند تھا۔مگر اس پر انہیں اعتراض بھی تھا۔جب انہوں نے تنقید کی تو مجھ پر یہ بھید کھلا کہ ان کے اعتراضات بالکل جائز تھے۔میں نے اسی وقت عہد کر لیا کہ میں اس قسم کی غلطی ادب میں پھر نہیں کروں گا۔اس کے لیے میں چودھری اقبال صاحب کی روح کا آج بھی شکر گزار ہوں۔وہ سگریٹ بڑی سنجیدگی اور دل جمعی سے پیتے تھے۔انہیں تمباکو سے بڑی محبت تھی۔میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ تمباکو سے محبت کرتے ہیں انہیں تمباکو کچھ نہیں کہتا۔جس طرح سپیرے اپنے سانپوں سے پیار کرتے ہیں اور سانپ انہیں کچھ نہیں کہتے۔اقبال صاحب نے بھی تمباکو کو پالا ہوا تھا اور اس کا زہر نکال لیا تھا۔آج کل لوگ سگریٹ پیتے بھی ہیں اور ان سے خوف بھی کھاتے ہیں۔یہ ایسی بات ہے کہ ہم کسی ایسے مہمان کی مہمانداری کر رہے ہیں جس سے ہمیں

جان کا خطرہ بھی ہو کہ وہ کسی بھی وقت پستول نکال کر ہمیں ہلاک کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سگریٹ ہمیں ہلاک کر ڈالتا ہے۔ چونکہ آج کے زمانے میں محبت اور دل جمعی غائب ہوگئی ہے اور ہم دوسری محبتوں کے ساتھ ساتھ سگریٹ کی محبت سے بھی محروم ہو گئے ہیں۔ اس لیے لازم ہے کہ ہم سگریٹ نوشی سے پرہیز کریں۔ وہ ہمیں نقصان پہنچائے ہی پہنچائے۔ ویسے بھی آج کل وہ اصلی تمباکو نہیں رہے۔ خدا جانے کیا کیا کچھ سگریٹوں میں بھر دیا جاتا ہے۔ نئی نسل کو میں یہی مشورہ دوں گا کہ وہ ہرگز ہرگز سگریٹ وغیرہ کو ہاتھ نہ لگائیں۔

میں پرانے ریڈیو اسٹیشن میں ایوب رومانی اور عبدالشکور بیدل اور رشید حبیبی کا ذکر کرنا بھول گیا ہوں۔ ایوب رومانی لاہور کا رہنے والا تھا۔ اونچا لمبا خوب صورت کشمیری جوان۔ گھنے گھنگھریالے سیاہ بال، چہرے پر ہر وقت کھیلتی ہوئی مسکراہٹ بلند بانگ قہقہے، جگت بازی میں یکتا، میوزک کی گہرائی تک اترنے والا خود نہیں گاتا تھا۔ مگر گانے والے اس کے درس حاصل کرتے تھے۔ بھائی لعل امرتسری ایسے میوزک کے عالم اور گنی بزرگ کا شاگرد رہا تھا۔ پرانے ریڈیو اسٹیشن پر وہ بھی دلکشی روشنی اور زندہ دلی کا سرچشمہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں ریڈیو اسٹیشنوں پر صرف وہی لوگ ملازمتیں کرنے آتے تھے یا صرف ان ہی لوگوں کو انٹرویو میں پاس کیا جاتا تھا جنہیں ادب، آرٹ اور میوزک سے گہرا لگاؤ ہوتا تھا۔ جو خوش شکل اور خوش لباس ہوتے تھے۔ جنہیں شوق ہوتا تھا کہ وہ ریڈیو پر ملازمت کریں اور وہ اسی ملازمت کے سوا کسی دفتر میں ملازمت نہیں کر سکتے تھے۔ آج یہ بات نہیں ہے۔ آج ایسا ہے کہ لوگ دس دس جگہوں پر درخواستیں دے دیتے ہیں۔ محکمہ انکم ٹیکس سے کال نہ آئی اور ریڈیو والوں نے بلا لیا تو وہیں آ گئے۔ آج کے بیشتر پروڈیوسروں کو ادب آرٹ میوزک سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ مگر وہ ادبی اور میوزک کے پروگرام نشر کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ریڈیو کے پروگرام زوال پذیر ہیں۔

ایوب رومانی شاعر بھی تھا۔ اس خوب صورت جوان کو دیکھ کر ہی پتہ چل جاتا تھا کہ یہ ریڈیو اسٹیشن پر کام کرتا ہوگا۔ وہ سگریٹ خود بنا کر پینے کا عادی تھا۔ وہ ہماری طرح بڑا خوش لباس تھا۔ میری طرح وہ بھی سوٹ کا کپڑا اور ٹائیاں تلاش کرتا رہتا تھا۔ ایک اور بات ایوب رومانی میں بڑی نمایاں تھی۔ اکثر سازندے اس کے پاس آ کر بیٹھتے تھے۔ اگر کسی کو قرض کی حاجت ہوتی تو ایوب انہیں خاموشی سے قرض دے دیتا تھا۔ سازندے بھی اتنے ذمے دار تھے کہ جیسے ہی تنخواہ ملتی سب

سے پہلے ایوب رومانی کا قرض ادا کرتے اور مہینے کی آخری تاریخوں میں اس سے پھر قرض لینے کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔

ایک روز میں ایوب رومانی کے پاس بیٹھا تھا۔ ایک وائلن نواز سازندہ اندر آیا اور کھسر پھسر کرنے لگا۔ ایوب رومانی نے میز کی دراز میں سے کچھ نکال کر اس کی مٹھی میں تھما دیا۔ سازندہ چلا گیا۔ مجھے ایوب رومانی نے بالکل نہ بتایا کہ اس نے اسے کیا دیا ہے۔ میں نے بھی نہ پوچھا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ سازندہ کیا مانگنے آیا تھا۔ اتفاق کی بات ہے کہ پہلی دوسری تاریخ کو میں اس وقت بھی ایوب رومانی کے پاس ہی بیٹھا تھا جب وہی سازندہ دوبارہ کمرے میں داخل ہوا اور اسے ایک لفافہ دے کر شکریہ ادا کرتا ہوا چلا گیا۔ تب ایوب نے مسکراتے ہوئے مجھے بتایا کہ یہ لوگ بڑے خرچیلے ہیں۔ کھانے پینے پر ان کی تنخواہ پندرہ تاریخ کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد مجھ سے کبھی کبھی قرض لے جاتے ہیں۔ مگر پہلی کے بعد بڑی ذمے داری سے ادا بھی کر جاتے ہیں، اور وہ سگریٹ سلگا کر ہلکے ہلکے کش لگانے لگا۔ کمرے میں خود بنائے ہوئے سگریٹ کی تلخ خوشبو پھیل گئی۔

موسیقی نے ایوب رومانی کے دل میں بڑا گداز پیدا کر دیا تھا۔ جب وہ کلاسیکی موسیقی کی بات کرتا تو اس کے چہرے پر ایک عجیب سی چمک آجاتی تھی۔ جیسے کسی فانوس کے اندر کسی نے موم بتی روشن کر دی ہو۔ وہ خان صاحب وحید خاں سے لے کر بڑے غلام علی خاں تک بڑے اعتماد سے بات کر لیتا تھا۔ ان کے اسلوب، ان کی گائیکی، ان کے سر کے رچاؤ کا تجزیہ کرتا۔ ان کے گھرانوں کے فرق مجھے بتاتا۔ فلاں گویا سر کتنی خوب صورتی سے لگاتا ہے۔ فلاں گویا اسی سر کو کتنے بھدے طریقے سے لگاتا ہے۔ کون سا راگ صرف ایک سر کو ذرا سا اتار دینے سے دوسرے راگ میں بدل جاتا ہے اور کون سا سر ہے جو فلاں راگ میں پورا نہیں لگتا۔ یعنی بھر کر نہیں لگایا جاتا۔ ایوب رومانی نے میرے علم میں بھی بے پناہ اضافہ کیا کیونکہ مجھے شروع ہی سے موسیقی، کلاسیکل موسیقی کو سمجھنے کا بڑا شوق رہا تھا۔ ایوب رومانی گویوں سازندوں اور موسیقاروں سے بڑا گھل مل گیا تھا۔ اس میں افسروں والی نخوت نہیں تھی۔ بڑے گویوں کو ایوب رومانی خود آگے بڑھ کر بڑے ادب سے ملتا۔ ویسے ایوب رومانی میں غرور نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ اپنے چپڑاسی کو بھی بیٹا کہہ کر بلاتا۔ بعد میں جب وہ ریڈیو کا بڑا افسر بن گیا تب بھی اس میں غرور نہیں آیا تھا۔ اور طبیعت کی

انکساری اسی طرح قائم تھی۔ اسٹاف کے کسی شخص کے خلاف کبھی محکمانہ کارروائی نہ کرتا۔ کسی سے کوئی غلطی ہو جاتی تو اسے سمجھا دیا کرتا۔

جیسا کہ پہلے لکھ چکا ہوں کلاسیکی موسیقی میں وہ امرتسر کے نابغہ روزگار بھائی لعل یا بھائی لال امرتسری کا شاگرد رہا تھا۔ ایوب رومانی نے بھائی لعل کی بڑی خدمت کی تھی اور اس عظیم استاد نے بھی ایوب کو موسیقی کے ایسے ایسے رموز بتا دیے تھے کہ بڑے بڑے گویے بھی ایوب رومانی کے آگے سنبھل کر بات کرتے تھے۔ بھائی لعل کی باتیں کرتے ہوئے ایوب رومانی بڑا جذباتی ہو جاتا تھا۔ اسے استاد برکت علی خاں سے بھی بڑا لگاؤ تھا۔ وہ استاد برکت علی خاں کا بے حد احترام کرتا تھا۔ ایوب رومانی نے اپنے کمرے میں بیٹھے چائے پیتے ہوئے مجھے ایک واقعہ سنایا تھا۔

"خواجہ! ایک بار استاد برکت علی خاں کلکتے گئے۔ واپس آئے تو میری بیگم کے لیے ایک کشمیری شال لیتے آئے۔ انہوں نے تہہ کی ہوئی شال میری میز پر رکھ دی۔ میں نے غلطی سے پوچھ لیا کہ خاں صاحب اس کی کتنی رقم پیش کروں۔ اس پر استاد برکت علی خاں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور کہا کہ ایوب صاحب میں تو آپ کو اپنا بیٹا سمجھ رہا تھا اور آپ افسر نکل آئے۔"

اتنی بات سنا کر ایوب رومانی پر بھی رقت طاری ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے۔ جلدی سے رومال نکال آنکھیں پونچھیں۔ سگریٹ سلگایا اور چپڑاسی کو بلا کر کہا:

"بیٹے فل سیٹ چائے لے آنا۔ تم بھی پینا۔"

یہ رقت بڑی انمول ہوتی ہے۔ یہ قدرت کی طرف سے عطا ہوتی ہے۔ قاضی عبدالغفار نے اپنی مشہور زمانہ کتاب "لیلیٰ کے خطوط" میں لیلیٰ کی زبانی ایک جملہ کہلوایا تھا۔ لیلیٰ اپنے عاشق کو خط لکھتے ہوئے کہتی ہے کہ:

"تم چاہو کہ اپنی ساری دولت دے کر سورج کی ایک کرن خرید لو تو ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہ قدرت کا انمول تحفہ ہے جو یا تو مفت ملتا ہے اور یا کسی قیمت پر نہیں ملتا۔"

رقت بھی میں سمجھتا ہوں کہ قدرت کی طرف سے ملتی ہے۔ یہ رقت میں نے کئی لوگوں پر طاری ہوتے دیکھی ہے۔ ان میں وہ لوگ بڑے افضل تھے جن کے ہونٹوں پر نبی پاک ﷺ کا نام آتے ہی ان پر رقت طاری ہو جاتی تھی۔ کوئی حضور پاک ﷺ کا نام مبارک لیتا تو ان پر رقت

طاری ہو جاتی تھی، اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو جاتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ رقت ہر مسلمان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوئی ہے۔ ایوب رومانی بھی اس معاملے میں بڑا رقیق القلب تھا۔ کوئی دلگداز سر بھی اس کی آنکھوں میں آنسو بھر لاتا تھا۔

ایوب رومانی میں یہ بات بڑی اچھی تھی کہ وہ ہر کسی کی مدد کرنے کو تیار ہو جاتا تھا۔ آج کے زمانے میں آدمی دوسرے کی مدد کرنے سے پہلے کئی بار سوچتا ہے کہ کہیں میں خود تو کسی مصیبت میں نہیں پھنس جاؤں گا۔ مگر ایوب رومانی میں یہ بات نہیں تھی۔ وہ کسی کو مشکل یا مصیبت میں مبتلا دیکھتا تو فوراً اس کی مدد پر تیار ہو جاتا۔ کوئی اگر اسے مشورہ دیتا کہ ایوب تم خود نہ کسی مصیبت میں پھنس جانا تو وہ ہاتھ کو جھٹک کر کہتا:

''چھڈ یار، دیکھا جائے گا۔''

کشمیری ہونے کے ناطے ایوب رومانی کو بھی کھانے پکوانے اور اچھے کھانے کا شوق تھا۔ دوسروں کی دعوت پر وہ ہمیشہ تیار رہتا تھا۔ ایک بار باغ جناح کے اوپن ایئر تھیٹر میں محفل موسیقی ہوئی۔ کھانا وغیرہ بھی پکوایا گیا تھا۔ ایوب رومانی اس کا انچارج تھا۔ مگر ایسا ہوا کہ ایوب رومانی مہمانوں کو کھلانے میں ہی لگا رہا اور جب اس کی باری آئی تو کھانا واقعی ختم ہو چکا تھا۔ دیگوں میں کھرچن بھی باقی نہیں بچی تھی۔ کیونکہ وہاں کافی لوگ باہر سے بھی آ کر کھانا کھا گئے تھے۔ ایوب رومانی نے ایک آدمی کو دو سو روپے دے کر کہا:

''یار! کچھ سازندوں نے بھی کھانا نہیں کھایا۔ مزنگ جا کر مچھلی نان لے آؤ۔ میں کنسرٹ کروا رہا ہوں۔ فارغ ہو کر کھالوں گا۔''

جب محفل موسیقی ختم ہوئی تو میں بھی وہاں پر موجود تھا۔ یقین کریں کہ ایوب رومانی کے لیے سوائے ڈیڑھ نان اور چٹنی کے کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔ ایوب رومانی نے سازندوں کو دو چار گالیاں دیں اور وہیں نان چٹنی کھانے بیٹھ گیا۔

سر اور شعر کے لوگ عام طور پر حساب کتاب کے جھنجھٹوں سے دور ہوتے ہیں مگر عجیب بات ہے کہ ایوب رومانی حساب کتاب بھی پوری ذمے داری سے نبھاتا تھا۔ جب نئے ریڈیو اسٹیشن پر وہ کمرشل سروس کا انچارج لگا تو اس کا کام ہی حساب کتاب رکھنا تھا۔ یہ ڈیوٹی اس نے آخر وقت تک ایسی ذمے داری اور دیانت داری سے نبھائی کہ ایک پائی بھی کہیں سے ادھر ادھر نہ ہوئی اور اس نے

لاکھوں روپے کمرشل اشتہاروں سے ریڈیو پاکستان کو کما کر دیے۔ وہاں بھی جب وہ حساب سے فارغ ہوتا تو کتاب کھول لیتا اور ہمیں اپنے اور دوسروں کے شعر سنا کر لطف اندوز ہوتا۔

اس میں ظرافت کی حس بھی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ موسیقاروں کے بھولے پن کے لطیفے اسے ازبر تھے۔ اس کی زبان سے کئی بار سنا ہوا لطیفہ ایک بار پھر سن کر بھی ہم لوگ بے حد محظوظ ہوتے۔ شروع میں اس کے پاس ایک سائیکل ہوتی تھی۔ اس کے بعد اس نے ایک لمبریٹا اسکوٹر کہیں سے خرید لیا۔ یہ اسکوٹر نئے ریڈیو اسٹیشن کی عمارت میں بھی اس کے ساتھ آیا اور آخری عمر تک چلا۔ آخری دنوں میں اس کے ہونہار بچوں نے قالینوں کا کام شروع کر دیا تھا اور وہ گاڑی میں آنے جانے لگا تھا۔ جب لمبریٹا اسکوٹر اس کے پاس تھا تو آپ کو یاد ہو گیا کہ وہ چھوٹا یعنی ذرا منی سائز کا اسکوٹر ہوا کرتا تھا۔ ایوب رومانی اونچا لمبا آدمی تھا۔ لمبریٹا اسکوٹر اس کے نیچے دب جاتا تھا۔ وہ یوں کہ آدھے اسکوٹر کو ایوب کے اوورکوٹ نے ڈھانپ رکھا ہوتا۔ دور سے دیکھنے پر یوں لگتا تھا جیسے ایوب رومانی سڑک پر بیٹھ کر چلا آ رہا ہے۔ اسکوٹر کی گدی کثرت استعمال سے ایک طرف کو جھک گئی تھی۔ اسکوٹر کے تقریباً سارے پرزے کھڑکھڑانے لگے تھے۔ ایوب رومانی کے کمرے میں بیٹھ کر چائے پیتے ہوئے محسوس ہوتا کہ ہم ریڈیو اسٹیشن میں بیٹھے ہیں۔ ورنہ بعد میں ریڈیو اسٹیشن کا ماحول بہت حد تک بدل گیا تھا۔ آخری دنوں میں ایوب رومانی کے بال سفید ہونے لگے تھے۔ مگر اس کا دل دوستوں کی محبت میں اسی طرح گرم تھا۔

یہ بات میری سمجھ میں نہیں آسکی کہ ایوب رومانی کو وہ مہلک بیماری کیوں لگ گئی تھی جو اس کی بے وقت موت کا سبب بنی۔ ویسے تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہر شخص کی موت کا ایک دن معین ہے اور یہاں کسی کو دم مارنے کی اجازت نہیں ہے۔ ہم کیا اور ہماری بساط ہی کیا ہے کہ ہم موت کے اسرار سمجھ سکیں۔ بہر حال ایوب رومانی اچانک بیمار پڑ گیا۔ ایک روز پتہ چلا کہ وہ ہسپتال میں ہے اور اسے کینسر ہو گیا ہے۔ ہم ہسپتال اس کی عیادت کو پہنچے۔ وہ ہمیں دیکھ کر مسکرایا۔

''خواجہ! سگریٹ تو پلاؤ۔ یہ لوگ مجھے سگریٹ بھی نہیں پینے دیتے۔''

انتقال سے شاید دو تین دن پہلے ایوب رومانی گاڑی میں بیٹھ کر نئے ریڈیو اسٹیشن آیا۔ وہ اسٹیشن ڈائریکٹر کے کمرے میں صوفے پر نیم دراز تھا۔ سب لوگ اسے وہیں آ کر مل رہے تھے۔ وہ کمزور ہو گیا تھا مگر چہرے پر وہی معصوم اور شگفتہ مسکراہٹ کھلی ہوئی تھی۔ میں بھی اس سے ملنے گیا

اور اس کے قریب ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا:

''خواجہ! اچھا کیا جو تم نے مجھ پر مضمون لکھ دیا اور میں نے اپنی زندگی میں ہی پڑھ لیا۔''

میں نے اسے رسمی تسلی دی۔ اس کے بعد ایوب رومانی بھی ہم سے بچھڑ گیا۔ اللہ تعالیٰ اسے جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔

پرانے ریڈیو اسٹیشن پر ہی عبدالشکور بیدل بھی ملازم تھا۔ عبدالشکور بیدل کا تعلق امرتسر کے ایک باعزت گھرانے سے تھا۔ وہ ہمارا دوست بھی تھا اور پاک ٹی ہاؤس میں ہمارے ساتھ بیٹھتا تھا۔ بڑے صاف ستھرے شعر کہتا تھا۔ ان دنوں وہ گورنمنٹ کالج میں پڑھتا تھا۔ میں یہاں بتاتا چلوں کہ عبدالشکور بیدل کے چھوٹے بھائی کا نام میوزک ڈائریکٹر خیام ہے جو برصغیر کے ممتاز فلمی میوزک ڈائریکٹروں میں شمار ہوتا ہے۔ مگر عبدالشکور نے کبھی اس کا ذکر نہ کیا تھا۔ ہاں اسے خوشی اور فخر ضرور تھا کہ اس کے چھوٹے بھائی نے بڑا نام پیدا کیا ہے۔ شکور بیدل کو بھی اچھے کپڑے پہننے کا بڑا شوق تھا۔ سوٹ کا کپڑا بڑی کاوش اور تلاش کے بعد خرید کر لاتا اور اسے بڑے اہتمام سے سلوا کر پہنتا۔ ہمارے سبھی دوست خوش لباس تھے۔ شکور کو اپنے شعر سنانے کی عادت نہیں تھی۔ کبھی کبھی ہم اصرار کر کے اس سے اس کی کوئی تازہ یا پرانی غزل سن لیتے تھے۔ کلاسیکی میوزک کا وہ ماہر تھا۔ خود بھی لائٹ گیت اور کافیاں بڑی مہارت سے گایا کرتا تھا۔ پاکستان فلم انڈسٹری کے آغاز میں اس نے کچھ فلمی گانے بھی گائے مگر پھر اس دنیا سے کنارہ کش ہو گیا۔ اس کی طبیعت میں درویشی بہت تھی۔ نماز روزے کا شروع ہی سے پابند تھا۔ آخری دنوں میں تو اس نے انگریزی لباس ترک کر دیا تھا اور کھدر کی شلوار قمیص پہنتا تھا۔ پرانے ریڈیو اسٹیشن میں وہ بڑا فیشن ایبل ہوا کرتا تھا۔ مگر نئے ریڈیو اسٹیشن پر آنے کے کچھ عرصہ بعد درویشی اس پر غالب آ گئی تھی اور وہ ریڈیو کی مسجد میں باجماعت نماز ادا کرتا تھا۔ اب ہم بھی اس کو مذاق نہیں کرتے تھے بلکہ سبھی دوست اس کا احترام کرتے اور ادب سے پیش آتے تھے۔

میرے پاس ان دنوں صبح کا پنجابی پروگرام ہوتا تھا۔ شاید اس پروگرام کا نام ''راوی دیاں چھلاں'' تھا۔ اسی میں پنجابی گانے لگتے تھے۔ ایک روز شکور بیدل کہنے لگا:

''خواجہ صاحب! میں نے امتیاز علی ریاض علی کی آوازوں میں خواجہ فرید رحمۃ اللہ علیہ

کی ایک کافی ریکارڈ کروائی ہے۔ وہ اپنے پروگرام میں لگا لیا کریں آپ کو بڑی پسند آئے گی۔''

میں نے ریکارڈ روم میں جا کر وہ کافی سنی تو مجھے بڑی اچھی لگی۔ اس میں شکور بیدل نے چنگی ایک خاص ردم کے ساتھ بجائی تھی۔ میں نے وہ کافی اپنے پروگرام میں لگائی تو اسے لوگوں نے بھی بہت پسند کیا اور اکثر اس کی فرمائش آنے لگی۔ جب میں امریکہ جانے لگا تو میں اپنے ساتھ یہ کافی بھی اپنے کیسٹ پر چڑھا کر لے گیا تھا۔ یہ بڑے کمال کی کافی ہے خواجہ فرید رحمۃ اللہ علیہ کی، اور دونوں بھائیوں امتیاز علی ریاض علی نے بڑی محبت سے گائی ہے۔ واشنگٹن میں میں روز ہی شام کو یہ کافی لگا کر سنا کرتا تھا۔ پچھلے دنوں ریڈیو پر امتیاز علی سے ملاقات ہوئی تو میں نے اسے کہا کہ وہ شکور بیدل کی طرز میں بنائی ہوئی خواجہ فرید رحمۃ اللہ علیہ کی کافی بھی ٹی وی پر گا لیا کرے۔ وہ کہنے لگا:

''اگلی بار ضرور گاؤں گا۔''

پھر گہرا سانس بھر کر بولا:

''حمید صاحب! شکور صاحب کی چنگی بھی اس ریکارڈ میں ہمیشہ کے لیے ریکارڈ ہوگئی ہے۔ کتنے بے نظیر پروڈیوسر تھے شکور صاحب۔''

عبدالشکور بیدل نے لاہور ریڈیو اسٹیشن سے اپنا ٹرانسفر کراچی کروا لیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے بچے کراچی میں آباد ہوگئے تھے۔ میں ان ہی دنوں کراچی گیا تو وہاں ریڈیو اسٹیشن پر اپنے ہمدم دیرینہ انعام صدیقی سے ملنے آیا۔ اس نے اسی وقت شکور بیدل کو خبر کر دی کہ لاہور سے خواجہ صاحب آئے ہیں۔ شکور بیدل سب کام چھوڑ چھاڑ کر انعام صدیقی کے کمرے میں آ گیا۔ ہم بغل گیر ہو کر ملے۔ شکور بیدل کے بال سفید ہونے لگے تھے۔ ہم نے انعام صدیقی کے کمرے میں ہی کھانا کھایا۔ چائے کا دور چلا تو شکور بیدل نے لاہور کے پرانے ریڈیو اسٹیشن کی باتیں شروع کر دیں جہاں سے اس نے اپنی ریڈیو کی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ ان پرانے ساتھیوں کی یاد تازہ کی جو ہم سے بچھڑ گئے تھے اور جن سے پہلی ملاقات پرانے ریڈیو اسٹیشن پر ہی ہوئی تھی۔ پھر ٹھنڈا سانس کھینچ کر عالم جذب میں کہنے لگا:

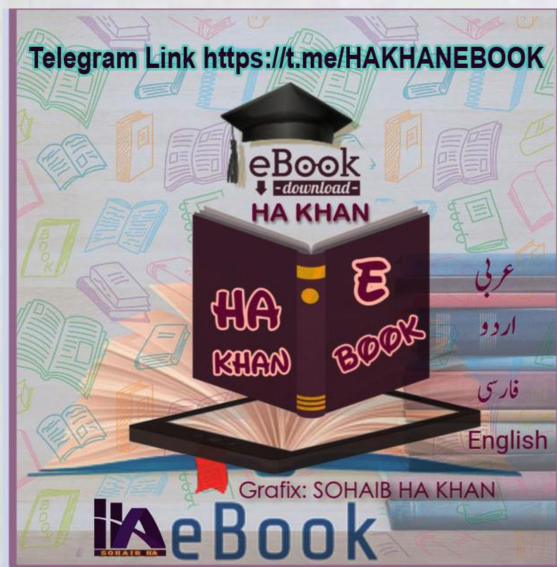
''خواجہ صاحب! یہ دنیا چل چلاؤ کا میلہ ہے بس۔ یہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انجام اچھا کرے اور ہمارے گناہ معاف فرما دے۔''

ہماری فرمائش پر شکور بیدل نے اپنی تازہ غزل سنائی جو واقعی بہت کمال کی غزل تھی۔ یہ آخری غزل تھی جو میں نے اپنے پرانے ساتھی کی زبانی سنی۔ میں لاہور واپس آ گیا۔ ریڈیو کے سارے دوستوں کو بتایا کہ شکور بیدل سے ملاقات ہوئی تھی اور وہ تم سب کو سلام کہہ رہا تھا۔ یہ شکور بیدل کا آخری سلام تھا۔ اس کے بعد وہ بھی ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا۔

رشید حبیبی بھی پرانے ریڈیو اسٹیشن پر ہی آ کر ملازم ہوا تھا اور اپنی طرز کا واحد نوجوان تھا۔ اسے دیہاتی پروگراموں سے زیادہ دلچسپی تھی۔ چنانچہ وہ بعد میں دیہاتی پروگرام کا ہی انچارج لگا۔ وہ شاعر بھی تھا۔ پنجابی کی اس کی ایک رومانی نظم آج بھی لوگوں کو یاد ہو گی:

میراں گلاں یاد کریں گی
رو رو کے فریاد کریں گی
جندڑی نوں برباد کریں گی
فیر میں تینوں یاد آواں گا

ریڈیو پاکستان لاہور کی نئی عمارت اٹھ آنے کے ساتھ ہی ریڈیو کا ایک خاص مزاج ایک خاص کلچر پرانی عمارت میں ہی دفن ہو کر رہ گیا۔ اب وہاں وہ کھنڈر بھی باقی نہیں رہا مارکیٹیں بن گئی ہیں۔ سڑک پر شور ہنگامہ، ٹریفک کی افراتفری مچی رہتی ہے۔ جامن کے دو چار درخت باغیچے میں اب بھی کھڑے ہیں مگر وہ بھی چشم حیرت سے آنے جانے والوں کو دیکھتے رہتے ہیں۔ ایک وقت آئے گا کہ یہ درخت بھی کٹ جائیں گے اور وہاں سے ایک دوسری سڑک نکل آئے گی۔



ہندو سکھوں کے متروکہ مکان

لاہور کے پرانے بلکہ قدیمی محلے پانی والے تالاب سے نیچے سوتر منڈی کی طرف جائیں تو یہ علاقہ گنجان ہو جاتا ہے۔ یہاں سے بائیں جانب ایک تنگ بازار نیم تاریک گلیوں کی طرف چلتا ہے۔ اس بازار کا نام شیشہ موتی بازار ہے۔ اس بازار میں سے آگے جا کر ایک گلی بائیں طرف کو نکلتی ہے جو دو تنگ و تاریک گلیوں میں بٹ کر آگے جا کر بند ہو جاتی ہے۔ یہیں ایک گلی میں ہمیں ایک مکان الاٹ ہو گیا۔ یہ ۱۹۴۷ء ہی کا زمانہ تھا۔ ہم فیض باغ والے الاٹ شدہ مکان سے اٹھ کر یہاں آ گئے۔ سامان تو کوئی تھا نہیں۔ بس فیض باغ سے تانگے میں بیٹھ کر چلے اور سوتر منڈی آ کر اتر گئے۔ یہ چار منزلہ تنگ و تاریک کمروں والا بوسیدہ مکان دوسرے مکانوں میں بڑی بری طرح سے پھنسا ہوا تھا۔ اس کا ٹین کا پرنالہ جھول رہا تھا۔ ڈیوڑھی میں نلکا لگا تھا۔ ڈیوڑھی سے ایک زینہ مکان کے چاروں کمروں میں سے ہوتا ہوا اوپر چھت تک چلا گیا تھا۔ ہر منزل میں ایک ایک کمرہ اور ایک ایک باورچی خانہ تھا۔ باورچی خانہ اتنا چھوٹا تھا کہ وہاں کوئی کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ خدا جانے کسی ہندو یا سکھ نے یہ مکان کیا سوچ کر بنایا تھا۔ اوپر والی دو منزلوں کے کمرے ہمارے رشتے دار لالہ نے رکھ لیے نیچے کے دو کمرے ہم نے لے لیے۔ ڈیوڑھی میں صرف ایک ہی نلکا تھا۔ وہیں باری باری سب غسل کرتے اور وہیں سے پانی بالٹیوں میں بھر بھر کر اوپر اپنے اپنے کمروں میں بھی پہنچایا جاتا۔

اس تنگ اور گندی گلی میں اکثر متروکہ مکان ابھی تک خالی پڑے تھے۔ ایک روز لالہ نے مجھے ساتھ لیا اور ہم اپنے مکان کی چھت سے دوسرے مکان پر کود گئے۔ دروازہ کھولا اور دوسرے مکان کا زینہ اتر کر کمروں کی تلاشی لینی شروع کر دی۔ یہ مکان خالی پڑا تھا۔ لوگ یہاں کا سامان لوٹ کر لے گئے تھے۔ کمروں میں کاغذ، چیتھڑے اور بے کار چیزیں، خالی ٹرنک بکھرے پڑے تھے۔ لالہ موم بتی جلا کر ایک کمرے میں گھس گیا۔ اوپر پرچھتی پر کچھ کنستر ابھی تک پڑے تھے۔ لالہ نے موم بتی مجھے پکڑائی اور پرچھتی پر چڑھ کر کنستر کو کھولا۔ پھر اس میں سے کوئی سفید سی چیز نکال کر

منہ میں ڈالی۔ میری طرف دیکھ کر ہنسا اور بولا:

"چینی ہے اس میں، کام آئے گی۔"

کنستر اس نے نیچے اتار لیا۔ دوسری کوٹھڑی میں گئے تو وہاں ایک ٹرنک ابھی تک بند پڑا تھا۔ یعنی اس میں تالا لگا ہوا تھا۔ لالے نے سلاخ کی مدد سے تالا توڑ دیا۔ ٹرنک میں زنانہ اور مردانہ گرم سوٹ پیس بھی نکلا تھا۔ لالے نے اس گرم کپڑے کا ایک ٹکڑا اپنے پاس رکھ لیا اور دوسرا مجھے دے دیا۔ اس گرم ٹکڑے کا بعد میں اس نے کوٹ سلوا کر پہن لیا اور میں نے اس کی پتلون سلوالی۔ میں یہ پتلون پہن کر پاک ٹی ہاؤس جایا کرتا تھا۔

گلی میں مشرقی پنجاب سے آئے ہوئے طرح طرح کے لوگ آباد تھے۔ ایک مکان میں کسی ہندو منیاری فروش کا تقریباً سارا مال اسٹاک کیا ہوا پڑا رہ گیا تھا۔ تیل کی بوتلیں، کریم کی شیشیاں، کنگھیاں، بلیڈوں کے پیکٹ، صابن کے پیکٹوں سے بھرے ہوئے کریٹ، لوگ رات کے وقت چھپ کر وہاں جاتے اور اپنی اپنی پسند کی چیزیں اٹھا کر لے آتے تھے۔ گلی کے باہر پولیس کا پہرہ لگا تھا تا کہ کوئی لوٹ کا مال باہر نہ لے جا سکے۔ مگر میں اس ہندو کے گودام میں سے تیل کی بوتلیں، کریم کی شیشیاں اور بلیڈوں کے پیکٹ چرا چرا کر انہیں اپنی قمیض کے اندر چھپا کر بڑی بے نیازی سے ٹہلتا ہوا سپاہی کے آگے سے نکل جاتا۔ سوتر منڈی کے چوک میں ہی پانی والے تالاب کے پاس امرتسر کے ایک منیاری فروش نے دکان الاٹ کروالی تھی۔ میں اس کے پاس یہ مال دس بارہ یا زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس روپے میں بیچ دیتا اور ان پیسوں کی پیسٹری اڑاتا۔ اعلیٰ سگریٹ خرید کر پیتا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ابھی میری ادب نویسی نے باقاعدہ کمائی شروع نہیں کی تھی۔ اور کچھ پتہ نہیں ہوتا تھا کہ گزارا کہاں سے چلے گا۔ سب لوگ اس گودام سے چیزیں اٹھاتے تھے۔ چنانچہ میں بھی ان میں شامل ہو گیا تھا۔

ہمارے سامنے والے مکان میں مشرقی پنجاب سے آیا ہوا ایک جھگڑالو کنبہ آباد تھا۔ اس کی عورتوں کی زبان ہر وقت قینچی کی طرح چلتی رہتی تھی۔ ان کی ایک سوکھی ساکھی مریل عورت اپنا چونڈا باندھتی ہوئی کھڑکی میں آ کر کھڑی ہو جاتی اور نیچے گندی گلی پر نگاہ ڈال کر کہتی:

"توبہ پتا نہیں ہندو اس گندی گلی میں کس طرح رہتے تھے۔"

لیکن ان لوگوں نے بھی اس گلی میں بڑا گند ڈال دیا تھا۔ لوگ کوڑا کرکٹ اوپر کھڑکیوں میں

سے نیچے پھینک دیتے۔صفائی کرنے والی آتی تو ہر مکان کے پرنالے گلی میں گندہ پانی گرانا شروع کر دیتے۔ ہمارے ساتھ ایک عورت نے مرغیاں پال رکھی تھیں۔ان کی مرغیاں اپنے مرغ کے ساتھ دن بھر گلی میں گند کر یدتی رہتی تھیں۔ایک روز محلے کے ایک لڑکے نے ایک مرغی اغوا کر لی اور گھر لے جا کر اسے ذبح کر کے پکا لیا۔شام کو ایک مرغی گھر واپس نہ آئی تو وہ عورت شور مچاتی سیاپا کرتی گلی میں نکل آئی۔

''جس نے میری مرغی کھائی ہے اسے ہیضہ ہو جائے۔جس نے میری مرغی کھائی ہے اس کا ککھ نہ رہے۔''

مگر کھانے والے مرغی ہضم کر گئے تھے اور انہیں کچھ نہ ہوا تھا۔

ہماری یہ گلی آگے جا کر جہاں ختم ہو جاتی تھی وہاں ایک اندھیرا مکان تھا۔اس مکان میں جالندھر کے کسی قصبے سے آیا ہوا کنبہ آباد تھا۔ادھیڑ عمر میاں بیوی تھے۔ایک جوان لڑکا تھا جو دن بھر اسٹیشن پر پھیر الگا کر بیچتا تھا۔ان کی ایک بیٹی مشرقی پنجاب میں اغوا ہو گئی تھی۔ادھیڑ عمر عورت سارا دن مکان کی تاریک ڈیوڑھی میں بیٹھی آنے جانے والوں کو ویران نظروں سے تکتی رہتی۔ان کا خاوند بازار میں پھیری لگا کر نالے پراندے بیچتا۔گھر میں سر جھکائے داخل ہوتا۔گلی میں سے بھی سر جھکائے گزرتا۔جوان بیٹی کے اغوا ہو جانے کے غم نے اسے وقت سے پہلے بہت بوڑھا کر دیا تھا۔دن میں ایک بار وہ مہاجر کیمپوں کے چکر لگاتا کہ شاید اس کی بیٹی بھی واپس آ گئی ہو۔گھر میں واپس آتا تو اس کی بیوی مردہ سی آواز میں پوچھتی، ''کچھ پتہ چلا سکینہ کا۔''

وہ سانس بھر کہتا، ''نہیں سکینہ کی ماں۔''

یہ ایک بہت بڑا المیہ ہوا تھا کہ لوگوں کے جگر گوشے وہیں رہ گئے تھے۔جن کے بچے ان کی آنکھوں کے سامنے شہید کر دیے گئے تھے انہیں تو کسی نہ کسی طرح صبر آ گیا تھا لیکن جن کے بچے غنڈے اٹھا کر لے گئے تھے۔وہ دل میں ناسور لیے سسک سسک کر زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ بعد میں بازیافتہ خواتین کے کیمپ بھی لاہور ریلوے اسٹیشن کے پاس کھل گئے تھے۔مگر بازیافتہ خواتین کی حالت ایسی ہوتی تھی کہ ان کے اپنے بھی انہیں پہچاننے سے انکار دیتے تھے۔

بازار شیشہ موتی کے سرے پر ایک ہندو سنیارے کی دکان تھی۔یہ پکی عمر کا زرد رنگ کا گول مٹول خشخشی سر والا ہندو اپنی سفید ساڑھی والی گول مٹول بیوی کے ساتھ وہیں رہ گیا تھا اور ہندوستان

نہیں گیا تھا۔ اس نے پاکستان میں رہنے کو ترجیح دی تھی اور دونوں میاں بیوی مسلمان ہو گئے تھے۔ میں گلی میں آتے جاتے اسے دیکھا کرتا۔ ہندو لالہ دکان کے آگے سفید تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا ہوتا۔ اس کی بیوی تجوری کے پاس بیٹھی ہوتی تھی۔ یہ لالہ آنکھوں میں ڈالنے والی دوائی بھی دیتا تھا اور کوئی پیسہ نہیں لیتا تھا۔ محلے میں پہلے سے جو لاہوری مسلمان آباد تھے وہ اس کی دوائی کی تعریف کرتے تھے۔ لیکن جو مہاجر اپنا سب کچھ لٹا کر، بچوں کو شہید یا اغوا کروا کر وہاں آئے تھے وہ اسے قدرتی طور پر گھور گھور کر دیکھتے تھے۔ چنانچہ کچھ دنوں کے بعد دونوں ہندو میاں بیوی وہاں سے ہندوستان کی طرف کوچ کر گئے۔ یہ مسلمانوں کی طبعی شرافت تھی کہ کسی نے ان غیر مسلم میاں بیوی کو کچھ نہیں کہا تھا۔ ایک مدبر آدمی نے انہیں صاف صاف بتا دیا کہ ان کا یہاں رہنا مناسب نہیں کیونکہ مشرقی پنجاب سے جو مہاجر تباہ و برباد ہو کر آ رہے ہیں ان کے اندر اشتعال پیدا ہو سکتا ہے۔

اسی گلی کے ایک مکان کے چوبارے میں ایک ضعیف العمر بوڑھا آلتی پالتی مارے بیٹھا حقہ گڑگڑاتا رہتا۔ کسی وقت نیچے گلی میں جھانک کر آسمان کی طرف دیکھتا اور پھر حقہ گڑگڑانے لگتا۔ بجلی کے تاروں پر کبوتر آ کر بیٹھتے تو وہ ان سے باتیں شروع کر دیتا۔ رات کو وہ ہدایت اللہ کی کافیاں گانے لگتا۔

ج...... جاگ سویلڑے کھول اکھاں

لمی وات مسافری چلنا ای

پاکستان میں پہلی برسات کی جھڑی لگی تو رکنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ تین روز تک بارش ہوتی رہی۔ چار دن بعد پھر بارش شروع ہو گئی اور دو روز تک مسلسل ہوتی رہی۔ لوگوں نے اذانیں دینی شروع کر دیں۔ اس تنگ و تاریک گلی کے بوسیدہ مکانوں نے ٹپکنا شروع کر دیا۔ کئی مکانوں کی پرچھتیاں ڈھے گئیں۔ دیواروں میں دراڑیں پڑ گئیں۔ ہمارے چار منزلہ مکان کی اوپر والی چھت بھی چونے لگی تھی۔ اس کے بعد ایک روز زلزلہ آ گیا۔ اس زلزلے نے رہی سہی کسر پوری کر دی اور سارے مکان اپنی اپنی جگہوں سے ہل گئے۔ اگر وہ ایک دوسرے میں پھنسے ہوئے نہ ہوتے تو سارے منہ کے بل گر پڑتے۔

ہمارے مکان کو کچھ زیادہ ہی نقصان پہنچا اور اوپر والی منزل کا چھجا آگے کو نکل آیا۔ اب ہمارا وہاں رہنا خطرناک تھا۔ چنانچہ ایک بار پھر ہم نے دو چار برتن جو وہاں آ خریدے تھے اٹھائے اور

ایک رشتے دار کے ہاں آ گئے۔ ہم نے دوبارہ الاٹمنٹ کی درخواست دے دی۔ ان دنوں الاٹمنٹوں کا چکر چل رہا تھا۔ کپور تھلہ ہاؤس میں ری ہیبلی ٹیشن کا دفتر تھا۔ اس دفتر میں آ کر خدا کی خدائی یاد آ جاتی تھی۔ لوگ ہاتھوں میں درخواستیں اور بغلوں میں فائلیں دبائے مارے مارے پھر رہے تھے۔ کسی نے کلیم داخل کرایا ہوا تھا کوئی مکان الاٹ کروانے کے لیے در بدر پھر رہا تھا۔ کوئی کسی کو نہیں پوچھتا تھا۔ کئی لوگ اسی چکر میں بوڑھے ہو کر مر کھپ گئے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ الاٹمنٹوں اور کلیم کی چکی میں پس کر کئی شرفا اس دنیا سے بے نیل و مرام رخصت ہو گئے۔ کئی لوگوں نے حالات سے تنگ آ کر اپنی فائلیں بھی پھاڑ ڈالیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ پیچھے جن لوگوں کے پاس رہنے کو جگہ نہ تھی انہوں نے جھوٹے کلیم داخل کروا کر پاکستان میں کئی کئی مربعے اور حویلیاں الاٹ کروالیں اور جو لوگ پیچھے مربعوں کے مالک تھے اور راج کرتے تھے وہ در بدر ہو گئے اور انہیں کسی نے نہ پوچھا۔ لیکن جب کوئی انقلاب آتا ہے تو ایسا ہوا ہی کرتا ہے۔

اس بار ہمیں کرشن نگر کی ایک گلی میں مکان الاٹ کر دیا گیا جہاں پہلے سے بے شمار گھرانے آباد تھے۔ یہ مکان اصل میں ایک کٹڑی میں واقع تھا۔ یہاں بھانت بھانت کے مہاجر آ کر آباد ہو گئے تھے۔ ایک کوٹھڑی میں کسی تھانے کا سپاہی اکیلا رہتا تھا۔ وہ جب ڈیوٹی پر جاتا تو اپنی کوٹھڑی پر تالے کی جگہ ہتھکڑی لگا کر جاتا۔ کٹڑی کی ڈیوڑھی میں ایک اندھی فقیرنی بوریا بچھائے بیٹھی رہتی۔ وہ صرف ہاتھ پھیلائے رکھتی تھی اور گلی میں سے گزرنے والے لوگ پیسہ روپیہ خیرات اس کے سامنے رکھ دیتے تھے۔ وہ ان پیسوں کو ہاتھ ادھر ادھر چلا کر اٹھا لیتی تھی۔ ایک لنگڑا فقیر اس کے پاس آ کر بیٹھنے لگا تھا۔ وہ اندھی مائی کو کراچی جانے پر رضامند کرنے کی کوشش کرتا۔

''اماں! کراچی میں بڑے پیسے ہیں۔ یہاں کیا بھیک ملے گی۔ یہاں تو تو اپنی زندگی برباد کر رہی ہے۔ میرے ساتھ کراچی چل کر دیکھ۔ لوگ اتنی خیرات دیتے ہیں کہ شام تک پندرہ بیس روپے جمع ہو جاتے ہیں۔''

اس زمانے میں پندرہ بیس روپے بہت ہوا کرتے تھے۔ اندھی مائی اس کے ساتھ جانے کو تیار نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اسے کہتی:

''نہ پتر! میں کسی کے ساتھ کراچی نہیں جاؤں گی۔ میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ ایک بار ایک لڑکا مجھے پشاور لے گیا تھا۔ سارے پیسے وہ خود کھا جاتا تھا۔ مجھے پھوٹی کوڑی

بھی نہیں دیتا تھا۔ نہ میں نہ جاؤں گی تو چلا جا۔''

سامنے والے مکان میں بجلی کا ایک مستری رہتا تھا۔ وہ گھر پر بھی پنکھوں کے آرمیچر لا کر انہیں ری وائنڈ کیا کرتا تھا۔ اس کے بیوی بچے بھی وہیں تھے۔ اس کے گھر کی بتیاں سارا دن جلتی رہتی تھیں۔ ہفتے میں ایک بار وہ اپنے مکان کی ڈیوڑھی میں لگا ہوا بجلی کا میٹر الٹا کر دیتا تھا۔ یہ کام کرنے سے پہلے وہ ڈیوڑھی کا دروازہ بند کر دیتا تھا۔ بجلی کا میٹر الٹا چلانے کا گر صرف اسی کو آتا تھا۔

رات کو یہاں گرمیوں میں سونا بہت مشکل کام تھا۔ گرمی اور مچھر سونے نہیں دیتے تھے۔ میں اکثر گرمیوں کی راتیں کسی باغ یا ریلوے اسٹیشن میں جا کر بسر کرتا تھا۔ رات کو وہاں کسی خالی بنچ پر سو جاتا اور صبح صبح اٹھ کر گھر آ جاتا۔ کسی روز میں حضوری باغ کی طرف نکل جاتا۔ حضوری باغ میں گرمیوں میں پہلے بھی کئی راتیں بسر کر چکا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات تھی جب ہم شیشہ موتی بازار والے کباڑ خانے میں رہتے تھے۔ ان باغوں اور ریلوے پلیٹ فارموں پر راتیں بسر کرنے کا تجربہ بھی میرے لیے بڑا دلچسپ تھا۔ دوسرے شہروں میں تو خانہ بدوشی کے دور میں راتیں بے سرو سامانی کے عالم میں بسر کر چکا تھا لیکن اپنے شہر لاہور میں اس طرح راتیں گزارنے کا تجربہ میرے لیے بالکل نیا تھا۔ میں شروع ہی سے سخت جان تھا۔ تکلیفوں کا عادی تھا۔ چنانچہ مجھے جاگنے یا بے آرامی کے ماحول میں رات بسر کرنے سے کوئی خاص تکلیف نہیں ہوتی تھی۔ بس حضوری باغ کے مچھر ضرور تنگ کرتے تھے۔ پھر میں ان کا بھی عادی ہو گیا تھا۔ اور میں نے ان مچھروں سے دوستی کر لی تھی۔ ان راتوں کا ذکر میں اسی کتاب میں کسی دوسرے باب میں تفصیل کے ساتھ کروں گا۔ ابھی میں صرف لاہور میں ۱۹۴۷ء کے فوراً بعد کے زمانے میں ہندو سکھوں کے متروکہ مکانوں میں رہنے والوں اور ان مکانوں کا ذکر کروں گا۔

ہندو سکھ یہاں جو مکانات چھوڑ گئے تھے ان میں سے جو مکانات بیڈن روڈ، نکلسن روڈ اور کرشن نگر میں تھے، ان کی حالت تو قدرے اچھی تھی۔ لیکن شاہ عالمی چھوڑ کر دوسرے محلوں میں ان کے متروکہ مکانوں کی حالت بڑی گندی اور مخدوش تھی۔ کئی مکانوں کی دیواریں جل چکی تھیں۔ چھتیں گری ہوئی تھیں۔ ہم نے کچھ مہینے شاہدرہ کے علاقے میں بھی ایک متروکہ مکان میں گزارے۔ شاہدرہ قیام پاکستان کے شروع کے زمانے میں بہت حد تک خاموش اور پر سکون اور سرسبز علاقہ تھا۔ پل کے پار صرف ایک لاری اڈا تھا جہاں سے پنڈی اور شیخوپورہ کی طرف لاری

چلتی تھی۔ لاریوں میں بھی اتنا رش نہیں ہوتا تھا۔ اگست، ستمبر اور اکتوبر ۱۹۴۷ء میں جب مشرقی پنجاب سے مہاجرین بڑی تعداد میں آ رہے تھے تو مہاجر ٹرینیں بھی چلتی تھیں جن کی چھتوں پر بھی لوگ بیٹھے ہوتے تھے۔ کابل سے اس زمانے میں کچھ کابلی اپنے بڑے بڑے ٹرک لے کر آ گئے تھے۔ ان ٹرکوں میں انہوں نے اونچی دیواروں کے درمیان رسے ڈال دیے تھے جن کا سہارا لے کر مسافر کھڑے ہو جاتے تھے۔ یہ کابلی ایک آنہ لے کر مہاجروں کو لاہور سے گوجرانوالہ پہنچا دیتے تھے۔ آگے پھر یہی ٹرک دو آنے لے کر وزیر آباد سے کچھ آگے تک پہنچا دیتے تھے۔ اس طرح ان ٹرکوں کا سلسلہ پنڈی تک جاری رہتا تھا۔

شاہدرہ میں نور جہاں کے مقبرے کی حالت بڑی خستہ تھی۔ اب تو تھوڑی بہت اس کی مرمت ہو گئی ہے مگر ۱۹۴۷ء میں یہ کسمپرسی کے عالم میں تھا۔ اور لوگوں نے دیواروں پر کوئلے سے جگہ جگہ اپنی پسند کے اشعار اور اپنے نام لکھ رکھے تھے۔ میں اپنے شاہدرے والے متروکہ مکان سے نکل کر اکثر نور جہاں کے مزار پر آ جاتا۔ گرمیوں میں یہاں بڑی ٹھنڈک ہوتی تھی۔ نور جہاں کے مزار کے پاس چاروں طرف سے ٹھنڈی ہوا آتی تھی۔ اس مغل ملکہ کی قبر تو نیچے تہہ خانے میں تھی اوپر اس کا نشان تھا۔ مگر تہہ خانے میں جانے کا کوئی راستہ مجھے نہیں مل سکا تھا۔

اس وقت کامران کی بارہ دری بھی دریا میں نہیں آئی تھی۔ یہ دریا کے شمالی کنارے پر ہی تھی اور یہاں رستم زماں گاما پہلوان نے اپنا ڈیرہ جمایا ہوا تھا۔ میں نے بڑی بڑی مونچھوں اور وجیہہ چہرے والے پر جلال رستم زماں کو پہلی بار بارہ دری کامران میں ہی دیکھا تھا۔ میرا ایک صحافی دوست امروز کے سنڈے ایڈیشن کے لیے اس پہلوان کا انٹرویو لینے گیا تو میں اس کے ساتھ چلا آیا۔ اس وقت رستم زماں کا اتار شروع ہو چکا تھا مگر اس ادھیڑ عمری میں بھی ان پر جیسے شباب کا عالم تھا۔ چہرے پر ایسا وقار اور جلال تھا کہ مجھ ایسے گنہ گار کی آنکھ نہ ٹھہرتی تھی۔ اگر ٹھہرتی بھی تھی تو اپنے گناہوں کو یاد کر کے واپس لوٹ آتی تھی۔ اس میں کیا شک ہے کہ میرا اور اس درویش صفت پاکباز عظیم رستم زماں کا بھلا کیا مقابلہ ہو سکتا تھا۔ بارہ دری بالکل کھنڈر تھی۔ دریا کی لہریں اس سے کچھ فاصلے پر سے ہو کر گزرتی تھیں۔ وہاں کھیت تھے جہاں سبزیاں بوئی جاتی تھیں۔ ایک اکھاڑہ بھی تھا جہاں پہلوانی کے شوقین لوگ صبح و شام آ کر ورزش کرتے، زور کرتے اور عظیم رستم زماں کے مشوروں سے فیض یاب ہوتے۔

اپنے انٹرویو میں رستم زماں گاما پہلوان نے بڑی دلچسپ باتیں بتائی تھیں جواب مجھے واقعی یاد نہیں رہیں۔اس کے بعد یہ بری خبر سنی کہ رستم زماں کو بارہ دری کامران میں کسی سانپ نے کاٹ لیا ہے۔ہم لوگ میو ہسپتال گئے۔رستم زماں کو اللہ نے بچالیا تھا۔وہ تندرست ہو کر واپس بارہ دری میں چلے گئے اور اپنے معمولات میں مصروف ہو گئے۔

میں صبح کی سیر کو نکلتا تو دربار کی طرف جاتے ہوئے دور سے رستم زماں کو دیکھتا کہ وہ لنگوٹ باندھے اکھاڑہ گوڈ کر رہے ہیں یا ورزش کر رہے ہیں۔میں آج بھی اپنی خوش قسمتی پر فخر کرتا ہوں کہ میں نے اپنی زندگی میں رستم زماں گاما پہلوان ایسی عظیم شخصیت کو دیکھ لیا۔ایسے پاکباز درویش صفت،خوددار اور بھولے بھالے پہلوان بڑی دیر بعد پیدا ہوا کرتے ہیں۔شاہدرہ سے جی ٹی روڈ آگے راولپنڈی کی طرف جاتی ہے۔قیام پاکستان کے وقت یہ سڑک زیادہ چوڑی نہیں تھی مگر بڑی پکی تھی۔آج کی طرح ذرا سی بارش سے اس میں گڑھے نہیں پڑتے تھے مجھے یاد ہے کہ گرمیوں کی دوپہروں میں یہ سڑک شیشے کی طرح چمکا کرتی تھی۔اس سڑک کے دونوں جانب ٹاہلیوں کے درخت پنڈی تک چلے گئے تھے۔مہاجرین جو مشرقی پنجاب اور دوسرے علاقوں سے آتے تھے، انہوں نے ان درختوں کو کاٹنا شروع کر دیا۔تاکہ ان کی لکڑیاں بیچ کر اپنے بال بچوں کا پیٹ بھر سکیں۔حکومت نے انہیں کچھ نہیں کہا تھا۔میں نے اپنی آنکھوں سے لوگوں کو درختوں پر چڑھ کر ٹاہلی کی بڑی بڑی ٹہنیوں کو نیچے گراتے دیکھا ہے۔جی ٹی روڈ کے درختوں کی پوری ایک نسل نے قیام پاکستان کی پہلی لٹی پٹی مہاجر نسل کی بڑی خدمت کی تھی۔درختوں کی یہ نسل ختم ہو گئی۔اس کی جگہ دوسرے درخت مسکرانے لہرانے لگے اور انہوں نے ملک کی نئی نسل کو اپنی گھنی چھاؤں پیش کی۔

سنت نگر کے متروکہ مکانوں میں بھی مہاجر آباد ہو رہے تھے۔یہاں گراؤنڈ کے سامنے حمید اختر کے بڑے بھائی نے ایک مکان الاٹ کروالیا تھا۔یہ دو منزلہ مکان تھا۔اس کی بیٹھک کا دروازہ دکان کی طرح تھا۔دراصل پہلے یہ کسی ہندو یا سکھ کی دکان ہی ہوا کرتی تھی۔حمید اختر نے دکان کا بڑا دروازہ بند کر کے اسے بیٹھک میں تبدیل کر دیا تھا۔یہاں ہم لوگ بیٹھ کر اپنی محفل جماتے۔ادب پر باتیں کرتے۔ہنسی مذاق ہوتا،قہقہے لگتے اور چائے کے دور چلتے۔اس بیٹھک میں دری کا فرش بچھا تھا۔دیوار کے ساتھ ایک متروکہ پلنگ رکھا تھا۔کبھی رات ہنسی مذاق کی باتوں

میں زیادہ گزر جاتی تو ہم اسی بیٹھک میں پڑ رہتے۔ ان محفلوں میں ابن انشا، ابراہیم جلیس اور امروز کے نائب مدیر سید کرمانی کے نام نمایاں تھے۔ کبھی کبھی سید سبط حسن بھی آ جاتے تھے۔ ان کے آتے ہی پائپ کے تمباکو کی خوشبو فضا میں پھیل جاتی۔ اس مکان کے سامنے ایک کشادہ گراؤنڈ تھی۔ جس کے چاروں طرف تار لگے تھے۔ یہاں لڑکے کھیلتے اور آدمی بکروں کو سیر کراتے۔ چاندنی راتوں میں ہم اس مکان کی چھت پر چڑھ کر بیٹھتے۔ اس مکان کی چھت سے دریائے راوی کے درخت صاف دکھائی دیتے تھے۔ ابھی بند روڈ نہیں بنی تھی۔

ان ہی دنوں دریائے راوی میں سیلاب آ گیا۔ یہ بڑا زبردست سیلاب تھا اور قیام پاکستان کے دو ماہ بعد ہی آیا تھا۔ ہمارا مکان ان دنوں فیض باغ میں ہی تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہم ابھی فیض باغ والے متروکہ مکان میں ہی رہتے تھے۔ وہاں کی سیلابی تباہ کاریوں کا حال بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے سنت نگر والے مکان کا ذکر کرتا ہوں۔ سیلاب کی کسی کو پہلے سے خبر نہ تھی۔ ابھی موسمی پیش گوئیاں کرنے والوں کا دفتر بھی قائم نہیں ہوا تھا۔ سیلاب اچانک آ گیا۔ جب پانی کا پہلا ریلا سنت نگر میں داخل ہوا تو لوگوں کو پتہ چلا کہ دریا میں سیلاب آ گیا ہے۔ لوگ جلدی جلدی وہاں سے نکلنے لگے۔ مگر سیلاب کا ریلا اتنا شدید تھا کہ بہت کم لوگوں کو وہاں سے نکلنے کی مہلت مل سکی۔ آبادی کی اکثریت سیلاب کے پانی میں گھر گئی۔ اس میں حمید اختر اس کے بڑے بھائی صاحب کا کنبہ بھی شامل تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے علاقے میں چھ چھ سات سات فٹ سیلاب کا پانی کھڑا ہو گیا۔ مکانوں کی پہلی منزلیں روشندانوں تک پانی میں ڈوب گئیں۔ حمید اختر کا کہنا ہے کہ وہ بھی دوسرے لوگوں کی طرح مکان کی چھت پر چڑھ کر بیٹھ گئے۔ پاکستانی فوج کے جوان اور نجی فلاحی اداروں کے رضا کار کشتیاں اور ٹیوبیں لے کر لوگوں کو بچانے کے لیے نکل کھڑے ہوئے مگر سیلاب میں پھنسے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ لوگوں نے خود بھی بڑی ہمت کی اور بڑی بڑی پراتیں پانی میں ڈال کر اس میں عورتوں اور بچوں کو بٹھا کر سیکرٹریٹ کی طرف نکلنے میں کامیاب ہوئے۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ سیلاب کا پانی جی پی او تک آیا ہوا تھا اور جی پی او کے کمروں میں بھی پانی چل رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ یہ لاہور کا سب سے بڑا سیلاب تھا۔

سید سبط حسن کو جب پتہ چلا کہ حمید اختر کی فیملی سیلاب میں گھر گئی ہے تو وہ سیلاب کے پانی میں اتر گیا اور اکیلا ہی تیرتا ہوا ان کے مکان پر پہنچ گیا۔ اس کے بعد وہ بھی وہیں پھنس کر رہ گیا۔

جذبات میں آ کر وہ یہ بھول گیا تھا کہ پھنسے ہوئے لوگوں کو کس چیز میں بٹھا کر واپس لائے گا۔ کچھ دیر بعد فوجی جوان کشتی لے کر وہاں پہنچے اور انہوں نے سب کو وہاں سے نکالا۔ فیض باغ کا یہ عالم تھا کہ سارے علاقے میں شدید بارشوں کے بعد یہ افواہ گرم تھی کہ راوی کنارے سے اچھل پڑا ہے۔ محلے کے بہت سے لوگ مغلپورے سے آنے والے گندے نالے پر آ کر بیٹھ گئے۔ وہ غور سے نالے کے پانی کو تک رہے تھے۔ یہ بات وہاں مشہور تھی کہ اگر پانی مغلپورے کی طرف سے دریا کی جانب بہہ رہا ہو تو سیلاب کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ لیکن اگر پانی الٹا چلنے لگے یعنی دریا کی جانب سے مغلپورے کی طرف بہنا شروع کر دے تو سمجھو کہ سیلاب آ رہا ہے۔ شام تک گندے نالے کا پانی دریا کی طرف بہہ رہا تھا۔ ہم لوگ مکان پر آ گئے۔ کسی نے پوچھا:

''کیا پوزیشن ہے بھا جی؟''

دوسرے نے جواب دیا، ''نالہ دریا کی طرف بہہ رہا ہے۔ بے فکر ہو کر سو جاؤ۔''

مگر لوگ لالٹین لے کر گندے نالے کے کنارے بیٹھے رہے۔ پھر رات کے شاید تین بجے یعنی پچھلے پہر گلی میں کسی نے چلا کر خبردار کیا، ''نالہ الٹا چلنے لگا ہے۔ سیلاب آ رہا ہے۔ اپنا اپنا بچاؤ کر لو۔''

ہم بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ جلدی جلدی دو چار برتنوں کو سمیٹنا شروع کر دیا۔ اس کام میں آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ اب جو ڈیوڑھی میں آئے تو سیلاب کا پانی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ لالے نے گھبرا کر کہا، ''او یہ سیلاب تو آ گیا آپو جی۔''

پو پھٹ رہی تھی۔ سپیدہ صبح نمودار ہو رہا تھا۔ کھڑکی میں سے گلی میں جھانکا تو سیلاب کا پانی مکانوں کی دیواروں سے ٹکرا رہا تھا۔ نچلی منزل میں جو کنبہ آباد تھا وہ خدا جانے کس وقت وہاں سے نکل چکا تھا۔ فضا میں سیلاب کے پانی کی خاص مرطوب خوشبو تھی۔ تیسرے چوتھے دن یہ خوشبو سیلاب کے چھوڑے ہوئے کیچڑ کی تیزابی بو میں تبدیل ہو گئی تھی۔

گلی میں پانی چڑھ رہا تھا۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے پانی مکانوں کی پہلی منزلوں کے اندر داخل ہو گیا اور آدھی منزلیں پانی میں ڈوب گئیں۔ دوسرے کنبوں کی طرح ہم بھی اس سیلاب میں گھر گئے تھے۔ صبر شکر کر کے بیٹھ گئے۔ مگر میں باہر جانے کو بے تاب تھا۔ دوپہر کے بعد سیڑھیوں میں آیا۔ پانی نیچے سے اوپر چھٹی سیڑھی تک آیا ہوا تھا۔ میں نے پانی میں پاؤں ڈالا تو میرا پاؤں تیل

میں بھر گیا۔ پانی میں کسی کارخانے کا ڈیزل آئل بھی شامل ہو گیا تھا۔ اب میں پانی میں اترنے کو تیار نہ تھا۔ دوپہر کو ایک کشتی گلی کے پانی میں داخل ہوئی اس میں کچھ رضا کار روٹیاں اور پکوڑے لائے تھے۔ وہ یہ چیزیں محلے والوں میں بانٹ رہے تھے اور تسلی دے رہے تھے کہ فکر نہ کرو۔ دوسرے رضا کار کشتیاں لے کر آ رہے ہیں۔ وہ آپ کو یہاں سے نکال کر لے جائیں گے۔ ہم لوگ ان کشتیوں کا انتظار ہی کرتے رہے۔ مگر کوئی نہ آیا۔ رات اسی خوف میں گزر گئی کہ کہیں سیلاب کا زور نہ بڑھ جائے۔ مگر خوش قسمتی سے سیلاب اپنی حد پر قائم رہا۔ دن کی روشنی میں دیکھا کہ پانی بڑھا نہیں مگر کم بھی نہیں ہوا تھا۔ اپنی جگہ پر قائم تھا۔ جب اس مکان میں پھنسے ہمیں دو دن گزر گئے تو ہم بھائیوں نے وہاں سے نکلنے کا فیصلہ کر لیا۔ پانی صرف اتنا کم ہوا تھا کہ ہماری کمر تک آتا تھا۔ چھوٹے بھائی نے دادا جان کو کاندھے پر اٹھایا اور گھر والوں کے منع کرنے کے باوجود وہ پانی میں اتر گیا۔

اس نے دادا جان کو کاندھوں پر بٹھا رکھا تھا اور تیل ملے پانی میں کمر تک ڈوبا آہستہ آہستہ دو موریہ پل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ دو موریہ پل کے سامنے والا محلّہ اونچا تھا۔ اور گلی میں چار پانچ سیڑھیاں چڑھ کر جانا پڑتا تھا۔ سیلاب سے بھاگے ہوئے کچھ لوگ یہاں بھی دکانوں کے آگے بال بچوں کو لیے بیٹھے تھے۔ بھائی نے دادا جان کو وہاں بٹھایا اور کسی طرح سے ایک کشتی والے کو راضی کر لیا۔ وہ کشتی لے کر گلی میں آ گیا۔ اس کشتی پر محلے کے دوسرے لوگوں نے بھی یلغار کر دی۔ بہر حال بڑی مشکل سے ہم لوگ فیض باغ سے نکل کر اونچی گلی میں آئے۔ یہاں مجھے یاد ہے دادا جان کو پیاس لگی تو وہاں کہیں پانی نہیں تھا۔ نلکے بھی بند ہو گئے تھے اوپر جو لوگ رہتے تھے وہ فوراً پانی کی بالٹیاں اور کھانے پینے کا سامان لے کر گلی میں آ گئے۔ لاہور کی زندہ دلی اور مہمان نوازی اس مقام پر بھی مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔

یہاں سے ہم اپنے رشتہ داروں کے ہاں چلے گئے۔

مجھے چوک چیمبرلین گوالمنڈی کا ایک اور متروکہ مکان یاد آ رہا ہے۔ اس مکان کو ایک چھوٹی سی گلی میں سے راستہ جاتا تھا۔ ہمیں کسی متروکہ مکان کی تلاش تھی۔ میں اپنے دوست کے ساتھ اس مکان میں آ گیا۔ یہ مکان دوسری منزل پر تھا۔ نیچے دکانیں تھیں جو ابھی تک بند پڑی تھیں۔ بعد میں یہاں ایک دکان میں میرے ایک محلے دار نے چائے خانہ کھول لیا تھا۔ بہر حال جب ہم اوپر والے مکان میں آئے تو دیکھا کہ سارا مکان خالی پڑا تھا۔ مگر باورچی خانے میں چینی، چاول، آٹا

اور دال کی بوریاں ویسے ہی پڑی تھیں۔ کمرے میں ایک الماری کا تالا توڑ کر میرا دوست اس کی تلاشی لینے لگا۔ اس الماری میں کچھ کتابیں تھیں۔ انگریزی اور ہندی کی کتابیں۔ ایک چھوٹی سی ٹوکری نکلی جس میں کروشیا، دھاگہ اور پانچ روپے کے نوٹ کے ساتھ ایک زنانہ رسٹ واچ بھی تھی۔ کلائی کی گھڑی میرے دوست نے اپنے پاس رکھ لی اور پانچ روپے مجھے دے دیے۔

میں نے کہا، "یہ مکان ہم لے لیتے ہیں بعد میں الاٹ کروالیں گے۔"

میرا دوست کہنے لگا، "نہیں ایسا نہ کرنا۔ بعد میں بڑی پریشانی ہوگی۔ تم ایسا کرو کہ ابھی الاٹمنٹ کے دفتر میں جاؤ۔ عرضی دے کر یہ مکان الاٹ کروالو میں یہاں اس مکان پر پہرہ دوں گا تا کہ کوئی دوسرا یہاں نہ آگھسے۔"

مجھے اپنے دوست کی یہ تجویز اچھی لگی۔ میں مکان سے اتر کر اسی وقت الاٹمنٹ کے دفتر کی طرف روانہ ہوگیا۔ دن کے دس بج رہے تھے وہاں سے الاٹمنٹ کی پرچی لینا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ شاید اس حقیقت سے میرا دوست بھی واقف تھا۔ چنانچہ دوپہر کے بعد جب میں خالی ہاتھ واپس آیا تو دیکھا کہ میرے دوست کی فیملی اس مکان میں آچکی تھی اور اس نے ایک گتے پر اپنا نام لکھ کر بھی مکان کے گلی والے دروازے پر لگا دیا تھا۔ میں نے تعجب سے پوچھا:

"یہ مکان تو میں نے پسند کیا تھا۔"

وہ بڑی بے نیازی سے کہنے لگا، "یار معاف کرنا۔ یہاں میرا بڑا بھائی اچانک آگیا تھا۔ کہنے لگا یہ مکان تو میں نے پرسوں سے الاٹ کروا رکھا ہے اس کے پاس الاٹمنٹ چٹ بھی تھی۔ اب تم ہی بتاؤ میں کیا کرتا۔ چلو تمہارے لیے کوئی دوسرا مکان تلاش کرتے ہیں۔"

سنت نگر والا ایک مکان مجھے آج بھی یاد ہے۔

یہ شاید کسی سکھ پروفیسر کا مکان تھا۔ یہاں اس کی انگریزی کی کچھ کتابیں اور برصغیر کی مشہور مصورہ امرتا گل کی کچھ پینٹنگز بھی پڑی تھیں۔ میرے ساتھ جو آدمی وہ مکان دیکھنے آیا تھا اسے آرٹ سے خاص دلچسپی تھی۔ اس نے مجھے تصویریں دکھا کر بتایا کہ یہ امرتا شیر گل کی تصویریں ہیں۔ ہر تصویر کے نیچے امرتا شیر گل کا نام بھی لکھا ہوا تھا۔ یہ تصویریں میرا دوست اپنے گھر لے گیا۔ بعد میں ان تصویروں کے ساتھ کیا بیتی مجھے اس کی خبر نہیں۔ کیونکہ اس کے بعد آج تک میں نے اس

شخص کی شکل نہیں دیکھی۔ اب میں اس علاقے میں جاتا ہوں تو وہ مکان کہیں نظر نہیں آتا۔ وہاں آبادی اتنی گنجان ہوگئی ہے کہ وہ مکان ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا۔ کرشن نگر کے چوک میں بھی کوئی رش نہیں ہوتا تھا۔

لوگوں کو دکانیں مکان الاٹ ہو گئے تھے۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جو مشرقی پنجاب میں عالی شان حویلیاں اور کئی مربع اراضی چھوڑ کر آئے تھے اور یہاں تین کمروں والے متروکہ مکان میں آبسے تھے لیکن سب لوگ پاکستان میں آجانے پر بے حد مطمئن اور خوش تھے۔ اس خیال سے کہ انہیں ایک ایسا آزاد اسلامی ملک مل گیا ہے۔ جس کی خاطر انہوں نے ہر قسم کی قربانیاں دیں تھیں اور جہاں وہ اپنے دین اسلام کے اصولوں پر چل کر آزادی سے زندگی بسر کرسکیں گے۔ کرشن نگر کے چوک میں سے ایک کشادہ خالی خالی سڑک اوپر کو جاتی تھی۔ جہاں جا کر یہ سڑک ختم ہو جاتی آگے کھیت شروع ہو جاتے تھے جو دریا تک چلے گئے تھے۔ یہاں روٹ نمبر 1 کا آخری بس اسٹاپ بھی تھا۔ اسی جگہ کچھ عرصہ بعد شاعر حبیب جالب کو ایک مکان الاٹ ہوا جہاں ہم کبھی کبھی اس سے ملنے جایا کرتے تھے۔ ذرا پہلے دائیں جانب ایک گلی میں ناصر کاظمی نے مکان الاٹ کروایا ہوا تھا۔ اس مکان کو جو چھوٹا سا راستہ جاتا اس پر انگور کی بیل نے سایہ ڈال رکھا تھا۔ مگر اس مکان کی شاید دوسری منزل میں کوئی اور صاحب بھی آگئے تھے۔ بعد میں مکان کی الاٹمنٹ کا جھگڑا اچل پڑا جو نہ جانے کب تک چلتا۔ ناصر کاظمی کو اس کی بڑی پریشانی تھی۔ ایک بار اس نے پاک ٹی ہاؤس میں بیٹھے مجھے کہا تھا:

> "مجھے صرف اس بات کی خوشی ہے کہ میرے بچے انگور کی بیل کے نیچے سے گزر کر مکان میں آتے جاتے ہیں۔ اگر یہ مکان مجھ سے چھن گیا تو مجھے اس بات کا بڑا افسوس ہوگا کہ مکان کے ساتھ میں انگور کی بیل سے بھی جدا ہو گیا۔"

مگر خوشی کی بات ہے کہ یہ مکان ناصر کاظمی کے پاس ہی رہا اور اس کے بچے انگور کی بیل کے نیچے سے آتے جاتے ہوئے جوان ہوئے۔

ماڈل ٹاؤن کے متروکہ مکان یا کوٹھیاں دوسری قسم کی تھیں۔

یہ سب قدیم زمانے کی یاد دلاتیں۔ ان کے اردگرد بڑے کشادہ لان تھے جن کے کنارے کنارے آم اور جامن کے گھنے درخت اگے تھے۔ تقریباً ہر کوٹھی کے ساتھ سرونٹ کوارٹرز اور ایک

انیکسی ضرور تھی جہاں مہمان آ کر ٹھہرا کرتے ہوں گے۔ مشرقی پنجاب سے آنے والے بہت کم مہاجروں کا اس طرف دھیان گیا تھا۔ لوگ زیادہ تر درمیانے درجے کے مکانوں کو ہی الاٹ کرواتے۔ کچھ گھرانے ماڈل ٹاؤن میں آباد بھی ہو گئے تھے مگر یہاں کی اکثر کوٹھیاں ابھی الاٹ نہیں ہوئی تھیں اور محکمہ آبادکاری والوں نے ان پر تالے ڈال رکھے تھے۔ ہم کبھی کبھی بس میں بیٹھ کر اس علاقے کی سیر کرنے آجایا کرتے تھے۔ یہ علاقہ اس زمانے میں بے حد خاموش اور پر سکون تھا۔ جب گوالمنڈی اور میکلوڈ روڈ پر سے کبھی کبھار ہی کوئی موٹر تانگہ گزرتا تھا تو آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ تب ماڈل ٹاؤن ایسی دور دراز کی جدید بستی میں خاموشی کا کیا عالم ہو گا۔ ابھی لاہور میں فاصلے کم نہیں ہوئے تھے۔ ابھی سمن آباد بھی آباد نہیں ہوا تھا۔ صرف چند ایک این ٹائپ کوارٹر بنے تھے۔ لوگ کہا کرتے تھے کہ سمن آباد اتنی دور جا کر کون مکان لے۔

ماڈل ٹاؤن کو تو بہت دور دراز کی بستی سمجھا جاتا تھا۔ سوسائٹی کی دو چار بسیں چلتی تھیں۔ بسوں میں سفر کرنے کا لوگوں کو ابھی اتنا رجحان بھی نہیں تھا۔ عام آدمی تانگے میں سفر کرنا زیادہ پسند کرتا تھا۔

مزنگ چونگی پر بھی ٹریفک کا یہ شور اور ہنگامہ بالکل نہیں ہوتا تھا۔ کسی چوک میں ٹریفک کی بتیاں نہیں لگی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی ٹریفک کا سپاہی ادھر ادھر پھرتا نظر آجاتا تھا۔ تانگوں اور سائیکلوں کی ٹریفک اپنے آپ رواں رہتی تھی۔ یہاں سے آگے ماڈل ٹاؤن کی طرف جاتے تو راستے میں اچھرہ کی پرانی بستی آتی جس کے بازار بھی بہت حد تک خالی خالی ہوتے۔ آگے دائیں جانب ایک قبرستان دکھائی دیتا تھا۔ سڑک پر سے ہر قبر اور اس کا کتبہ صاف دکھائی دیتا تھا اور لوگوں کے لیے سامان عبرت مہیا کرتا تھا۔ اب یہ قبریں اونچی اونچی پر شور اور سامان سے بھری ہوئی دکانوں کے پیچھے چھپ گئی ہیں اور خدا جانے ہیں بھی یا نہیں۔ کیونکہ کبھی ادھر جانے کا اتفاق ہی نہیں ہوا۔ آگے نہر کا پل آجاتا تھا۔ میاں میر صاحب والی نہر بڑی خاموشی سے اپنے قدرتی روپ میں بہا کرتی تھی۔ اس کے اوپر پاپولر کے یہ درخت نہیں ہوتے تھے جو آج اس پر سایہ کیے ہوئے ہیں اور اس کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہے ہیں۔ کناروں سے ہٹ کر کچا رستہ تھا جہاں ٹاہلی کے درخت کہیں کہیں خاموش کھڑے دکھائی دیتے تھے۔ نہر کی دوسری جانب قصور جانے والی سڑک اکثر سنسان ملتی۔ کسی وقت کوئی لاری یا بس گزر جاتی اور دور تک جاتی نظر آتی رہتی تھی۔ اب ایک بس گزرتی

ہے تو دوسری ویگن اسے چھپا لیتی ہے۔ تب ایسا نہیں تھا۔ سڑک بھی چھوٹی تھی۔ دونوں جانب کچے راستے سے اتر کر ٹاہلیوں کے درخت دور تک چلے گئے تھے۔ ان درختوں کے نیچے ہری ہری گھاس دھوپ میں اور زیادہ سبز دکھائی دیتی تھی۔ ایک چھوٹی سی ندی یا نالہ بڑی نہر میں سے نکل کر ان درختوں کے ساتھ ساتھ چلا جاتا تھا۔ ابھی نہ گلبرگ والا چوک کہیں نظر آتا تھا اور نہ ریلوے کینٹ والا پل ہی تعمیر ہوا تھا۔

گارڈن ٹاؤن کے چند ایک زرد رنگ کے کوارٹر سڑک پر سے دور ہرے بھرے کھیتوں کے پار دکھائی دیا کرتے تھے۔ یہ تنہا تنہا درختوں میں گھرے ہوئے کوارٹر مجھے بڑے رومانٹک لگتے اور میرا جی چاہتا کہ یہاں آ کر رہنے لگوں اور یہاں بیٹھ کر کہانیاں لکھوں۔ ماڈل ٹاؤن کو ایک چھوٹی سی پکی سڑک گھومتی تھی۔ یہ پرانے زمانے کی بنی ہوئی سڑک تھی۔ کچھ دور آگے جا کر دونوں جانب یوکلپٹس، آم اور جامن کے درختوں میں گھری ہوئی بڑی خوشنما کشادہ باغیچوں والی کوٹھیاں شروع ہو جاتی تھیں۔ یہ کوٹھیاں ابھی بہترین حالت میں تھیں۔ ابھی ان کی دیواروں کا چونا کہیں پر سے بھی نہیں اکھڑا تھا۔ ابھی ان کی کھڑکیاں اور دروازے صحیح سالم تھے۔ آگے جا کر یہ سڑک ایک بہت بڑے گول میدان کے گرداگرد چلی جاتی تھی۔ اس میدان کے گرد ماڈل ٹاؤن کے بلاک تھے۔ درمیانی میدان ویران اور بنجر تھا۔ کہیں کہیں گھاس ضرور نظر آ جاتی تھی۔ یہاں کے بلاکوں کی سایہ دار گلیاں یا چھوٹی سڑکیں گرمیوں میں ٹھنڈی ہوتی تھیں اور یہاں سے جانے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ یہاں دائرہ نما سڑک کے کنارے ایک کوٹھی ضرور جلی ہوئی تھی باقی سب کوٹھیاں بالکل صحیح حالت میں تھیں۔ ہمارے ریڈیو اسٹیشن میں ملازم ایک صاحب کو یہاں کوٹھی الاٹ ہو گئی تھی۔ وہ گرمیوں کے موسم میں اپنی کوٹھی کے باغ کے کچے آم ٹوکرے میں بھر کر لاتے اور ریڈیو اسٹیشن پر لوگوں میں بانٹا کرتے تھے۔ مشہور صحافی ابو سعید بزمی بھی یہاں ایک کوٹھی میں رہتے تھے۔ ان کی کوٹھی کے جامن بے حد میٹھے ہوتے تھے۔ ساون کے دنوں میں ٹوکرے بھر بھر کے جامن اترا کرتے۔ وہ یہ جامن اپنے دوستوں، رشتے داروں اور محلے داروں میں تقسیم کرتے۔ جامن پھر بھی بچ جاتے تھے۔ بعض کوٹھیوں میں یہاں کے پہلے مکینوں نے بڑے قیمتی اور اعلیٰ نسل کے قلمی آم لگوا رکھے تھے۔ جن لوگوں نے ایسی کوٹھیاں الاٹ کروائیں وہ باقاعدہ موسم میں آم کے درختوں کو ٹھیکے پر دینے لگے۔

ماڈل ٹاؤن کی کچھ کوٹھیاں ایسے لوگوں کو الاٹ ہو گئی تھیں یا انہوں نے الاٹ کروالی تھیں کہ جنہیں کوٹھیوں میں رہن سہن کی زندگی کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں تھیں۔ چنانچہ ان کے ہاں عجیب وغریب باتیں دیکھنے کو ملتی تھیں۔ گیراج میں انہوں نے گائے بھینسیں باندھ رکھی تھیں جن کی دیواروں پر پاتھیاں لگائی جاتیں۔ اگر ماڈل ٹاؤن سوسائٹی والے نہ ہوتے تو کچھ لوگ ان کوٹھیوں کے درخت کاٹ کر فروخت کر دیتے۔ مگر سوسائٹی بڑی کارآمد تھی۔ اس کی وجہ سے کچھ مدت تک اس جدید اور خوشنما علاقے کا حسن اپنی جگہ قائم رہا۔ پھر ایسا ہونے لگا کہ اکثر کوٹھیوں میں لوگوں نے دیواریں کھڑی کر کے کوٹھیوں کے پورشن بنا دیے۔ اب اتنے برس گزر جانے کے بعد ماڈل ٹاؤن کا حسن ایک بار پھر ابھرا ہے اور ایل ڈی اے نے وہاں خوشنما پارک باغ وغیرہ لگوا دیے ہیں۔ بلاکوں کے بیچ والے ویران میدان کو بھی ایک خوب صورت سیر گاہ میں تبدیل کر دیا ہے۔ اگرچہ یہاں پہلے زمانے والا سکون اور خاموشی تو نہیں ملتی اور ظاہر ہے مل بھی نہیں سکتی۔ مگر ماڈل ٹاؤن یقیناً پہلے سے زیادہ خوب صورت، سایہ دار اور خوشنما ہو گیا ہے۔ نئے نئے بلاک بن گئے ہیں۔ نئی نئی حسین کوٹھیاں تعمیر ہو گئی ہیں۔ سڑکوں پر روشنیاں ہو گئی ہیں اور رات کو دن کا سماں رہنے لگا ہے۔ انڈیا سے بھی جو لوگ اب آتے ہیں وہ ماڈل ٹاؤن کے حسن اور تزئین و آرائش کو دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔

لیکن میں تو ابھی قیام پاکستان کے آغاز کے زمانے کا ذکر کر رہا ہوں۔ اب تو لاہور کی آبادی اتنی پھیل گئی ہے کہ گلبرگ، سمن آباد اور ماڈل ٹاؤن شہر کا حصہ بن گئے ہیں۔ کبھی کوٹ لکھپت کا نام سن کر لوگ کانوں کو ہاتھ لگا کر کہتے کہ کون جائے اتنی دور۔ مگر اب کوٹ لکھپت کے لوگ دن میں چھ چھ پھیرے لگا لیتے ہیں۔ فاصلے واقعی سمٹ گئے ہیں۔ مگر پہلے یہ فاصلے اتنے قریب نہیں تھے۔ لوگوں کو بادامی باغ بڑا دور لگتا تھا اور ٹرین میں بیٹھ کر وہاں جاتے تھے۔ دریائے راوی بھی اس زمانے میں ایسا نہیں تھا جیسا کہ اب ہے۔ پل پر سے ایک کچی سی گھاٹی نیچے دریا کے کنارے اترتی تھی جہاں دو تین پرانی طرز کی کشتیاں یا بیڑے کھڑے رہتے۔ کنارے کنارے ٹاہلیوں کے ذخیرے ہوتے تھے۔ راوی روڈ بالکل سیدھی اور صاف ستھری سڑک تھی۔ ہم ہوزری کے کارخانے کے سامنے سے ذخیرے میں داخل ہو جایا کرتے اور پھر درختوں میں سے ہوتے ہوئے دریا پر پہنچ جاتے۔ درختوں کے درمیان سے نظر آتا دریا ہمیں بڑا اچھا لگتا تھا۔ شاہدرے کی جانب نور جہاں

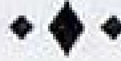
کے مقبرے کو جو کچا راستہ جاتا تھا وہاں دونوں جانب کھجور کے درخت ہوتے تھے۔ شروع شروع کی پنجابی فلموں کی آؤٹ ڈور شوٹنگ یہاں پر ہی ہوتی تھی اور یہ راستہ قریب قریب ہر پنجابی فلم میں دکھائی دیتا تھا۔ یہاں سے کبھی ہیروئن دردبھرا گیت گاتی گزرتی یا ولین گھوڑا دوڑاتا گزر جاتا۔

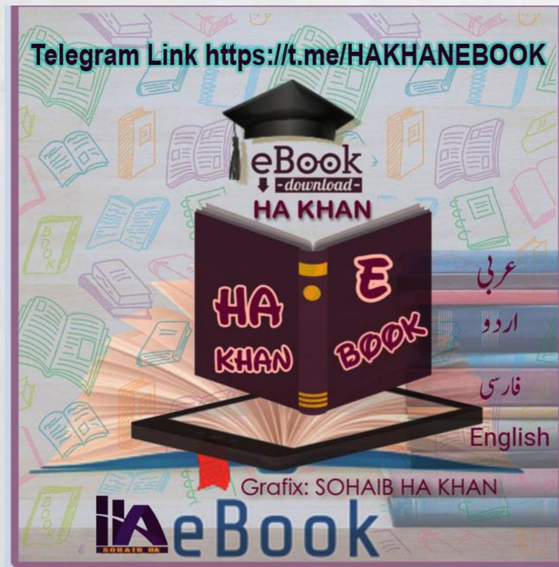
دریائے راوی کے اس طرف بھی کچھ متروکہ مکانات واقع تھے جن کے بارے میں میری معلومات اتنی وسیع نہیں ہیں۔ بچپن میں، میں نے ان آبادیوں کی گلیوں سے ہندو عورتوں کو اشنان کے لیے دریا پر جاتے ضرور دیکھا ہے مگر یہ سب کچھ مجھے خواب کی طرح یاد ہے۔ یہ اتنی واضح یادیں نہیں ہیں۔ دریا کے بھی صرف دو پل تھے۔ ایک پر سے ریل گاڑی اور دوسرے پر سے لوگ اور لاریاں گڈے گزرتے تھے۔ پل پر سے ریل گاڑی چھک چھک کرتی گزرتی مجھے بڑی اچھی لگتی۔ راوی روڈ پر زیادہ تر عمارتی لکڑی کی دکانیں تھیں۔ پہلو میں جو قلعہ گجھمن سنگھ کی جو پرانی بستی تھی وہاں لوگ آباد ضرور ہوئے تھے مگر ابھی کوئی نئی سڑک یا نیا مکان وہاں تعمیر نہیں ہوا تھا۔ بڈھے دریا کے پرانے پل کے نیچے بڈھا دریا ایک گندے نالے کی طرح بہتا تھا۔ اس کے کنارے کنارے خانہ بدوشوں کی جھونپڑیاں ہوتی تھیں۔ منٹو پارک میں صرف ایک اکھاڑہ تھا جہاں دنگل ہوا کرتے تھے۔ جمعے کے جمعے لاہور کے زندہ دل یہاں پتنگوں کے مقابلے کرتے تھے۔ بادامی باغ کے پیچھے کیلنڈرنگ کے نئے نئے چند ایک چھوٹے چھوٹے کارخانے قائم ہوئے ہی تھے۔ یہاں کپڑے کے تھانوں پر مایا لگا کر انہیں مشینوں سے پریس کیا جاتا تھا جس کو کیلنڈرنگ کہتے ہیں۔ مشہور فلم ڈائریکٹر اور میرے دوست حسن طارق کے ایک رشتہ دار کا یہاں کیلنڈرنگ کا کارخانہ تھا۔ میں مصری شاہ سے نکل کر صرف حسن طارق سے ملنے یہاں آتا تو وہ باہر تخت پر بیٹھا، لوگوں سے کپڑے کے تھان وصول کر کے انہیں پرچیاں کاٹ کاٹ کر دے رہا ہوتا۔ میں اسے جاتے ہی کہتا۔ چلو پاک ٹی ہاؤس چلتے ہیں۔ مگر حسن طارق شروع ہی سے بڑا ذمے دار لڑکا تھا۔ وہ مسکرا کر کہتا ''یار یہاں کام ختم کرلوں۔'' ہم تھوڑی دیر کے لیے وہیں کسی چائے کی دکان میں جا کر چائے پی لیتے۔

ابھی بادامی باغ کے لاری اڈوں پر انتشار نہیں شروع ہوا تھا۔ لوگ بڑے آرام سے لاریوں پر سوار ہوتے اور بڑی حفاظت سے سفر کرتے تھے۔ ابھی لاہور میں کلاشنکوف کا فائر کسی نے نہیں سنا تھا۔ کبھی کسی لاری پر ڈاکہ نہیں پڑا تھا۔ لوگ ایک دوسرے سے پیار کرتے تھے۔

اختلافات کی باتیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ آپس میں اختلافات اگر تھے بھی تو وہ ذاتی یا معمولی سیاسی نوعیت کے تھے۔ اجتماعی طور پر ہر کوئی پاکستان کی ترقی وخوشحالی کے لیے محنت اور دیانتداری سے کام کرنے میں مصروف تھا۔ دلوں میں دولت کی ہوس نہ تھی۔ بلکہ پاکستان کو ترقی یافتہ ممالک کی صف اول میں لے آنے کی لگن تھی۔

میں دعا کے ساتھ اس باب کو بند کرتا ہوں کہ کاش ہمارے اندر وہی اپنی پہلی نسل والا اتحاد، ضبط، تنظیم اور یقین پیدا ہو جائے اور ہم اپنے ملک پاکستان کی ترقی وخوشحالی کے لیے اپنے تمام تر فروعی اختلافات کو بھلا کر کام کرنے لگیں۔





لاہور......باغوں کا شہر

لاہور کو باغوں کا شہر کہا جاتا تھا۔

لاہور آج بھی باغوں کا شہر ہی ہے۔ اگرچہ اس شہر میں قیام پاکستان سے لے کر اب تک کچھ نئی قسم کے جاپانی باغ بھی تعمیر ہوئے ہیں لیکن بہت سے پرانے باغ غائب بھی ہو گئے ہیں۔ ان میں کچھ ایسے باغ بھی تھے جن سے لاہور کی شناخت ہوتی تھی۔ جاپانی باغ تو دنیا کے ہر شہر میں مل جائیں گے مگر جو باغ لاہور میں تھے وہ صرف لاہور ہی میں پائے جاتے تھے۔ میں اپنی بات پاکستان کے قیام کے وقت سے شروع کروں گا۔

سب سے پہلے میں اس باغ کا ذکر کروں گا جو اب کہیں دکھائی نہیں دیتا اور جس مقام پر یہ باغ ہوا کرتا تھا اب وہاں سے سیالکوٹ جانے والی بسیں اور ویگنیں گزرتی ہیں۔ یہ بادامی باغ اور شاہدرہ کے درمیان ایک تکون کی شکل میں دریائے راوی کے قریب ہی واقع تھا۔ جب پاکستان بنا تو اس باغ میں مولسری کا ایک درخت ہوا کرتا تھا۔ اب مولسری کا درخت اگر آپ مالی ساتھ لے کر بھی تلاش کریں تو لاہور کے کسی باغ میں نہیں ملے گا۔ اس درخت کا تنا بالکل سیدھا کئی منزل بلند تھا اور اوپر درخت کی شاخوں کا گھنا چھتنار بنا ہوا تھا۔ بہار کے موسم میں ہوا کے جھونکوں کے ساتھ شاخوں پر سے مولسری کے سفید سفید پھول گرا کرتے تھے۔ ان چھوٹے چھوٹے پھولوں کے گراری کی طرح کنارے نکلے ہوتے اور درمیان میں سوراخ ہوتا تھا۔ مولسری کی خوشبو بڑی گہری اور میٹھی تھی۔ لوگ شام کو بھاٹی لوہاری کے باہر اس کے گجرے بیچا کرتے۔ اس کے ہار بہت ہی کم بناتے۔ زیادہ تر اس کے گجرے ہی تیار کیے جاتے تھے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہ واحد پھول تھا جو اگر باسی ہو کر زرد ہو جاتا تو اس کے باسی پھولوں کے بھی گجرے لوگ خاص طور پر خواتین بڑے شوق سے خریدتی تھیں۔ اب کسی پھلیرے سے مولسری کی بات کریں تو وہ تعجب سے ہمارا منہ تکنے لگتا ہے۔ کیونکہ مولسری کا درخت تقریباً لاہور کے باغوں میں ناپید ہو چکا ہے۔ اگر زولوجیکل گارڈن میں نمونے کے طور پر لگا ہو تو یہ الگ بات ہے۔ جس طرح لارنس باغ کے اندر

گورنمنٹ کالج کے زوالوجی ڈیپارٹمنٹ کے واسطے جو درخت پودے لگائے ہیں وہاں کم یاب درخت بھی کہیں نہ کہیں کھڑے دکھائی دے جاتے ہیں۔

بادامی باغ اور شاہدرہ کے درمیان والے باغ میں مولسری کے علاوہ آم اور ناشپاتی کے درخت بھی لگے تھے۔ان درختوں پر پھول آتے تو کوئی انہیں نہیں توڑتا تھا۔کیونکہ ناشپاتی کے پھولوں کی جگہ ہی پھل لگتا ہے۔درمیان میں گھاس کا قطعہ تھا جہاں مسافر لوگ دن میں تیز دھوپ سے بچنے کے لیے درختوں کی چھاؤں میں آرام کرتے۔رات کو ٹھنڈی ہوامیں مزدور پیشہ لوگ سو بھی جاتے تھے۔کوئی چوکیدار انہیں منع نہیں کرتا تھا۔اس دخل اندازی کے باوجود اس باغ کا حسن قائم تھا اور اس کا وجود بھی باقی تھا۔

ایک چھوٹی سی پتلی سڑک جس پر پتلی پتلی ٹاہلیوں کا سایہ تھا،اس مختصر سے تکونی باغ کے قریب سے ہو کر مقبرہ جہانگیر کی طرف جاتی تھی۔میں نے اس سڑک پر شاذ و نادر ہی کسی کو جاتے دیکھا تھا۔تکونی باغ میں پانی دریا سے نکالی گئی ایک چھوٹی سی نہر کے سوئے کی وساطت سے آیا کرتا۔یہ چھوٹا سا سوا یعنی چھوٹا سا نالہ آم کے درختوں کے درمیان سے گزرتا تھا۔چیت بیسا کھ کے بہار افروز دنوں میں جب آموں پر بور آتا تو ساری فضا اس کی دھیمی دھیمی میٹھی خوشبو سے مہک جاتی۔آم کا بور جھڑ جھڑ کر نہر کے پانی میں گرتا رہتا۔ہمارا اس طرف جانا کم ہوتا تھا اور میں کبھی کبھی ہی اس باغ میں جایا کرتا۔ایک بار گیا تو باغ میں بلڈوزر چل رہے تھے۔معلوم ہوا کہ وہاں سے ایک سڑک نکالی جا رہی ہے۔

لاہور کا سرکلر باغ

اب میں لاہور شہر کی فصیل کے گرداگرد پھیلے ہوئے باغ کی طرف آتا ہوں۔یہ باغ مغلیہ عہد میں بنایا گیا تھا۔انگریزوں کے زمانے میں بھی اس کی کافی دیکھ بھال ہوتی رہی۔مجھے یاد ہے جب ہم چھوٹے تھے اور امرتسر سے لاہور آتے تو مستی دروازے کے باہر جو مسجد ہے وہاں تک یہ باغ سرسبز شاداب ہوتا تھا۔دروازے کو چھوڑ کر قلعے کی دیوار سے پھر شروع ہو جاتا۔اگرچہ یہاں وہ کیاریاں اور پھولوں بھرے قطعے نہیں تھے۔مگر گھاس کے قطعات ٹکسالی دروازے تک چلے گئے تھے۔ٹکسالی سے آگے تو یہ باغ کافی کشادہ ہو جاتا اور یہاں ایک مقام پر اونچی گارڈینیا کی

دیواریں بنا دی گئی تھیں جہاں عید کے بعد عورتوں کا میلہ لگتا تھا۔ یہاں سے بھاٹی اور بھاٹی دروازے سے موچی دروازے تک اس سرکلر باغ میں دائیں بائیں گھنے درختوں کے درمیان نرسریاں بھی تھیں اور گلاب گیندے کے پھولوں سے بھری ہوئی کیاریاں بھی ہوتی تھیں۔ درمیان میں چلنے کے لیے راستہ بنایا گیا تھا جس کے دونوں طرف تاریں لگی تھیں۔ موچی دروازے کے باہر باغ میں ایک خاص قطعہ جلسے کے لیے وقف تھا۔

آگے یہ سرکلر باغ اکبری دروازے سے شاہ محمد غوث کے مزار پر سے اندر کی طرف خم کھا گیا تھا۔ یہاں مزار شریف کے پاس ہی میونسپل کمیٹی کی شاید لائبریری ہوا کرتی تھی جہاں لاہور کی ممتاز ادبی اور نیم سیاسی شخصیت جناب آقا بیدار بخت شام کو ادیب فاضل اور ادیب عالم کی کلاسیں لیا کرتے تھے۔ یہاں سے چکر کھاتا ہوا سرکلر باغ دلی دروازے کو پار کر کے یکی دروازے کے باہر سے گزرتا ہوا کشمیری اور شیرانوالہ دروازے کی طرف نکل جاتا تھا۔ قیام پاکستان کے وقت کچھ وقت کے لیے دلی دروازے کے باہر کچھ مہاجرین نے ڈیرے لگائے تھے۔ لیکن پھر انہیں دوسرے باقاعدہ کیمپوں میں منتقل کر دیا گیا تا کہ سرکلر باغ کا حسن مجروح نہ ہونے پائے۔ یہ شہر لاہور کی فصیل کے گرد چکر لگانے والا سرکلر باغ اپنی جگہ ایک خاص کشش رکھتا تھا۔ اسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا جیسے کسی نے لاہور شہر کے گلے میں پھولوں بھرے باغ کا ہار ڈال دیا ہے۔ شہر کی فصیل تو اکثر جگہ سے غائب ہو چکی تھی۔ اس باغ میں سے گزرتے ہوئے شہر کے اونچے اونچے مکانوں کے چوبارے، چھجے اور چھتوں کی برجیاں اور کھڑکیوں پر گری ہوئی چقیں دکھائی دیتی تھیں جو بڑی اچھی لگتی تھیں۔

یکی دروازے سے مستی گیٹ کی طرف چلیں تو شہر کی فصیل کا کچھ حصہ نظر آتا تھا۔ یہاں مکانوں کی کرسی بہت اونچی تھی اور مکان بڑی بلندی پر بنے ہوئے لگتے۔ فصیل شہر اور لاہور کے سرکلر باغ کے درمیان جو نالہ بہتا تھا اس کو درختوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ جن دنوں میں مصری شاہ میں رہتا تھا یعنی سن ۵۰۔۴۹ء کے زمانے میں تو میرا معمول تھا کہ میں مصری شاہ کے ایک موریہ پل سے نکلتے ہی سامنے سرکلر باغ میں داخل ہو جاتا۔ پھر باغوں باغ میں لوہاری دروازے تک مزے مزے سے سفر کرتا، درختوں کو دیکھتا، لوگوں کو وہاں بیٹھے ہیر پڑھتے، قصے کہانیاں سنتے دیکھتا۔ لوہاری دروازے پہنچ کر پھولوں کی دکانوں کے قریب سے باہر نکل آتا اور انارکلی میں داخل

ہو جاتا کیونکہ میری منزل پاک ٹی ہاؤس ہوتی تھی۔ اگر کبھی مکتبہ اردو یا نیا ادارہ کی طرف جانا ہوتا تو لوہاری دروازے والی سڑک پار کر کے موری دروازے والے سرکلر باغ میں داخل ہو جاتا۔ اکھاڑے میں پہلوانوں کو زور کرتے ہوئے دیکھتا ہوا موری دروازے کے اسکول کی لائبریری کے قریب سے ہوتا ہوا سرکلر روڈ پر آ جاتا۔ یہ راستہ بڑا پر سکون اور قسم قسم کے دلچسپ مناظر سے لبریز ہوا کرتا تھا۔

کبھی ایسا ہوتا کہ میں یکی دروازے سے ہی چڑھائی چڑھ کر باغ کی بجائے نالے کے کنارے پر آ جاتا اور یہاں مکانوں کے دروازوں کے آگے سے ہوتا ہوا چل پڑتا۔ یہاں میں لوگوں کو گھر کے باہر طرح طرح کے کام میں مصروف دیکھتا۔ گندے نالے کی موجودگی یا اس کی بو مجھے ہرگز پریشان نہیں کرتی تھی۔ کسی جگہ کوئی لڑکا گائے کے بچھڑے کو نہلا رہا ہوتا، کہیں کوئی بوڑھی عورت مکان کی ڈیوڑھی میں بیٹھی ازار بند بنا رہی ہوتی۔ مجھے ایک اچٹتی نظر میں مکانوں کے نیم روشن کمروں میں صندوق ایک دوسرے کے اوپر نظر آتے۔ دیوار گیروں پر چینی کے پیالے سجے ہوتے۔ کسی مکان کی ڈیوڑھی میں کوئی آدمی لکڑی پر رندہ پھیرتا نظر آتا۔ کہیں نالے کے ساتھ ساتھ ڈوریں لگ رہی ہوتیں۔ کہیں کوئی عورت اپلے تھاپ رہی ہوتی۔ کہیں بیٹھک میں کاریگر بڑی چابکدستی سے جوتے بنا رہے ہوتے۔ ریڈیو پر فلمی گیت کی آواز آ رہی ہوتی۔ یونہی چلتے چلتے میں موچی دروازے کے قریب پہنچ جاتا۔ یہاں ایک مزار کی اونچی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا موچی دروازے کے بازار میں پہنچتا تو ہجوم سے بچنے کے لیے جلدی سے باغ کی دوسری طرف اتر جاتا۔

موچی دروازے سے آگے سرکلر روڈ (باغ) ذرا کشادہ ہو جاتا۔ یہاں مجھے ایک طرف درختوں کی چھاؤں میں اور سردیوں کے موسم میں درختوں سے ہٹ کر دھوپ میں ادھیڑ عمر کے لوگ بیٹھے دکھائی دیتے۔ ان میں سے ایک آدمی ہاتھ میں پنجابی کے کسی قصے کہانی کی کتاب کھولے انہیں بیت پڑھ کر سنا رہا ہوتا۔ کہیں کوئی ہیر گا رہا ہوتا کہیں اسلامی تاریخی ناول کی محفل لگی ہوتی۔ پڑھنے والا بڑے جوش سے مسلمانوں کے لشکر کو کافروں کے قلعے کی طرف بڑھتے بیان کر رہا ہوتا۔ اسلامی لشکر کی بہادری اور شان و شوکت اور لہراتے ہوئے اسلامی پرچموں کو بیان کرتے ہوئے خود اس کی آواز پر جوش ہو جاتی۔ اس کے گلے کی رگیں پھول جاتیں اور وہ کسی وقت بڑے جوش میں آ کر نعرۂ تکبیر بھی بلند کر دیتا۔ کہیں پنجابی کا مشاعرہ ہو رہا ہوتا۔ لوگ دائرے کی شکل میں بیٹھے

ہوتے۔ درمیان میں حقہ رکھا ہوتا، کہیں کہیں چائے کی چینکیں بھی نظر آ جاتیں۔ شاعر اپنا پنجابی کلام سنا رہا ہوتا جسے لوگ بڑی توجہ اور دلچسپی سے سن رہے ہوتے۔ باغ کے کسی پلاٹ میں کچھ لوگ لنگوٹ باندھے چٹائی پر اوندھے پڑے ہوتے اور مالشیے ان کے جسموں پر تیل مل کر مالش کر رہے ہوتے۔ کہیں کان کی میل نکالنے والے کسی کے سر کو دبوچے اس کے کان کو کھرچنے میں مصروف ہوتے۔

اسی باغ میں سے گزرتے ہوئے ایک دفعہ مجھے رسالہ نقوش کے چیف ایڈیٹر ملے تھے۔ بات یہ تھی کہ سعادت حسن منٹو نے اپنی زندگی کا پہلا اور آخری ناول انہیں لکھ کر دیا تھا جو نامکمل تھا۔ منٹو کو پیسوں کی ضرورت تھی وہ نامکمل ناول یہ کہہ کر دے گئے تھے کہ میں بعد میں لکھ دوں گا مگر ان کا انتقال ہو گیا۔

''نقوش'' کے ایڈیٹر صاحب نے مجھ سے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔ پھر مجھ سے فرمائش کی کہ میں منٹو کے غیر مکمل ناول کے اگلے دو چار باب لکھ کر اسے ختم کر دوں تا کہ وہ اسے مکمل شکل میں شائع کر سکیں۔ انہوں نے مجھے اچھی خاصی رقم کی پیش کش بھی کی تھی لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ میں نے انکار کر دیا تھا۔ مجھے یاد ہے میں نے انہیں کہا تھا کہ سعادت حسن منٹو کا انداز ایسا تھا کہ جس کی کم از کم میں نقل بھی نہیں کر سکتا۔ بہتر ہے کہ آپ کسی دوسرے ادیب سے لکھوا لیں۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔

شاہ عالمی دروازے کے باہر مٹی کے رنگین برتن دکانوں پر سجے ہوتے تھے جو مجھے ایسے لگتے جیسے عید کے دن چھوٹے بچے رنگ برنگے کپڑے پہن کر دکان میں آ کر بیٹھ گئے ہوں۔ سرکلر باغ کے لوہاری دروازے والے ٹکڑے میں میونسپل کارپوریشن اسکول کی چھوٹی سی لائبریری ہوا کرتی تھی۔ یہ گول سا کمرہ تھا جس کے برآمدے میں میزوں پر اخبار پڑے ہوتے ہیں۔ یہاں ہفتہ وار ادبی مجلس ہوا کرتی جس میں پاک ٹی ہاؤس کے ادیب بھی شرکت کرتے تھے۔ یونس ادیب ان ادبی جلسوں کی روح رواں تھے۔ ساغر صدیقی بھی ان ادبی مجلسوں میں اکثر اپنا کلام سناتا اور داد وصول کرتا۔

موچی دروازے اور بھاٹی دروازے کے باہر باغ میں عید کے دوسرے دن میلہ لگتا۔ بچے غبارے اڑاتے، باجے بجاتے، پنگوڑے جھولتے۔ کہیں تھمے تلے جا رہے ہوتے۔ کہیں مٹی کے

کھلونے بک رہے ہوتے۔ لوگ صاف ستھرے اجلے کپڑے پہن کر بچوں کو ساتھ لیے میلہ دیکھنے آتے۔ ہر طرف خوشیوں کے رنگ اڑتے دکھائی دیتے۔ ڑو کے اگلے روز بھائی والے پردہ باغ میں عورتوں کا میلہ لگتا۔ ان باغوں کی بڑی نگہداشت کی جاتی تھی۔ چوبیس گھنٹے ہر باغ میں کوئی نہ کوئی مالی سوکھے پتے اٹھاتا، پودوں کی کانٹ چھانٹ کرتا یا گوڈی کرتا نظر آجاتا تھا۔

ناصر باغ

گورنمنٹ کالج کے سامنے والے گول باغ کی اپنی ایک الگ شان تھی۔ آج بھی یہ باغ بڑا خوب صورت ہے اور اس کے قطعوں میں پہلے سے زیادہ پھول لگائے جاتے ہیں۔ مگر ان دنوں اس باغ کی نمایاں خصوصیت اس کی سادگی تھی۔ باغ کے درمیان میں گھاس کا بیضوی میدان ہوتا تھا۔ کنارے کنارے درختوں کی چھاؤں تھی۔ موچی دروازے کی طرح یہ باغ بھی سیاسی جلسوں کے لیے مشہور تھا۔ مگر لوگ باغ کو خراب نہیں کرتے تھے۔ اگلے دن باغ کو پھر سے درست کر دیا جاتا۔ گورنمنٹ کالج کی طرف اس باغ کی نرسری اور دفتر تھا۔ یہاں شہر کی سڑکوں پر چھڑکاؤ کرنے والی گاڑیاں کھڑی رہتی تھیں۔ ایک ٹیوب ویل بھی ہوتا تھا جس کا پانی باغ کو سیراب کرتا تھا۔ یہاں سیڑھیوں کی شکل میں ایک بہت بڑا تکونا چبوترہ ہوا کرتا تھا۔ ان سیڑھیوں پر پھولدار گملے سجے ہوئے ہوتے۔ ہم اس چبوترے پر تصویریں کھنچواتے تھے۔ میری اور حسن طارق کی ایک تصویر اس چبوترے کی یادگار آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ اب یہ چبوترہ مٹا دیا گیا ہے۔ موسم سرما میں یہاں گل داؤدی کی نمائش لگتی تھی۔ شہر کے کونے کونے سے پھولوں کے شوقین لوگ اس نمائش کو دیکھنے آتے تھے۔ لاہور کارپوریشن نے اب اس باغ کو کافی حد تک اپنی مرضی کے مطابق بنا لیا ہے۔ یہاں کارپوریشن کی سرکاری ضیافتیں اور تقریبیں ہوتی ہیں۔ اب یہ باغ پبلک کا بہت کم اور کارپوریشن کا زیادہ ہو چکا ہے۔

شالامار باغ

شالا رمار باغ لاہور کی پہچان ہے۔ شالامار کا نام آتے ہی لاہور یاد آجاتا ہے۔ یہ باغ میلہ چراغاں کی وجہ سے زیادہ مشہور ہے۔ یہ باغبانپورہ سے آگے جی ٹی روڈ پر واقع ہے اور مغل بادشاہوں کی یادگار ہے۔ اس باغ میں داخل ہونے کے لیے ایک بہت بڑے دروازے سے گزرنا

پڑتا ہے۔ اب تو یہ باغ بھی لوگوں سے چھین کر سرکاری ضیافتوں کے لیے وقف کردیا گیا ہے۔ تب یہ باغ لوگوں کے لیے کھلا تھا۔ اس باغ کے تین چار تختے ہیں۔ ان تختوں کے الگ الگ نام ہیں جو مغل بادشاہوں کے زمانے کے رکھے ہوئے ہیں۔ یہاں آم اور جامن کے بے شمار درخت ہیں۔ خوشنما فواروں والے حوض ہیں۔ دیدہ زیب صاف ستھری روشیں ہیں۔ بارہ دریاں ہیں۔ شمالی کونے میں ایک کافی چوڑا پرانا کنواں بھی ہے۔ اس کنویں کے اندر دیوار میں ایک تاریک غار ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ یہاں گرمیوں کی دوپہروں کو شہزادے لوگ آرام کیا کرتے تھے۔ کیونکہ انہیں ہماری طرح ایئر کنڈیشنگ کی سہولتیں نصیب نہیں تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جدید سائنس کے زمانے کی بعض سہولتیں ایسی ہیں کہ جو ہمارے ہاں غریب سے غریب آدمی کو بھی میسر ہیں مگر جس سے مغلیہ عہد کے بادشاہ بھی محروم تھے۔ ٹی وی اور ریڈیو کو چھوڑیں۔ آپ سوئی گیس اور سگریٹ لائٹر کو ہی لے لیں۔ ان چیزوں کا پرانے زمانے کے بادشاہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

شالامار باغ ایک تاریخی باغ ہے اور تب سے لے کر آج تک اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اس باغ کے کچھ درخت مغل بادشاہوں کے زمانے کے ہیں۔ یعنی ان درختوں نے مغل بادشاہوں کا زمانہ دیکھا ہے۔ مگر ایک مالی نے مجھے بتایا تھا کہ یہ بات درست نہیں ہے۔ مغل زمانے کے بیشتر درخت ختم ہوگئے ہیں اور ان کی جگہ نئے درختوں نے لے لی ہے۔ اس باغ کی شہرت اور بہاریں میلہ چراغاں کے دم سے قائم تھیں۔ ہمارے بچپن کے زمانے میں میلہ چراغاں باغ کے اندر بھی لگتا تھا اور باہر بھی لگتا تھا۔ باہر دکانیں سجائی جاتیں۔ آنہ کمپنی تھیٹر والے تھیٹر کے تماشے دکھاتے۔ موت کے کنویں میں موٹر سائیکل کے کرتب ہوتے۔ دور دراز کے شہروں اور دیہات سے دیہاتیوں کی ٹولیاں گاتی بجاتی میلے میں شرکت کے لیے آتیں۔ یہ میلہ باغ کے اندر تین دن تک لگا رہتا۔ باغ کے اندر بھی قتلموں اور مٹھائی کی دکانیں لگتی تھیں۔ لوگ چھولداریاں لگا لیتے اور تین دن وہیں قیام کرتے۔ ایک بار ہم دوستوں نے بھی باغ کے اندر ایک رات جاگ کر گزاری تھی۔ کبھی اس ٹولی کی بولیاں سنتے کبھی دوسری طرف جا کر قوالی سنتے۔ کبھی خود بیٹھ کر پنجابی بولیاں گاتے۔ ہم نے کھانا بھی خود ہی پکایا تھا۔ ہمارے ایک ترقی پسند شاعر دوست نے کہا کہ میں ایسا شاندار حلوہ بنا کر دوں گا کہ آپ لوگ ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ وہ حلوہ آج بھی مجھے

یاد ہے۔ کیونکہ ہم نے اسے پیالیوں میں ڈال کر گرم چائے کی طرح پیا تھا۔

شالا مار باغ کو میلہ ختم ہونے کے بعد صاف ستھرا کر دیا جاتا۔ خزاں کے دنوں میں یہاں آ کر میں درختوں پر سے زرد پتوں کو گرتے دیکھا کرتا۔ درختوں کے نیچے ہری ہری گھاس پر سورج کی آڑھی ترچھی کرنیں پڑتیں تو گھاس کا سبز رنگ روشن ہو جاتا۔ یہ روشنی اور سائے ہر جگہ درختوں کے نیچے دیکھے جاتے تھے اور بڑے خوب صورت لگتے تھے۔ دن کے وقت باغ میں داخل ہونے میں کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ شاید دو پیسے کا ٹکٹ لینا پڑتا تھا جو بعد میں ایک آنہ ہو گیا تھا۔ یہ رقم باغ کی دیکھ بھال پر خرچ کی جاتی تھی۔ بہار کے دنوں میں اس باغ کی خوب صورتی اور شادابی میں اضافہ ہو جاتا۔ جگہ جگہ گیندہ، موتیا، گلاب کے پھول کھلے ہوتے۔ فضا میں سبزے اور پھولوں کی مہک رچی بسی ہوتی۔ یہ شروع شروع کا زمانہ تھا۔ ابھی شالا مار باغ کی دوسری جانب نئی اضافی بستیاں آباد نہیں ہوئی تھیں۔ کہیں کہیں کچے پکے گاؤں ضرور نظر آتے تھے۔ ریلوے پھاٹک کے پار ایک لال کوٹھی تھی جہاں ہمارا دوست تلمیذ حقانی رہتا تھا (وہ آج بھی اسی لال کوٹھی کا مکین ہے)۔ ہم میلہ دیکھنے آتے تو پہلے اس کے ہاں جاتے۔ چائے پیتے، منہ ہاتھ دھو کر تازہ دم ہوتے اور پھر شالا مار باغ میں آ جاتے۔ اس کے بعد وقت کے ساتھ ساتھ باغ پر پابندیاں لگتی گئیں۔ سب سے پہلے میلے کو باغ کی چار دیواری سے باہر نکالا گیا۔ پھر باغ کی دیوار کے باہر دکانیں لگانے سے لوگوں کو منع کر دیا گیا۔ شالا مار باغ کو سرکاری درباری تقریبوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ میلے نے باغ سے بچھڑ کر درگاہ شاہ حسین میں پناہ لے لی۔

اب آپ لاہور کے اس تاریخی شالا مار باغ میں اپنی مرضی سے داخل نہیں ہو سکتے۔ باغ کے درختوں سے ملنے کے لیے آپ کو باقاعدہ اجازت حاصل کرنی پڑتی ہے۔ یہ باغ درختوں کا قید خانہ بن گیا ہے۔ لیکن اس باغ کا حسن اپنی جگہ پر محفوظ ہو گیا ہے کیونکہ زمانہ بدل گیا تھا اور اب لوگ باغ میں بکروں کو ساتھ لے کر آنے لگے تھے اور بکروں کے لیے گھاس اور پھول میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

آیئے اب باغ جناح کی طرف چلتے ہیں۔

باغ جناح

اس باغ کا پہلا نام لارنس باغ ہوتا تھا۔ یہ بھی لاہور کا ایک پرانا اور جدید باغ ہے۔ اس باغ کا ایک اپنا رومان ہے۔ اس میں داخل ہونے کے تین راستے ہیں۔ ایک راستہ چڑیا گھر سے اندر آتا ہے۔ اب یہ راستہ بند کر دیا گیا ہے۔ دوسرا راستہ مال روڈ پر گورنر ہاؤس کے سامنے ہے جس کی دونوں جانب چیڑھ کے درخت کھڑے ہیں۔ چیڑھ کا درخت کوہ مری اور سوات کی پہاڑیوں میں ہوتا ہے۔ مگر یہ درخت لاہور آ کر اداس نہیں ہوئے۔ پہلے روز کی طرح سرسبز و شاداب ہیں۔ تیسرا راستہ لارنس روڈ کی طرف سے باغ میں داخل ہوتا ہے یہاں سے جم خانہ کلب کی طرف جو سڑک جاتی ہے بلکہ باغ کی جو کشادہ روش جاتی ہے اس کے دونوں جانب سنبل کے گرانڈیل دیوہیکل درخت سایہ کیے ہوئے ہیں۔ اب یہ درخت مختصر رہ گئے ہیں۔ کئی درختوں کو کاٹ دیا گیا ہے۔ سنبل کا درخت بڑا گھنا ہوتا ہے اور اس پر بہار کے دنوں میں سرخ پھول آتے ہیں۔ یہ پھول بھی کلیجے کلیجے جتنے ہوتے ہیں۔ شاخ سے ٹوٹ کر اگر آدمی کے ننگے سر پر گریں تو اسے چوٹ لگ سکتی ہے۔ جن پھولوں کی صرف پتیاں ہی جھڑتی ہیں اور جن میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ تیز ہواؤں کا مقابلہ کر سکیں اور جو اپنی ڈالیوں سے نہیں ٹوٹتے تو ان پھولوں کی ڈوڈیوں میں سے گرمیوں کے شروع میں سنبل کی مائی بھوریاں اڑنی شروع ہو جاتی ہیں۔ یہ سنبل ہوتا ہے، آندھیوں میں کچھ اڑ جاتا ہے کچھ سڑکوں پر بچھ جاتا ہے۔ جھاڑیوں میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ بچے اس سنبل کو اکٹھا کر کے گھروں کو لے جاتے ہیں۔ سمن آباد میں کچھ لوگوں نے ناواقفی کی بنا پر اپنے گھروں کے آنگن میں سنبل کے درخت بھی لگا لیے تھے۔ جب ان درختوں نے پر پرزے نکالے اور گنجان ہوتے چلے گئے تو ان کی جڑوں نے پھیل کر زمین کے اندر گٹروں کو جکڑ لیا۔ صحن کو توڑنا اور صحن کی دیواروں کو ٹیڑھا کرنا شروع کر دیا۔ تب لوگ یہ درخت کٹوانے لگے۔ ابھی پچھلے دنوں ہمارے قریب کے ایک مکان میں سنبل کے گرانڈیل درخت کو کٹوا دیا گیا۔ میرے کچن کی جالی دار کھڑکی میں سے اس درخت کی گھنی شاخیں نظر آیا کرتی تھیں اور میں چائے پیتے ہوئے اس درخت کو دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔ وہ درخت بھی کچن کی کھڑکی میں سے مجھے دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔ درخت بھی انسانوں کی طرح محبت کرنے والوں کو پہچان لیتے ہیں۔ انسان پھر بھی دھوکہ

کھا جاتا ہے مگر درخت کبھی دھوکہ نہیں کھاتے۔ جس روز اس درخت کے بازو کاٹے گئے میں کچن میں ہی بیٹھا تھا۔ مجھ سے یہ منظر دیکھا نہ گیا اور میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس درخت کو بھی محض اس لیے کاٹ دیا گیا تھا کہ درخت لگانے والوں کو معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ درخت آنگن اور دیوار کو ٹیڑھا کر دے گا۔ ناسمجھی میں ایک درخت کو پالا گیا، اس کی دیکھ بھال کی گئی اور جب یہ درخت جوان ہوا تو اس کے لگانے والوں نے بڑی بے دردی سے کاٹ کر فروخت کر دیا۔ اس درخت کی مغفرت کی میں کیا دعا مانگوں۔ درختوں کا تو کوئی حساب کتاب ہی نہیں ہوتا۔ لیکن سنا ہے کہ وہ اپنے کاٹنے والوں کا حساب کتاب ضرور رکھتے ہیں۔ واللہ اعلم۔ لیکن یہ سنبل کا درخت مجھے بہت یاد آتا ہے۔ کچن میں چائے پینے بیٹھتا ہوں تو میری نگاہیں اپنے آپ کھڑکی کے باہر اٹھ جاتی ہیں جہاں منڈیر کے اوپر کھلا آسمان دکھائی دیتا ہے۔ کبھی اس کھلے آسمان کے فریم میں سنبل کے درخت کی جوان اور زندگی سے بھرپور شاخیں صبح کی ہوا میں آہستہ آہستہ لہرایا کرتی تھیں اور میری اس سے سلام دعا ہوا کرتی تھی۔ پھر ہم خاموش زبان میں ایک دوسرے کا حال پوچھتے تھے۔ وہ مجھے بہت سی راز کی باتیں بتاتا تھا۔ میں اسے کئی راز کی باتیں بیان کر جاتا تھا۔ وہ میرا راز دار دوست تھا، نہیں رہا۔ مرنے کے بعد اس سے ضرور ملاقات ہوگی۔

بات میں لارنس باغ یا جناح باغ کے سنبل کے درختوں کی کر رہا تھا اور سنبل کے درختوں کے ساتھ ساتھ کہاں نکل گیا۔ سنبل کے درخت باغ جناح کی خاص پہچان ہوا کرتے تھے۔ کچھ درخت لارنس باغ کے گاف روڈ والے دروازے اور سڑک کی جانب بھی لگے ہوئے تھے۔ یہ اتنے بڑے بڑے اور پرانے درخت تھے کہ سڑک پر گرمیوں سردیوں ان کی چھاؤں رہتی تھی۔ کچھ سال پہلے یہ درخت بھی کاٹ دیے گئے کیونکہ یہاں بجلی کے تار لگائے جا رہے تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ باغ جناح کی خوب صورتی اور حسن و زیبائش میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ وہ درخت جو یہاں قیام پاکستان کے وقت لگائے گئے تھے اب وہ بھی بزرگ ہو گئے ہیں اور ان کے سائے کئی روشوں اور سڑکوں پر پھیل گئے ہیں۔ لارنس باغ کی طرف سے یعنی اوپن ایئر والے گیٹ سے باغ جناح میں داخل ہوں تو دائیں بائیں دونوں جانب پام کے درخت بھی بہت بڑے ہو گئے ہیں اور باغ کے حسن میں اضافہ کر رہے ہیں۔ اوپن ایئر کیفے کے پہلو سے ایک سایہ دار کچا رستہ مال روڈ والی گراؤنڈ کو جاتا ہے۔ اس راستے کے آخر میں دائیں طرف ایچی کے درخت

آج بھی اسی شان سے سایہ کناں ہیں۔ان پر بہار کے موسم میں پھل لگتا ہے اور ایلچی کے گچھوں کے بوجھ سے ڈالیاں جھکی ہوئی ہوتی ہیں۔ یہاں ان دنوں میں ایک راکھا جھونپڑی ڈال کر بیٹھ جاتا ہے تاکہ اس قیمتی پھل کو بچایا جاسکے۔ ایلچی بڑا مہنگا پھل ہے۔ ہم ایسے محنت کش لوگوں کو اگر ڈاکٹر حکیم بھی یہ پھل کھانے کو کہے تو ہم دو تین بار سوچتے ہیں کہ کیوں نہ پھل کھائے بغیر ہی کچھ روز مزید بیمار رہ کر گزارا کر لیا جائے۔لیکن اس موسم میں کچھ غریبانہ قسم کی ملاوٹی ایلچیاں بھی بازار میں آ گئی تھیں۔اور مجھے یقین ہے کہ اب وہ آتی ہی رہیں گی۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ ایلچیوں کو سرخ رنگ کر دیا جاتا تھا تاکہ وہ پکی ہوئی لگیں۔اب جو ایلچیاں مارکیٹ میں آئیں وہ کھٹی اور سخت تھیں۔ایک بھیدی نے مجھے بتایا کہ ان کی پیوند کاری کی گئی ہے۔اس طرح سے پھل میں ملاوٹ ہو گئی ہے۔اور وہ زیادہ پیدا ہونے لگا ہے۔مگر ریڑھی والے اسے باقاعدہ مہنگے داموں بیچتے رہے۔

ہمارے ہاں جوہر قابل کی کوئی کمی نہیں۔ہم نقلی مال تیار کرنے میں اور ملاوٹ کرنے میں بھی اسی جوہر قابل سے کام لیتے ہیں۔موسمیاں، مالٹے اور فروٹر سے مہنگی بکتی ہیں۔ہم نے یہ کیا کہ موسمیوں کے بوٹوں کو فروٹر اور مالٹوں کی پیوند کاری کر دی۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ موسمیوں کے باہر چھلکے کی دھاریاں تو ویسی ہی رہیں گی مگر اندر سے ذائقہ فروٹر اور مالٹوں کا ہو گیا۔اور وہ بڑی تیزی سے پیدا ہونے لگیں۔چنانچہ آج کل ایسی موسمیاں بھی بازار میں عام ملتی ہیں جن کا ذائقہ مالٹوں اور فروٹر ایسا ہوتا ہے جو باہر سے موسمی ہی لگتی ہے۔مگر اندر سے موسمی نہیں ہوتی۔مگر بکتی موسمی کے بھاؤ ہی ہے۔

میں باغ جناح کی ایلچیوں کی بات کر رہا تھا۔یہ لفظ بھی شاید چینی زبان کا ہے۔ہوسکتا ہے یہ پھل بھی چین ہی سے آیا ہو۔اسے لکھتے ہوئے دقت ہو رہی ہے۔اگرچہ بولنے اور سننے میں یہ نام بڑا میوزیکل لگتا ہے۔باغ جناح میں گئے بہت مدت ہو گئی ہے۔جی چاہتا ہے پھل کے موسم میں جا کر ایلچی کے ان درختوں کو دیکھوں کہ کس حال میں ہیں خالص ہیں یا ان کی بھی پیوند کاری ہو گئی ہے۔

لاہور کے پرانے باغوں میں یہی قابل ذکر باغ تھے۔ویسے تو اب لاہور میں کئی نئے باغ بن گئے ہیں جن میں ریس کورس گراؤنڈ کا باغ بہت ہی دیدہ زیب ہے۔پھر جلو پارک کا باغ ہے۔ان کے علاوہ گلشن اقبال اور علامہ اقبال ٹاؤن کے باغات بھی ہیں جو باغ کم اور پارک زیادہ ہیں۔

پہلے باغ اس طرح بنائے جاتے تھے کہ ان میں پھولدار کیاریوں اور پھولدار درختوں کا خاص طور پر اہتمام کیا جاتا تھا۔ نیم، مولسری، برگد اور زیتون کے درخت لگائے جاتے تھے۔ یہ وہ درخت ہیں جو برسوں میں جوان ہوتے ہیں لیکن اب کسی کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ وہ درخت کے سامنے بیٹھ کر اس کے جوان ہونے کا انتظار کرے۔ چنانچہ یوکلپٹس اور پاپولر کے درخت آ گئے جو چار پانچ سالوں میں جوان ہو جاتے ہیں۔ اصلی یوکلپٹس اب خال خال ہی دکھائی دیتا ہے۔ یہ سب پیوندکاری والے یوکلپٹس ہیں جو دنوں میں بڑھنے لگتے ہیں۔ جب پورے درخت بن جاتے ہیں تو ان کے تنوں کی چھال بڑی بدرنگ ہو جاتی ہے۔ اصلی یوکلپٹس کے درخت کی چھال جب اترتی ہے تو نیچے سے ہلکے زیتونی رنگ کا صاف شفاف تنا اور ٹہنیاں نکلتی ہیں جبکہ ملاوٹی یوکلپٹس کی چھال اترتی ہے تو نیچے کی سیاہی مائل تنا نظر آنے لگتا ہے۔ اصل اصل ہے، نقل نقل ہے۔ اصلی یوکلپٹس کے دو درخت آج بھی چیئرنگ کراس میں شاہ دین بلڈنگ کے سامنے فٹ پاتھ کے کنارے کھڑے پرانے دنوں کی یادوں میں گم نظر آتے ہیں۔ یہاں کبھی تین چار یوکلپٹس کے درخت ساتھ ساتھ دوستوں کی طرح اگے ہوتے تھے۔ اب شاید صرف دو یا ایک ہی درخت رہ گیا ہے۔ کتنے دن رہ لے گا۔

چوبرجی باغ

لاہور میں کچھ باغ ایسے بھی ہیں جو کبھی کسی زمانے میں ہوتے ہوں گے مگر اب نہیں ہیں۔ مثلاً باغ گل بیگم۔ اس کا ہم نے نام ہی سنا ہے اس کو دیکھا کسی نے نہیں۔ اس باغ کی جگہ اب مکان اور گلیاں آباد ہیں۔ کہتے ہیں کسی زمانے میں یہاں بڑا خوب صورت مغلیہ طرز کا باغ ہوا کرتا تھا۔ مگر شاید یہ سکھوں کے زمانے کی بات ہو۔ اب تو اس کا صرف نام ہی باقی رہ گیا ہے۔ لاہور کی تاریخ میں لکھا ہے کہ ایک باغ چوبرجی بھی ہوا کرتا تھا۔ یعنی جہاں اب چوبرجی اور اس کے پیچھے راج گڑھ کا علاقہ ہے۔ یہ سارے کا سارا کسی زمانے میں باغ میں ہوتا تھا۔ چوبرجی سے اس باغ کو راستہ جاتا تھا۔ یہاں شاہی محل کی بیگمات سیر کرنے آیا کرتی تھیں اور اس کے گرداگرد چار دیواری ہوتی تھی۔ لیکن وقت نے یہ باغ بھی لاہور سے چھین لیا۔ اب چاروں طرف مکان اور گلیاں بازار نظر آتے ہیں۔ جہاں دن بھر ٹریفک کا شور بلند ہوتا رہتا ہے۔ چوبرجی کو دیکھ کر کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا کہ ایک زمانہ تھا جب یہاں سرسبز باغ کے قطعے تھے جن میں پھول مسکراتے

تھے۔ چھوٹی چھوٹی نہریں جاری تھیں۔ بارہ دریوں کے تالابوں میں چاندی کے فوارے چھوٹتے تھے اور ساون کے مہینے میں آم کے جھنڈوں پر کوئلیں بولتی تھیں۔ اب تو لاہور میں کوئل کی آواز صرف ٹیلی ویژن کے کسی ڈرامے میں ہی سنائی دیتی ہے۔

شادباغ

ایک نام شاد باغ کا بھی ہے۔ یہ بستی جب آباد ہوئی تب بھی یہاں کوئی باغ نہیں تھا۔ چاروں طرف کھیت ہی کھیت تھے۔ درمیان میں ایک دائرے کی شکل میں کچھ کوارٹر پڑ گئے تھے۔ پھر یہ آبادی بھی پھیلتی چلی گئی۔ باغ یہاں کہاں ہوگا۔ ٹریفک اتنی ہوتی ہے کہ جن کوٹھیوں یا مکانوں کے آگے کچھ پیڑ پودے لگے بھی ہیں ان پر بھی اتنی گرد جم جاتی ہے کہ شاید پٹرول سے بھی صاف نہ ہو۔ قیام پاکستان کے وقت لاہور کے گردونواح میں پھلدار باغ بھی بہت ہوا کرتے تھے۔ آم، امرود، آلوچہ، لوکاٹ اور ناشپاتیوں کے باغ۔ اب یہ باغ بھی شہر کے گرد وغبار اور شور سے گھبرا کر دریا پار بھاگ گئے ہیں۔ وہ باغ بھی اب کہیں دکھائی نہیں دیتے جن میں جھولے پڑا کرتے تھے۔

چراغ حسن حسرت کا لکھا ہوا پنجابی ماہیا یاد آ رہا ہے:

باغوں میں پڑے جھولے
تم بھول گئے ہم کو!!
ہم تم کو نہیں بھولے



لاہور کے خوابیدہ تاریخی باغ

باغات کے شہر لاہور کا تذکرہ نامکمل رہ جاتا ہے اگر اس کے ان تاریخی باغوں کا ذکر نہ کیا جائے جو یا تو کھنڈر بن گئے ہیں اور یا تاریخ کے صفحات میں گم ہیں۔ منشی محمد دین فوق اخبار ''کشمیری'' لاہور کے مدیر تھے۔ انہوں نے کئی تاریخی کتابیں بھی تحقیق کے بعد لکھیں، اور مرتب کیں۔ ''ماثر لاہور'' فوق صاحب کی زندگی کا آخری کارنامہ ہے۔ لاہور ہی کے ایک ممتاز اہل قلم اور ''حیات اقبال کی گمشدہ کڑیاں'' ایسی بے مثال کتاب کے مولف و مصنف جناب محمد عبداللہ قریشی بی اے نے انتہائی کاوش اور جاں سوزی کے بعد فوق صاحب کی اس کتاب کو مدون کیا۔ اس کے ٹکڑوں کو جوڑا اور جن عنوانوں کے تحت محمد دین فوق کسی وجہ سے لکھنا چھوڑ گئے تھے ان پر خود لکھا۔ مفید حواشی لکھے۔ جہاں جہاں اضافے کی ضرورت تھی اضافہ بھی کیا۔ عبداللہ قریشی صاحب کی یہ تاریخی تالیف میری نظر سے گزری تو ضروری خیال کیا کہ اس میں سے کچھ اقتباسات قند مکرر کے طور پر میں قارئین کو پیش کروں تا کہ لاہور کے باغات کا ذکر بھی مکمل ہو جائے۔ اپنے کرم فرما محمد عبداللہ قریشی صاحب کے بے حد شکریے کے ساتھ میں یہاں ان کی مدون کردہ محمد دین فوق کشمیری کی کتاب کے کچھ ٹکڑے پیش کر رہا ہوں۔ یہاں صرف لاہور کے تاریخی باغات کا ہی ذکر کیا جائے گا۔

بادامی باغ

خان بہادر سید محمد لطیف تاریخ لاہور میں لکھتے ہیں:

''جس جگہ کا نام اب بادامی باغ ہے یہ جگہ ایام قدیم میں شہزادی گل بادام کے نام سے مشہور تھی جس کا مزار مستی دروازے اور شیرانوالہ دروازہ (قدیم خضری دروازہ) کے درمیاں واقع تھا۔ اس مزار پر سنگ مرمر کا بیش قیمت کتبہ لگا تھا۔ سکھ سہ حاکمان لاہور کے زمانے میں یہ عالی شان مقبرہ اور اس کا ملحقہ باغ تباہ و برباد ہو گیا۔''

اس تباہی و بربادی کے باوجود اس شہزادی کے نام میں کچھ ایسی جاذبیت تھی کہ وہ جگہ اسی کے نام سے بادامی باغ مشہور ہوگئی۔ رنجیت سنگھ نے اپنے عہد میں جو سہ حاکمان لاہور کے زمانے سے بدرجہا بہتر اور غنیمت تھا، اس باغ کو دوبارہ رونق دی اور امرود، نارنگی، انار، آم، جامن اور ناشپاتی کے ثمر دار درختوں کے علاوہ باداموں کے بوٹے بھی کثرت سے لگائے۔ رنجیت سنگھ کے حکم سے بادامی باغ کو خیابانوں میں تقسیم کر کے وسط میں ایک عارضی بنگلہ بنایا گیا۔ موزوں مقامات پر آبشار بنائے گئے۔ ہر خیابان میں پانچ پانچ فوارے لگائے گئے جن میں پانی کی جگہ عطر اچھلتا تھا۔

پھاگن کی ۲۹ تاریخ تھی کہ صبح کے نو بجے قلعے سے توپوں کی آواز بلند ہوئی۔ رسالے اور پلٹنیں، زرق برق وردیوں میں ملبوس، باجہ نوازوں کی معیت میں اس سڑک پر سے گزرنے لگیں جو بادشاہی مسجد سے باغ کے عارضی بنگلے تک بنائی گئی تھی۔ رنجیت سنگھ چھ گھوڑوں کی بگھی پر سوار اپنے مہمانوں کے ساتھ بادامی باغ میں داخل ہوا اور سنگ مرمر کے فرش پر طلائی کرسیاں موجود تھیں، سب بیٹھ گئے۔ نغمہ سرائیوں کے بعد اور ارکین سلطنت کے تعارف کے بعد یہ جلسہ ختم ہوا۔ خالصہ اخبار لاہور کی ۷ مئی ۱۹۱۸ء کی اشاعت میں درج ہے کہ اس تقریب پر اس قدر عطر خرچ ہوا کہ پانچ سال تک بادامی باغ کی مٹی سے عطر کی خوشبو آتی رہی۔ ۱۸۶۰ء میں اس باغ کا نام کمپنی باغ رکھا گیا اور اس کے مہتمم لاہور کے سب سے بڑے انگریزی اخبار ''کرانیکل'' کے ایڈیٹر مسٹر ہنری کوپ قرار پائے۔ چونکہ یہ باغ شہر سے بالکل متصل تھا اور انگریزوں کی آمد و رفت یہاں بکثرت ہوتی تھی اس لیے انگریزوں نے دیسی لوگوں سے قدرے فاصلے پر رہنے کی خاطر اس باغ کو فروخت کر کے اس کے بدلے میں لارنس گارڈن تعمیر کر لیا، جس سے بادامی باغ کی عظمت و خصوصیت جاتی رہی۔ یہاں تک کہ جھاڑ جھنکار اگ آئے اور بادامی باغ جنگل کا نمونہ بن گیا۔

۱۸۵۹ء میں ریل گاڑی کے اجرا کے لیے ریل کے کارخانوں کی ابتدا ہوئی۔

۱۸۶۰ء میں پہلی مرتبہ لاہور سے امرتسر تک گاڑی چلی۔

۱۸۸۰ء یا اس کے لگ بھگ لاہور سے وزیر آباد تک ریلوے لائن بنی جس سے بادامی باغ کی بہت سی زمین ریلوے لائن اور اسٹیشن کے احاطے میں آگئی۔ تقریباً ساٹھ سال کا عرصہ ہوا کہ ریلوے لائن کے پار باداموں کے چند درخت موجود تھے۔ اب نہ گل بادام ہے نہ اس کا مزار اور نہ

کوئی باغ۔ یہاں لوہے کے کارخانے اور رہائشی مکان بن چکے ہیں۔

حضوری باغ

یہ باغ رنجیت سنگھ نے اس وقت بنوایا جب اس نے کابل کے بدنصیب حکمران شاہ شجاع سے کوہ نور ہیرا چھیننے کے بعد لاہور میں ایک جشن عام منعقد کیا تھا۔ اس جشن کے موقع پر مہاراجہ رنجیت سنگھ نے حکم دیا کہ لاہور کے قلعے اور بادشاہی مسجد کے درمیان جو وسیع چبوترہ اور کھلا میدان موجود ہے اس میں ایک باغ لگایا جائے۔ حکم کی فوراً تعمیل کی گئی۔ ۱۸۱۳ء میں فقیر عزیز الدین کی نگرانی میں یہ باغ تعمیر ہوا۔ اس کا نام حضوری باغ رکھا گیا۔ باغ کی بارہ دری کی تعمیر کے لیے مقبرہ زیب النسا (نواں کوٹ) مقبرہ شاہ شرف (بھاٹی دروازہ) مقبرہ نور جہاں اور مقبرہ جہانگیر وغیرہ سے سنگ مرمر اکھڑوا کر لایا گیا اور دو سال کے عرصے میں اس باغ کی بارہ دری اور فوارے وغیرہ درست ہو گئے۔

حضوری باغ کی بارہ دری سہ منزلہ ہے۔ نیچے تہہ خانہ ہے۔ سیڑھیوں کے آگے ڈیوڑھی ہے۔ حضوری باغ کے جنوب مشرق میں ایک گلاب خانہ بھی تھا۔ رنجیت سنگھ کے زمانے میں جو باغ فوارے اور حوض بارہ دری کے گرد بنائے گئے تھے وہ ایک سو سال کے عرصے میں نہ صرف مٹی میں دب گئے بلکہ بارہ دری کی دو تین سیڑھیاں بھی زمین نے نگل لیں۔ یہاں تک کہ لاہور کے لوگ بھول گئے کہ یہاں کوئی فوارہ بھی ہوتا تھا۔ لارڈ مارڈ نگ کے عہد میں یہ باغ دوبارہ اپنی اصلی حالت میں آیا۔ آج حضوری باغ کی رونق سہ چند ہے۔ عیدین کے موقع پر یہاں بہت رونق ہوتی ہے۔ باغ کے سامنے بادشاہی مسجد کی سیڑھیوں میں ایک طرف علامہ اقبال کا مزار ہے۔

باغ موراں والا

موراں لاہور کی ایک مشہور طوائف تھی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کو موراں کا گانا بہت پسند تھا اور وہ اکثر اس کا گانا سننے اس کے مکان پر آیا کرتا تھا۔ موراں کا عروج اس وجہ سے بھی زیادہ ہو گیا کہ مہاراجہ کے حکم سے موراں شاہی گز، موراں شاہی باٹ اور موراں شاہی سکے تیار ہوئے۔ مہر محکم دین جس نے مہاراجہ کو لاہور کا قبضہ دلایا تھا اور جس کو رنجیت سنگھ باپو کہہ کر پکارتا تھا مہاراجہ کے

خاص درباریوں میں تھا۔ موضع نواں کوٹ اسی محکم دین کا آباد کردہ ہے۔ رانی موراں نے پاپڑ منڈی اور چوک متی کے درمیان جو مسجد بنوائی تھی وہ آج بھی موجود ہے۔ رانی موراں نے اپنے عروج واقتدار کے زمانے میں موری دروازے کے باہر ایک عالیشان باغ بھی تعمیر کرایا جس کی چاردیواری قد آدم تھی، جس کا بڑا دروازہ نہایت شاندار اور منقش تھا۔ آج اس باغ کا کہیں نام و نشان نظر نہیں آتا۔ لوگوں نے وہاں مکانات بنالیے اور کچھ زمین اس سڑک پر آگئی ہے جو آگے جا کر بڑی سڑک کے ساتھ مل جاتی ہے۔

باغ رانی گل بیگم

موراں کی وفات کے بعد امرتسر کی ایک خوب صورت طوائف کو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنی رانی بنایا۔ یہ شادی امرتسر میں ہوئی۔ اس کا نام گل بیگم تھا۔ شادی کے بعد اس کا نام گل بہار بیگم رکھا گیا اور پروانے جاری کر دیے گئے کہ کاغذات میں اس کا نام بیگم صاحبہ لکھا جائے۔ ۱۸۵۶ء میں گل بیگم نے خطہ میانی میں مزنگ کے متصل اپنے عالی شان باغ کی بنیاد رکھی۔ باغ کا دروازہ مغرب کی جانب تھا اور بہت اونچا تھا۔ بالا خانہ کے تین دریچے منقش تھے۔ محرابی دروازے پر اشعار نیل کے رنگ سے لکھے گئے تھے۔

ظہور سال ز آباد باغ رانی شد
عطارد ز از سر ارقام چوں گرفت قلم

باغ میں کئی قسم کے پھلدار درخت تھے۔ کئی مکانات، بالا خانے، حوض، کنویں، فوارے، آبشاریں، سڑکیں، غسل خانے، گنبد کلاں، گنبد خورد، باغ کی جنوبی حدود میں گل بیگم کا مقبرہ تھا جو اس نے اپنی زندگی میں ہی وہاں بنوالیا تھا۔ قبر سیاہ پتھر کے چبوترے پر ہے جب اس کا متبنہ بیٹا سردار خاں مر گیا تو اسے بھی وہیں قریب ہی دفن کیا گیا۔ سردار خاں کے زمانے میں قبر پر کمخواب کا غلاف اکثر پڑا رہتا تھا اور چار باغبان باغ اور مقبرے کی حفاظت پر مامور تھے۔ اب باغ کا کہیں وجود نظر نہیں آتا۔

باغ ہمت کہار

بال روڈ پر جہاں باغ و مقبرہ شاہ اسماعیل کی چار دیواری تھی، امتداد زمانہ سے ایک ایسا وقت آیا کہ اس چار دیواری کے متصل بلکہ باغ اور مقبرہ کے کچھ حصہ میں بڑے بڑے ساہوکاروں نے عالی شان مکانات تعمیر کر لیے۔ ان دولت مندوں کی وجہ سے اس ٹکڑے کا نام لکھی محلہ مشہور ہو گیا۔ سہ حاکمان لاہور کے زمانے میں یہاں کے عالی شان مکانات کھنڈروں میں تبدیل ہو گئے۔ اس زمانے میں ایک اہل کار ہمت قوم کہار نے جو مواضعات مزنگ واچھرہ کا متاجر تھا، بہت سا حصہ ہموار کرایا اور یہاں ایک دلکش باغ اور اس کے ساتھ کئی پختہ مکانات تعمیر کروائے۔ تاریخ لاہور میں لکھا ہے کہ جب خشت فروش بنیادیں کھودتے اور زمین صاف کرتے تو اکثر دفینے نکلتے تھے۔ ایک مرتبہ محمد شاہی روپے کا بھرا ہوا دیگچہ نکلا تھا۔ انگریزی عملداری کے وقت ہمت کہار کے کم ہمت پوتے حاکم نام نے وہ باغ میاں محمد سلطان ٹھیکیدار کے پاس فروخت کر دیا۔ سلطان ٹھیکیدار نے باغ کو صاف کروا کر وہاں ایک کوٹھی بنوائی۔ یہاں اس زمانے کے ڈپٹی کمشنر مسٹر بال نے رہائش اختیار کی اور اس کے نام پر وہ بال صاحب کی کوٹھی مشہور ہو گئی اور اس سڑک کا نام بھی بال روڈ پڑ گیا۔ اب کسی کے خواب میں بھی یہ بات نہیں آسکتی کہ جہاں بال روڈ ہے، وہاں ایک باغ ہوا کرتا تھا۔

فیض باغ

سکھوں کے عہد میں ایک درویش سائیں ہادی شاہ کے نام سے مشہور تھے۔ راجہ دینا ناتھ اس کا بڑا معتقد تھا۔ اس نے سائیں ہادی شاہ کے لیے چاہ میراں کے رستے میں ایک باغ تعمیر کرایا۔ اس میں پختہ مکانات بھی بنوائے اور باغ کی چار دیواری بھی پختہ بنوائی۔ راجہ دینا ناتھ ہر دوسرے تیسرے روز ہادی شاہ کے سلام کو آتا تھا۔ چونکہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کا دربار کا رکن تھا اس لیے اس کی دیکھا دیکھی اور لوگ بھی وہاں آنے لگے۔ اس باغ کے ساتھ کافی زمین تھی جہاں کاشت بھی ہوتی تھی۔ اس باغ کا نام فیض باغ رکھا گیا تھا۔ اس خیال سے کہ سائیں ہادی شاہ سے لوگوں کو فیض پہنچتا ہے۔ بقول منشی محمد دین فوق ان کے زمانے سے پچاس سال پہلے تک فیض

باغ کی دیوار بندی کے آثار موجود تھے۔ گو فیض باغ کی زمین میں کاشت ہوتی تھی لیکن اس کے مشرقی جانب بید مشک، گلاب، سنگترے اور دوسرے پھلدار درخت کثرت سے موجود تھے۔ یہ سب باغات فروخت ہو کر مکانات کی صورت میں آباد ہو گئے۔ چنانچہ آج فیض باغ ایک باغ کا نام نہیں ہے بلکہ ایک آبادی ہے۔

ہادی شاہ کی قبر بھی اسی آبادی میں ہے۔ بڑ کے ایک درخت کے نیچے اونچے چبوترے پر یہ قبر واقع ہے۔

باغ چھجو بھگت

جہانگیر اور شاہ جہاں کے عہد میں چھجو بھگت ایک فقیر کامل گزرے ہیں۔ ان کا مکان شاہ عالمی دروازے کے باہر اس جگہ تھا جہاں میو ہسپتال لاہور کا بڑا دروازہ ہے اور دروازے سے چند قدم کے فاصلے پر بائیں جانب اس کی سمادھ بھی موجود تھیں۔ صاحب عمدۃ التواریخ لکھتے ہیں:

> ''چالیس سال سے یہاں ایک بزرگ مہاتما پرشوتم داس رہا کرتے تھے۔ بڑے ریاضت منش تھے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ اس کا بڑا احترام کرتے تھے۔ اس بزرگ کا قاعدہ تھا کہ سرکار کی طرف سے جو کچھ ان کو نقد و جنس ملا کرتا وہ اسے محتاجوں اور غریبوں میں تقسیم کر دیتے۔ ان کے بعد ان کا ایک چیلہ گدی پر بیٹھا۔''

اس چیلے کو عمارات بنانے کا بڑا شوق تھا۔ چنانچہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی طرف سے اسے جو کچھ ملتا وہ اسے تعمیرات میں صرف کر دیتا۔ اس نے جانب جنوب ایک باغ تعمیر کرایا۔ یہ باغ میو ہسپتال کے پہلو میں تھا۔ انگریزوں کا راج آیا۔ انہوں نے لاہور میں میڈیکل کالج بنانے کا ارادہ کیا تو باغ اور مکانات ڈھا دیے گئے۔ اب یہاں لاہور کا میڈیکل کالج ہے۔

باغ چوبرجی بادشاہ بیگم

لاہور سے ملتان کی طرف جاتے ہوئے یونیورسٹی گراؤنڈ سے آگے مغرب کی جانب ایک قدیم مغلیہ عمارت کا دروازہ آتا ہے جس کو چوبرجی کہا جاتا ہے۔ کبھی اس کے صرف تین برج ہی ہوا کرتے تھے۔ اب اس کا چوتھا برج بھی تعمیر کر دیا گیا ہے۔ جیسا کہ محترم محمد عبداللہ قریشی نے لکھا

ہے کہ اس عمارت میں دور شاہجہانی کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جو کہ اسلامی فن تعمیرات کا ایک نمایاں جوہر ہے۔ کہتے ہیں کہ چوبرجی کی تاریخی عمارت کسی باغ کی ڈیوڑھی تھی جو اپنی خوب صورتی اور نقاشی کی بدولت شالامار باغ سے دوسرے درجے پر تھی۔ اس کی حد ایک طرف نواں کوٹ کی چار دیواری اور میانی صاحب سے ملتی تھی تو دوسری حد مزار حضرت علی ہجویری عرف حضرت داتا گنج بخش اور پیر مکی کے مزار تک جا پہنچتی ہے۔ اس کی مغربی دیوار کے نیچے دریائے راوی بہتا تھا جس نے باغ کی عمارت کو کافی نقصان پہنچایا۔ آج سے تقریباً سو برس پہلے مولوی نور احمد چشتی اپنی کتاب ''تحقیقات چشتی'' لکھ رہے تھے تو باغ کی چار دیواری اور اس کے متعلقہ مکانات کی بعض بنیادوں کے ٹوٹے پھوٹے آثار موجود تھے۔ مگر اب ان کا کوئی نشان بھی باقی نہیں رہا۔ صرف یہ دروازہ ہی زمانے کی دست برد سے محفوظ رہ گیا ہے۔ دروازے کی پیشانی پر مشرق کی جانب نیلے حروف میں آیت الکرسی منقوش ہے۔

بقول محترم محمد عبداللہ قریشی اس باغ کی بنا اور بانیہ کے بارے میں لاہور کے مورخوں اور ان کی تقلید میں بعض دوسرے مصنفوں نے عجیب و غریب غلط بیانیوں سے کام لیا ہے۔ چوبرجی کے مغربی دروازے پر یہ شعر نقش ہے:

ساخت میابائی فخر النساء
روضہ عالی ارم احتشام!

مقامی روایات کے مطابق بیان کیا جاتا ہے کہ میابائی اورنگ زیب کی دختر زیب النسا کی کنیز یا کھلائی تھی۔ زیب النسا نے جب یہاں باغ کی تعمیر کا خیال ظاہر کیا تو اس کا تمام انتظام اپنی کنیز میابائی کے سپرد کیا۔ مگر اس سے حقیقت کا دور سے بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔ پروفیسر محمد علم الدین سالک پہلے مورخ ہیں جنہوں نے اپنی کتاب ''دختران ہند'' میں بڑی تحقیق کے بعد اصلیت سے پردہ اٹھایا اور حقیقت کو افسانے سے جدا کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ زیب النسا کا اس عمارت اور باغ کی تعمیر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ زیب النساء ۱۶۳۷ء کو پیدا ہوئی اور ۱۶۴۶ء میں جب یہ باغ تعمیر ہو رہا تھا تو اس کی عمر آٹھ نو سال سے زیادہ نہیں تھی۔ ایک کمسن بچی کو خواہ وہ کتنی ہی غیر معمولی قابلیت کی مالک کیوں نہ ہو رفاہ عامہ سے اس قدر دلچسپی لینے کا خیال نہیں آ سکتا۔

اس دور کی کسی تاریخ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ زیب النسا نے لاہور میں کوئی باغ بنوایا تھا۔

لاہور کے باغوں کا ذکر تاریخوں کے علاوہ بعض دوسری کتابوں میں بھی ملتا ہے۔ داراشکوہ کی کتاب ''سکینۃ الاولیاء'' میں یوں تو حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ صاحب کے ملفوظات اور ان کے مشہور خلفا کا تذکرہ ہے۔ مگر اس کتاب کا ایک باب ایسا بھی ہے جس میں ان تمام عمارات اور باغات کا ذکر ہے جہاں حضرت میاں میر صاحب دن کے وقت نکل جایا کرتے تھے اور یکسوئی سے عبادت الٰہی میں مصرف ہو جاتے تھے۔ اس باب کو پڑھنے سے لاہور کی اکثر عمارتوں اور ان کے بانیوں کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن اس طویل فہرست میں جہاں آرا کے کسی باغ کا ذکر نہیں ملتا۔ البتہ چندر بھان کی کتاب ''چہار چمن'' سے جو دور شاہجہانی میں لکھی گئی، لاہور کے مشہور باغوں مثلاً باغ دلکشا، باغ دل آمیز، باغ کامران، باغ نولکھا اور باغ شالیمار کے علاوہ بیگم صاحب جہاں آرا بیگم کے باغ کا ذکر ضرور ملتا ہے۔ لیکن زیب النسا کے کسی باغ کا تذکرہ اس میں نہیں ہے۔

لاہور کا بدھو کا آوا

محترم محمد عبداللہ قریشی بحوالہ محمد دین فوق کشمیری اپنی تالیف میں لکھتے ہیں کہ جہانگیر کے زمانے میں لاہور کا ایک کمہار سدھو نام اس مقام پر جہاں بدھو کا آوا مشہور ہے اور جو سڑک شالیمار باغ کے کنارے واقع ہے، چھوٹا سا پژاوہ یا بھٹہ بنا کر اینٹیں پکانے کا کام کیا کرتا تھا۔ جب بادشاہ شاہجہاں کے زمانے میں شالامار باغ کی تعمیر شروع ہوئی تو سدھو کے بیٹے بدھو کو اینٹیں بہم پہنچانے کا حکم ملا۔ شالامار باغ کی چار دیواری اور اس کی عمارات کے لیے لاکھوں کروڑوں اینٹوں کی کھپت تھی۔ اس لیے بھٹے یعنی آوے کی حدود بہت دور تک پھیل گئیں اور بدھو اب بدھو کمہار نہ رہا بلکہ شاہی خشت پز کہلانے لگا، اور امرا اور حاکم صوبہ تک اس کی رسائی ہوگئی۔

روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت میاں میر صاحب کا ایک مرید عبدالحق بارش کی شدت میں سردی سے ٹھٹھرتا آگ کی تلاش میں یہاں آیا۔ بدھو کے ملازموں اور خود بدھو نے اسے وہاں سے نکال دیا اور پناہ نہ دی۔ کہتے ہیں کہ اس مرتبہ آوے کو پکانے کے خس و خاشاک، کوڑا کرکٹ اور لکڑیوں کے ہزارہا من صرف ہو گئے مگر اینٹیں پختہ نہ ہو سکیں۔ بدھو اس غم میں بیمار پڑ گیا۔ اس نے ایک رات خواب میں اپنے باپ سدھو کو دیکھا جو اس کو غم و غصہ کی حالت میں کہہ رہا تھا کہ اگر تو اپنی بہتری چاہتا ہے تو حضرت میاں میر صاحب کے مرید اور فقیر عبدالحق سے جا کر اپنی تقصیر معاف

کروا۔ بدھو دو چار دن کی تلاش کے بعد درویش عبدالحق کے پاس پہنچا اور ان کے قدموں پر گر پڑا اور معافی کا خواستگار ہوا۔ درویش نے کہا، حکم الٰہی ایسا ہی تھا۔ اب اینٹوں کا پختہ ہونا تو ناممکن ہے البتہ آدھی پکی اور سڑی جلی اینٹیں بھی پختہ اینٹوں کے نرخ پر فروخت ہو جائیں گی۔ چنانچہ انہی ایام میں لاہور میں اس کثرت سے عمارات شروع ہوئیں کہ بدھو کی تمام نیم پختہ اینٹیں اصلی نرخ پر فروخت ہو گئیں۔

درویش اور میاں میر صاحب کے مرید عبدالحق کا انتقال ۱۶۷۱ء میں عالمگیر کے عہد میں ہوا۔ بدھو نے ان کی قبر، گنبد بہادر خان کے شمال کی طرف تعمیر کرائی۔ چند برس بعد خود بدھو کا انتقال ہوا تو اس کی قبر بھی اس درویش کے متصل ہی تعمیر کی گئی۔ لیکن ۱۹۰۹ء میں یا اس کے قریب ریلوے حکام نے جب ریلوے جنرل اسٹورز کی وسیع عمارت اور اس کی طویل اور بلند دیوار بنائی تو بہت سے مقبرے جنرل اسٹورز کی حدود میں آ گئے۔ جنرل اسٹورز کی شمالی دیوار سڑک شالامار باغ کے ساتھ ساتھ پژواہ بدھو کے مسیحی قبرستان سے شروع ہو کر مقبرہ علی مردان سے بھی آگے چلی گئی ہے۔ جو اب جنرل اسٹورز میں ہی شامل ہے۔

راقم الحروف (منشی محمد دین فوق کشمیری) نے ۱۹۲۳ء میں روضہ حضرت ایشاں کے ایک ضعیف العمر خادم سائیں کامل دین سے جو چالیس برس سے اسی درگاہ میں رہتے ہیں اور بعض دیگر لوگوں سے صاحب مقبرہ کا نام دریافت کیا۔ چند ایک نے لاعلمی ظاہر کی لیکن سائیں کامل دین نے اور کچھ اصحاب نے کہا کہ مشہور یہی ہے کہ یہ قبر بدھو کی ہے جس کے نام پر بدھو کا آوا ہے۔ اسی مقبرے کے اندر دو قبریں ہیں۔ غربی جانب جو قبر ہے وہ ذرا چھوٹی ہے اور مشرقی جانب کی قبر ذرا بلند ہے۔ مقبرہ کی عمارت شاہجہانی عمارتوں کا نمونہ ہے۔ گنبد پر منقش چینی کا کام ہے جو ہر چند کہ بہت کچھ مٹ گیا ہے مگر ابھی اس کے اثرات باقی ہیں۔ مقبرے کا بیرونی چبوترہ پندرہ پندرہ قدم مربع ہے۔ اکثر جگہوں سے شکستہ ہے۔ ایک بہت بڑا کریر کا درخت چبوترے کے غربی گوشے میں موجود ہے۔ اس گنبد سے قریباً پچاس ساٹھ قدم کے فاصلے پر مشرق کی طرف اس زمانے کا ایک کنواں شکستہ حالت میں ہے۔ مقبرے کا دروازہ شمال یعنی شہلا باغ کے رخ پر تھا۔ یہاں ایک طویل چبوترے کے آثار اب تک نظر آ رہے ہیں۔

راجہ رنجیت سنگھ کے ایک انگریز جنرل نے بدھو کے آوے کی بلندی پر ایک کوٹھی تعمیر کرائی

تھی۔ سکھ حکومت کے خاتمے پر ۱۸۴۱ء کے بعد بنگلہ مسمار ہو گیا۔ ۱۹۰۰ء میں اس آوے کی کھدائی سے بہت سی زمین نکل آئی تھی۔ لیکن آوے کے آثار اب بھی قائم تھے۔

۱۹۲۳ء میں جب راقم (محمد دین فوق کشمیری) اس طرف گیا تو اس ٹیلے کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔ بلکہ جو زمین اس آوے کو مٹانے سے برآمد ہوئی تھی اس میں عیسائیوں کا قبرستان بنا دیا گیا تھا۔ اب نہ بدھو کا آوا ہے نہ سکھ حکومت کے زمانے کا بنگلہ۔ مسیحی قبرستان اور گنبد بدھو کے درمیان جنرل اسٹورز ریلوے کی دیوار کے ساتھ گورنمنٹ (انگریز گورنمنٹ) نے ایک گول سا چبوترہ بنا کر اس پر ایک دیوار چار فٹ کھڑی کر دی ہے۔ جس پر سنگ مرمر کی تختی پر انگریزی میں لکھ کر لگا دیا کہ یہاں بدھو کا آوا اور جنرل ایوی ٹیبل کی کوٹھی ہوتی تھی۔ یہ چبوترہ شہلا باغ کو جاتے ہوئے دائیں ہاتھ کو آتا ہے۔ اس کے گرد لوہے کی ایک زنجیر لگی ہوئی ہے۔

منشی محمد دین فوق کشمیری اپنی کتاب میں ۱۹۲۳ء کے زمانے کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ پڑواہ بدھو کے متصل دو قبرستان ہیں اور دونوں سرِ راہ واقع ہیں۔ پہلے مسلمانوں کا قبرستان آتا ہے جہاں ایک مسجد قدیم ہے۔ اس کے ساتھ ہی مسیحی قبرستان ہے۔ مسیحی قبروں پر بعض بڑے دلگداز جملے لکھے ہوئے ہیں۔ آٹھ سال کے ایک بچے کی قبر پر لکھا ہے:

"نوخیز اور شیریں پھول جو ابھی غنچہ ناشگفتہ تھا توڑ ڈالا گیا، جو ابھی دنیا کے رنج و عیش سے ناآشنا تھا۔ ابھی اس نے اپنے والدین کی محبت کا پھل نہیں چکھا تھا کہ آسمان پر اٹھا لیا گیا۔"

ایک پچیس سالہ مسیحی نوجوان کی قبر پر یہ الفاظ مندرج ہیں:

"تیری محبت میرے دل میں قائم ہے اور وہ قائم رہے گی کیونکہ محبت کا قائم رہنا عیسائیت کا فرض ہے۔"

ایک انچاس سالہ مسیحی کی قبر پر ذیل کے الفاظ درج ہیں:

"اے خدا! اس کو بہشت میں جگہ دے اور اس کی نیکیوں کو ہماری مغفرت کا ذریعہ بنا۔"

منشی فوق کشمیری اپنی کتاب میں اسی قبرستان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں (بحوالہ محترم عبد اللہ قریشی صاحب) کہ مسٹر فضل بھی جو پنجاب بائبل سوسائٹی کے مشہور سیکرٹری، لاہور کے علم

دوست نوجوان اور اعلیٰ پائے کے مترجم تھے اسی جگہ مدفون ہیں۔ وہ بیالیس سال کی عمر میں ۲۲ اگست ۱۹۰۷ء کو وفات پا گئے۔ ان کی قبران کی بیگم نے بنوائی ہے۔ سنگ مرمر کا سالم تختہ جس کے گرد لوہے کا جنگلہ ہے، قبر پر نصب ہے۔ اس پر لکھا ہے:

"اپنے پیارے خاوند کی یاد میں۔ مبارک ہیں وہ جو اپنے مالک کی خدمت کرتے ہوئے جان دے دیتے ہیں اور اپنی جاں فشانیوں اپنی محنتوں اور اپنی شاندار خدمات کے بعد جن اوروں کو بھی پیروی کرنی چاہیے، دائمی آرامگاہ میں چلے جاتے ہیں۔ وہ مر نہیں گئے صرف قبل از وقت ہم سے جدا ہو گئے ہیں۔"

باغ دلکشا و مقبرہ جہانگیر

یہ باغ (بحوالہ محترم عبداللہ قریشی) دراصل نواب مہدی قاسم خاں نے جو اکبر کے معزز اور نامی سرداروں میں سے تھا، ۱۵۵۷ء میں دریائے راوی کے پار تعمیر کرایا۔ اس باغ کا کوئی خاص نام نہ تھا۔ اپنے بانی کے نام سے باغ مہدی قاسم خاں ہی اس کا نام تھا۔ نواب چونکہ اولاد نرینہ سے محروم تھا اس لیے مہرالنسا جب نور محل سے نور جہاں بنی تو اس نے اس باغ کو اپنی تحویل میں لے لیا اور اس کا نام دلکشا رکھا اور اس کی عمارات میں اضافہ کیا اور اس کو وہ رونق دی کہ شالا مار باغ سے پہلے اس کے مقابلے کا کوئی باغ اس وقت لاہور میں نہ تھا۔

جب باغ دلکشا میں جہانگیر بادشاہ دفن ہوا تو رفتہ رفتہ لوگ باغ دل کشا کا نام بھول گئے اور اس کا نام مقبرہ جہانگیر مشہور ہو گیا۔ آج لاہور میں بہت کم لوگ ہیں جن کو یہ علم ہے کہ مقبرہ جہانگیر جس چار دیواری کے اندر واقع ہے اس کا نام کبھی باغ مہدی قاسم خاں اور باغ دل کشا بھی تھا۔ چار دیواری کے اندر باغ کی زمین ایک سو بیگھہ ہے۔ تیس بیگھہ زمین عمارتی ہے۔ باغ کے اندر پختہ روشیں اور سڑکیں ہیں (محمد دین فوق صاحب یہ حال ۲۴۔۱۹۲۳ء کے زمانے کا بیان کر رہے ہیں) یہ عالی شان باغ خیابانوں، فواروں، حوضوں اور بارہ دریوں سے آراستہ ہے۔ مغرب کی طرف بہت بڑا دروازہ ہے۔ جس میں ہاتھی مع عماری گزر سکتا ہے۔ چار دیواری کے باہر چار بہت بڑے کنویں موجود تھے جن میں سے ایک دریا برد ہو چکا ہے۔ غربی دیوار والا کنواں اب تک موجود ہے۔ اس کنویں میں اب ٹیوب ویل لگا دیا گیا ہے۔ یہ بڑا دروازہ ہمارے دیکھتے دیکھتے بند ہو گیا۔

باغ کا اصل دروازہ یہی تھا۔ اس دروازے کی عمارت سنگ سرخ کی تھی جس پر سنگ مرمر سے گل کاری کی گئی تھی اور اللہ کا نام کندہ تھا۔ اس دروازے کے بالمقابل ایک بارہ دری تھی جواب نہیں رہی۔ باغ کی مشرقی دیوار اور اس دیوار کے بارہ دری کو دریا نے برباد کیا۔ اس باغ کے اندر حوض تھے۔ ہر حوض میں فوارے تھے۔ ایک حوض بھی دریا کی نظر ہو چکا ہے۔ فصیل باغ کی دیواروں پر چاروں طرف ایک چھتی ہوئی غلام گردش بنی ہوئی ہے جو شاہی گارڈ کے سپاہیوں کے لیے مخصوص تھی۔

جہانگیر نے ۱۶۲۷ء میں وفات پائی۔ باغ دلکشا کے عین وسط میں شاہجہاں کے حکم سے اس کا مقبرہ تعمیر کیا گیا جس پر دس لاکھ روپے لاگت آئی۔ اس کے مصارف کے لیے جاگیر مقرر ہوئی۔ قرآن حکیم پڑھنے والے پانچ سو آدمی ملازم رکھے گئے جو نوبت بہ نوبت جہانگیر کے مقبرے پر قرآن شریف پڑھا کرتے تھے۔ جب زوال سلطنت مغلیہ کے بعد سکھ حکومت کا زمانہ آیا تو نہ جاگیرداری اور نہ قرآن خواں حافظ وہاں رہے۔ مسلمانوں کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ وہ بادشاہ کے مزار کا کیا خیال رکھتے۔ جس طرح اس مقبرے کی عمارت شاندار تھی ویسا ہی سکھوں نے اس کے ساتھ سنگ دلی کا سلوک کیا اور اس کو زمانے کے لیے جائے عبرت بنا دیا۔ رائے بہادر کنہیا لال تاریخ لاہور میں لکھتے ہیں:

> ''مقبرہ کی منڈیروں پر سنگ مرمر کی جالیوں کے علاوہ شمع جلانے کے جو مرمریں ستون تھے وہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے حکم سے اکھاڑ کر امرتسر پہنچائے گئے اور دربار صاحب کے پل پر لگائے گئے۔ مقبرے کے جن جن مقامات سے قیمتی پتھر اتروائے گئے وہاں چونے کا پلستر کروا دیا۔ کئی جگہوں سے سنگ مرمر کی جالیاں اکھڑوا کر امرتسر لے جائی گئیں۔ قبر کے اوپر سنگ مرمر کی جو منقش چھت تھی، مہاراجہ کے حکم سے وہ بھی اکھڑوا کر امرتسر دربار صاحب پہنچا دی گئی اور اس کی جگہ لکڑی کی چھت ڈال دی گئی۔''

الحاق پنجاب کے بعد انگریزوں نے ۱۸۸۹ء میں مقبرہ کی مرمت کرائی۔ انہوں نے چھت کی منڈیروں پر سنگ مرمر کی جالیاں لگوائیں۔ باغ کو از سر نو درست کیا۔ لکڑی کی چھت کی مرمت کرائی گئی۔ جب دریا اس باغ اور مقبرہ کی دیوار سے ٹکرانے لگا تو انگریز حکومت نے ایک بند بنوا دیا

جس سے مقبرہ اور اس کا باغ آئندہ کے لیے غرقابی کے اندیشے سے بچ گیا۔

محترم عبداللہ قریشی لکھتے ہیں کہ قیام پاکستان کے بعد ہماری اپنی حکومت نے اس مقبرہ کی مرمت کے لیے پونے دو لاکھ روپیہ کی منظوری دی۔ لیکن چونکہ سنگ مرمر، سنگ احمر، سنگ خطوط اور سنگ سیاہ اس وقت پاکستان میں دستیاب نہیں تھا اس لیے یہ دوسرے ملک سے درآمد کیے گئے۔ اس کے پہنچنے میں کچھ دیر لگی۔ اسی اثنا میں مقبرے کے ایک مینار کا ایک چھجہ خود بخود گر گیا جس کی وجہ سے یہاں سیر کرنے والوں میں سے ایک مرد ایک عورت ہلاک اور پانچ چھ افراد زخمی ہو گئے۔ محکمہ آثار قدیمہ نے اس کے بعد میناروں میں داخلہ بند کر دیا اور خطرے کے نشانات بھی نصب کر دیے۔ اب مرمت کے یہ مینار اپنی اصلی حالت پر آ گئے ہیں اور مقبرے کے دوسرے حصوں میں بھی کافی اصلاح ہوئی ہے۔ اس باغ میں ''یار کا میلہ'' ہر سال بڑی دھوم دھام سے لگتا ہے۔ یہ عام طور پر گرمیوں میں آتا ہے جب آفتاب کی حدت جوبن پر ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی لاہور کے زندہ دل یہاں تفریح کے لیے اکثر آتے ہیں۔ اب مقبرہ جہانگیر اور اس قسم کی دوسری شاہی عمارتوں اور باغوں میں تفریحی پارٹیوں کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی۔

راجو باغ

راجو نے جس کا نام شاید ریاض محمد ہو یہ باغ اکبر کے عہد میں تعمیر کرایا۔ یہ شخص لاہور کے امرا میں سے تھا۔ راجو سادات بارہ میں سے تھا۔ اکبر کے عہد میں ہزار پانصدی کا منصب دار تھا۔ داراشکوہ سکینۃ الاولیاء میں لکھتا ہے کہ راجو باغ اچھرہ کے متصل ہے۔ اچھرہ تو موجود ہے جس کو لاہور قدیم بھی کہتے ہیں مگر راجو باغ کا کوئی نشان موجود نہیں۔

باغ میرزا کامران

شہزادہ میرزا کامران بابر بادشاہ کا بیٹا اور ہمایوں کا بھائی تھا۔ میرزا کامران پنجاب کا حاکم تھا۔ اس زمانے میں دریائے راوی شہر لاہور کی دیواروں کے ساتھ ٹکراتا ہوا بہتا تھا۔ آج بھی دریائے راوی کے اس بہاؤ اور رخ کے آثار ''بڈھا دریا'' یا نالہ کے نام سے موجود ہیں، جو ریلوے اسٹیشن بادامی اور دریائے راوی کے پل کے درمیان واقع ہے۔ قلعہ لاہور کی حالت اس زمانے

میں کچھ اچھی نہ تھی۔ اس لیے میرزا کامران نے دریا کے پار اپنے لیے ایک عالی شان محل تعمیر کرایا اور کہا جاتا ہے کہ مغلوں کی یہ سب سے پہلی عمارت ہے جو بابر کے زمانے میں یا ہمایوں کے ابتدائی عہد کے وقت پنجاب بلکہ ہندوستان میں تعمیر ہوئی۔ اس زمانے کا اندازہ ہم بابر کی وفات سے کچھ پہلے ۱۵۳۳ء کا لگا سکتے ہیں۔ اس کی ایک دلیل یہ ہے کہ جب شیر شاہ سوری کے حملوں سے بچنے کے لیے ہمایوں نے اپنے تین بھائیوں اور امرا سے مشورہ کرنا چاہا تو میرزا کامران کی جاگیر میں ہونے کی وجہ سے پنجاب ہی سب سے بہتر محفوظ مقام لگا۔ چنانچہ میرزا کامران کے دریا پار والے محل (بارہ دری) میں جو ایک وسیع و گل ریز باغ کے درمیان واقع تھا، باہمی مشورے کے بعد ایک عہد نامہ مرتب ہوا۔

تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد مغلیہ میں دریا کے پار شاہدرہ کے نواح میں امرائے مغلیہ نے بہت سے باغات اور مکانات تعمیر کروائے تھے۔ مگر جب دریا نے محمد شاہ بادشاہ کے زمانے میں اپنا رخ شہر کی طرف سے ہٹا کر شاہدرہ کی طرف کر لیا تو بہت سے باغ دریا برد ہو گئے اور جو باقی بچے وہ زمانے کی دست برد سے مٹ گئے۔ میرزا کامران کا یہ باغ نہایت وسیع تھا۔ اس کے اندر دیوان خاص، دیوان عام اور محلات زنانہ کے علاوہ ایک مستحکم و مضبوط بارہ دری بھی تھی جس کی دونوں منزلیں اب تک کسی نہ کسی حالت میں موجود ہیں۔ جب راوی پر پیدل چلنے والوں کے لیے کشتیوں کا صرف ایک ہی پل تھا۔ ان ایام میں محکمہ نہر کے ایک افسر اس بارہ دری میں رہا کرتے تھے اور مسافروں سے ایک پیسہ یا دو پیسہ محصول گزر لیا جاتا تھا۔ ۱۹۱۵ء میں دریا پر پختہ پل تعمیر ہوا اور بارہ دری بھی پبلک کی سیر و تفریح کے لیے خالی کروا کر آثار قدیمہ کے سپرد کر دی گئی۔ دریا کا رخ شہر کی طرف سے ہٹا کر سب سے پہلے بند عالمگیری نے شاہدرہ کی طرف پھیر دیا۔ اس زمانے میں میرزا کامران کا باغ دو اڑھائی میل کے فاصلے پر تھا۔ محمد شاہ بادشاہ کے زمانے میں بند عالمگیری کی وجہ سے دریا کا بہاؤ باغ کی دیواروں تک آ پہنچا اور سکھوں کے زمانے تک دریا نے باغ کی دیواروں کو منہدم کر کے شاہی محلات کا صفایا بھی شروع کر دیا۔ چنانچہ رنجیت سنگھ کے آخری دس سالوں میں پانی کے بہاؤ نے بارہ دری کی قدم بوسی شروع کر دی۔ یہ ۱۸۳۰ء سے ۱۸۳۲ء کے زمانے کا ذکر ہے۔ ایک سو سال سے زیادہ عرصے سے راوی کی لہریں بارہ دری سے ٹکراتی رہیں۔ پہلے میرزا کامران کا عالی شان باغ دریا برد ہوا پھر بارہ دری بھی دریا کی نذر ہونے لگی اور وہ دریا

کے اندر آ گئی۔

جہانگیر جب لاہور سے کشمیر روانہ ہوتا تھا تو اس کی پہلی منزل عموماً اسی باغ میں ہوتی تھی داراشکوہ بھی اپنی کتاب ''سکینۃ الاولیاء'' میں باغ میرزا کامران کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ حضرت میاں میر صاحب باغ کی اس عمارت میں جو حوض کے درمیان بنائی گئی تھی بعض اوقات چند مریدوں کے ہمراہ اقامت فرمایا کرتے تھے۔ یہ عمارت دریا میں بہہ گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس باغ میں پانی کا ایک اتنا بڑا حوض بھی تھا جس کے عین درمیان ایک عمارت تھی اور یہ عمارت بعد میں دریا برد ہو گئی۔

باغ دل افروز

اس باغ کا بانی کون تھا؟ اس میں کیا کچھ تھا؟ اور یہ لاہور میں کہاں واقع تھا۔ لاہور کی کسی تاریخ میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔ صرف جہانگیر نے اپنی توزک میں اس کا ذکر اس موقع پر کیا ہے جب وہ اپنے فرزند سلطان خسرو کی بغاوت فرو کرنے کے بعد ۱۶۰۶ء میں کابل کو روانہ ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی روانگی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> ''۲ ذوالحجہ ۱۰۱۵ھ کو میں قلعہ لاہور سے نکلا۔ پہلی منزل دریائے راوی کے کنارہ پر باغ دل افروز میں کی اور چار بار وہاں توقف کیا۔''

جہانگیر ۱۰۱۴ھ میں اکبر کے بعد تخت پر بیٹھا اور تخت پر بیٹھتے ہی سب سے پہلے اس کو اپنے فرزند سلطان خسرو کی بغاوت سے واسطہ پڑا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ باغ اکبر یا ہمایوں نے تعمیر کرایا تھا۔ جہانگیر شاہان مغلیہ میں مناظر قدرت، تفریح و شکار اور سیر و سیاحت کا خاص شوق رکھتا تھا۔ اس باغ میں اس کا چار دن قیام ظاہر کرتا ہے کہ اس زمانے میں باغ دل افروز کی رونق اپنے جوبن پر ہو گی۔ اس میں یقینی طور پر اس قدر محلات اور مکانات ہوں گے جہاں بادشاہ، بیگمات اور خدم وحشم سمیت سما سکتا تھا۔

جہانگیر لکھتا ہے کہ اس باغ میں، میں نے اپنے قابل امیروں کے منصوبوں میں اضافے کیے اور دوشنبہ کو باغ دل افروز سے روانہ ہو کر موضع ہری پور میں کہ لاہور سے ساڑھے تین کوس پر ہے، آیا۔ ایک دن کے قیام کے بعد جہانگیر پور میں (شیخوپورہ) قیام کیا جو میری مقرر شکارگاہوں

میں ہے اور جہاں میرے ہرن ہنس راج کی قبر میرے حکم سے بنائی گئی ہے۔ (ہرن منیار) جس عالیشان باغ میں جہانگیر جیسا مناظر قدرت کا شیدائی بادشاہ چار دن تک قیام کرتا ہے آج کوئی اس کا پتہ نہیں بتا سکتا۔ یہاں تک کہ لاہور کی تاریخ بھی خاموش ہے۔ کسی تاریخ کے کسی صفحے پر اس باغ کا ذکر نہیں ملتا۔ چونکہ یہ باغ دریا کے کنارے پر تھا اور اس زمانے میں سب باغات بارہ دری میرزا کامران کی طرح شاہدرہ اور شیخوپورہ کی سڑک کی طرف لب دریا ہی تھے اس لیے دریا کا رخ شہر اور قلعے سے بدل کر جس طرح دوسرے باغات کو تہ آب کر کے ملیا میٹ کر گیا۔ اسی طرح یہ باغ دل افروز بھی دریا کی نذر ہو گیا ہو گا۔

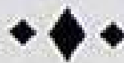
باغ نولکھا

شہزادہ داراشکوہ اپنی تصنیف ''سکینۃ الاولیاء'' میں حضرت میاں میر کے خوارق عادت بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''حضرت میاں جیو صاحب کے اکثر دوستوں سے میں نے سنا ہے کہ ایک روز آپ نولکھا باغ میں گئے ہوئے تھے۔ آپ نے اپنے ایک دوست سے فرمایا کہ اس درخت سے پوچھو کہ تو کون سی تسبیح پڑھتا ہے جب اس نے درخت کے پاس جا کر پوچھا تو درخت نے کہا میں ''یا نافع'' کی تسبیح پڑھتا ہوں۔ وہ سرس کا درخت تھا اور اب تک اس باغ میں موجود ہے۔''

داراشکوہ نے یہ نہیں بتایا کہ یہ باغ کس نے بنایا اور لاہور میں کس جگہ پر تھا۔ مصنف ''تحقیقات چشتی'' میں لکھتے ہیں کہ یہ باغ علی مردان خان نے تعمیر کرایا تھا۔ جج محمد لطیف اپنی تاریخ پنجاب میں لکھتے ہیں کہ یہ میرزا کامران کا باغ تھا۔ لیکن اس کے بعد جب وہ انگریزی زبان میں ہسٹری آف لاہور لکھتے ہیں تو نولکھا باغ کو نواب علی مردان سے منسوب کرتے ہیں اور اس کا محل وقوع شالامار باغ کے جنوب میں بتاتے ہیں۔ ناچیز راقم (مولوی محمد دین فوق کشمیری) نے اس باغ کے بانی کے متعلق تاریخوں کے مطالعے سے جو رائے قائم کی ہے وہ یوں ہے کہ نواب علی مردان خان ۱۶۳۸ء میں ایران سے لاہور آیا۔ شاہ جہان ان ایام میں لاہور ہی میں تھا اس نے اسے اعلیٰ مراتب عطا کیے۔ ۱۶۳۹ء میں علی مردان خان کو ہفت ہزاری امیر بنا کر لاہور کا گورنر مقرر

کیا۔ داراشکوہ اپنے قول کے مطابق حضرت میاں میر صاحب کی وفات ۱۰۴۵ھ کے چھ سال بعد ۱۶۴۲ء میں ۲۸ سال کی عمر میں اپنی کتاب سکینۃ الاولیاء لکھنی شروع کی اور جب وہ یہ لکھتا ہے کہ حضرت میاں میر صاحب دن کے وقت اپنے دوستوں کے ساتھ اس باغ میں تشریف لایا کرتے تھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی تشریف آوری کا زمانہ ۱۰۴۵ھ سے بہت پہلے کا ہے اور یہ وہ زمانہ تھا کہ علی مردان خان جس کو نولکھا باغ کا بانی بتایا جاتا ہے، شاہ ایران کی طرف سے قندھار کا گورنر تھا۔ اس اعتبار سے یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ ۱۰۴۸ھ سے پیشتر علی مردان خان نے لاہور میں اپنا کوئی باغ بنایا ہو۔ جج لطیف نے اپنی اردو کی تاریخ میں جو یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ باغ میرزا کامران نے بنوایا تھا، تو یہ درست معلوم ہوتا ہے۔ تاریخ لاہور کا مصنف رائے بہادر کنہیا لعل ۱۸۴۸ء میں لکھتا ہے: ”ریلوے اسٹیشن کے شمال کی طرف اس باغ کی نہایت پختہ ڈیوڑھی موجود ہے مگر جب راقم (فوق) لکھنے بیٹھا ہے تو یہ باغ جس مقام پر واقع تھا آج وہاں کئی نو آبادیاں قائم ہوگئی ہیں۔ فیض باغ، کاچھوپورہ، بھارت نگر، سلطان پورہ، چاہ میراں اور وسن پورہ کی کچھ اراضی اور کچھ برباد شدہ کھنڈر اس باغ کی حدود میں واقع ہیں۔ سکھ حکومت کے زمانے میں اس باغ کی تباہی و بربادی اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی۔ اس کی دواریں گرا کر اینٹیں بیچ دی گئیں۔ محل اور باغ کی عمارتوں میں جس قدر پتھر تھا وہ مہاراجہ رنجیت سنگھ اپنے کام میں لے آیا۔ ۱۹۰۰ء میں راقم نے اس باغ کی ایک ٹوٹی پھوٹی دیوار ہی دیکھی جو باقی رہ گئی تھی اور جس کے پاس سرکی بندوں نے ایک دو جھونپڑیاں بنا رکھی تھیں۔ ۱۹۲۳ء میں یہ دیوار بھی ختم ہوگئی۔ دوموریہ پل یا ریلوے پل سے جو راستہ شالا مار کو جاتا ہے وہاں کوارٹرز آتے ہیں جن کا کثیر حصہ اس نولکھا باغ کے کھنڈروں پر بنایا گیا ہے۔ ان کوارٹروں کے درمیان سے باغ کی ڈیوڑھی کو رستہ جاتا ہے۔ اب تک اس رستے پر تختہ اینٹوں کے کہیں کہیں نشان ملتے ہیں۔



لاہور کے دینی مدارس اور علمائے قدیم

داراشکوہ گیارہویں صدی ہجری کے وسط میں کشمیر جاتے ہوئے لاہور میں سکونت پذیر ہوا۔ لاہور کا ذکر کرتے ہوئے داراشکوہ نے اپنی تصنیف سکینۃ الاولیاء میں لکھا:

"لاہور ایک نہایت معزز اور ممتاز شہر ہے۔ اس جیسا دوسرا کوئی اور شہر روئے زمین پر نہیں۔ آج یہ شہر اولیائے صالحین اور علما کا مرکز ہے۔ یہاں بہت سے مشائخ اور اولیاء اللہ کے مزار ہیں۔ ایک روایت کے مطابق عہد جہانگیری میں مرد و زن، صغیر و کبیر، تین ہزار حفاظ تھے۔ اب بھی اس شہر میں حفاظ کی ان گنت تعداد موجود ہے۔"

یہ اقتباس لاہور کے نامور علمی، ادبی و تاریخی شخصیت اور ممتاز معلم مولانا علم الدین سالک نے اپنے شہرۂ آفاق تحقیقی مقالے میں درج کیا ہے۔ یہ تحقیقی اور تاریخی مقالہ آج سے کم و بیش تیس برس پہلے شائع ہوا۔ فیض عام کے لیے میں ذیل میں اس مقالے کے کچھ اقتباسات پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں جن میں لاہور کے چند ایک دینی مدرسوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

مدرسہ دائی لاڈو

دائی لاڈو شاہ جہان کی دایہ تھی۔ بہت مالدار اور پرہیزگار خاتون تھی۔ وہ شیخ سلیم چشتی کی مرید تھی اور حج کی سعادت بھی حاصل کر چکی تھی۔ اس کے محلات لاہور کے محلہ زین خاں میں تھے۔ یہ محلّہ کبھی گزرتلہ بھی کہلاتا تھا۔ شاہ جہاں کے زمانے میں دائی لاڈو محلّہ کے نام سے مشہور ہوا۔ یہاں پہلے رتن باغ تھا۔ اب یہاں ہسپتال بن گیا ہے۔ جہاں بھارت بلڈنگ والی مارکیٹ نسبت روڈ اور گاندھی پارک واقع ہیں، یہ محلّہ اسی جگہ پر ہوا کرتا تھا۔ دائی لاڈو نے ۱۰۴۱ھ بمطابق ۱۶۳۱ء میں یہاں ایک مسجد تعمیر کروائی جو اب تک موجود ہے۔ مسجد میں دائی لاڈو اور اس کے خاوند کی قبریں بھی ہیں۔

دائی لاڈو نے مسجد کے ساتھ ایک دینی مدرسہ بھی تعمیر کروایا اور اپنی جائیداد کا بہت سا حصہ

اس مسجد اور مدرسے کے اخراجات کے لیے وقف کر دیا۔ اس مدرسے کے پہلے شیخ مولانا عظمت اللہ تھے۔ مولانا کی شہرت دور دور تک تھی۔ وہ بے حد پرہیز گار اور متقی تھے۔ معقولات و منقولات میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے۔ مولانا کی کشش ہر طرف سے طلبہ کو وہاں کھینچ لائی اور تھوڑے ہی عرصے میں یہ مدرسہ دینی مرکز بن گیا۔ دائی لاڈو کے فوت ہونے سے دس ماہ قبل اس کا خاوند بھی فوت ہو چکا تھا۔ ان کے فرزند محمد مشکور نے اس دینی مدرسے کو بدستور چلایا۔ چونکہ وہ لاولد تھا۔ اس نے اپنی تمام جائیداد مدرسے کے نام وقف کر دی۔ یہ مدرسہ نواب زکریا خان کے زمانے تک قائم تھا۔ جب سکھ لاہور پر قابض ہوئے تو انہوں نے دیگر علمی اداروں کے ساتھ اس مدرسے کو بھی تباہ کر دیا۔ مدرسے کی عمارتیں ٹوٹ پھوٹ کر کھنڈر بن گئیں۔

درس میاں وڈا یا مدرسہ تیل واڑہ

اس مدرسے کے بانی مولانا محمد اسماعیل سہروردی تھے۔ آپ کا آبائی پیشہ زمینداری تھا۔ آپ کی ولادت ۱۵۸۶ء میں علاقہ پوٹھوہار میں ہوئی۔ ابتدا میں آپ شیخ عبدالکریم سہروردی کے شاگرد ہوئے۔ آپ کی طالب علمی کے زمانے کا ایک واقعہ مفتی غلام سرور لاہوری نے اپنی کتاب میں یوں بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب آپ دینی علوم کی تحصیل میں ہمہ تن مصروف تھے تو آپ کی عمر بارہ برس تھی۔ مولانا عبدالکریم کے درس کے ساتھ لنگر بھی تھا جہاں سے طلبہ کو کھانا ملتا تھا۔ میاں محمد اسماعیل کے سپرد لنگر کے لیے آٹا پیسنا تھا۔ وہ مدتوں یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ چکی ان کے حجرے میں ہوتی تھی اور وہ وقت مقررہ پر آٹا پہنچا دیتے تھے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ آٹا وقت پر نہ پہنچا۔ آپ کے ساتھیوں نے کچھ دیر انتظار کیا۔ پھر وہ پریشان ہوئے کہ کہیں میاں محمد اسماعیل بیمار نہ ہو گئے ہوں۔ آپ کا ایک ہم سبق حجرے کی طرف آیا اور اندر داخل ہوا۔ کیا دیکھتا ہے میاں محمد اسماعیل تو مراقبے میں ہیں اور چکی خود بخود چل رہی ہے اور آٹا پس رہا ہے۔ وہ دبے پاؤں واپس استاد کے پاس گیا اور سارا واقعہ بیان کیا۔ شیخ عبدالکریم سہروردی خود وہاں پہنچے۔ جیسا سنا تھا ویسا ہی دیکھا۔ واپس لوٹ آئے اور دل میں شاگرد کی کیفیت پر خوش بھی ہوئے۔ ادھر کچھ دیر بعد میاں اسماعیل کو ہوش آیا۔ آٹا لے کر لنگر پہنچے۔ استاد سے تاخیر کی معافی مانگی۔ استاد نے کہا، ”اے نورِ نظر! آج سے تم یہ تکلیف نہ کرنا۔ تمہارے مشاغل میں ہرج ہوتا ہے۔“

میاں اسماعیل استاد کا یہ حکم سن کر ڈر گئے اور اس کا سبب دریافت کیا۔ استاد نے کہا، ''تمہیں تکلیف دینے سے ملائکہ کو تکلیف ہوتی ہے۔ تمہاری یہ خدمت مقرر کی جاتی ہے کہ دن بھر مطالعہ میں مشغول رہا کرو۔''

کچھ عرصہ بعد مخدوم عبد الکریم کے پڑوسیوں نے میاں اسماعیل کو صالح اور متقی دیکھ کر یہ خواہش کی کہ ہماری بھینسوں کا دودھ بھی تم ہی دوہ دیا کرو۔ آپ نے وعدہ کیا اور استاد کی خدمت کے ساتھ مخلوق خدا کی خدمت بھی شروع کر دی۔ آپ کی عادت تھی کہ دودھ کے تمام برتن ایک جگہ جمع کر کے سر کے اوپر اٹھا لیتے اور پھر گاؤں کا رخ کرتے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ استاد مخدوم عبد الکریم اپنے مکان کی چھت پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ میاں اسماعیل کے سر پر جو برتن رکھے ہوئے ہیں وہ سر سے ذرا اونچے ہیں اور آپ پر استغراق کا عالم طاری ہے۔ قدم اپنے آپ اٹھتے چلے جاتے ہیں۔ اس پر استاد کو یقین ہو گیا کہ آپ ولایت کے درجے تک پہنچ چکے ہیں۔ اب ان کے مزید وہاں قیام کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ استاد نے انہیں طلب فرمایا اور کہا:

''مدرسہ کی پابندی سے آپ کو مزید زحمت نہیں دینا چاہتا۔ آپ اب کسی دوسرے مقام کی طرف تشریف لے جائیں اور خلق خدا کی خدمت کریں۔ وقت آ گیا ہے کہ آپ خلق خدا کی فلاح و بہبود اور رشد و ہدایت کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیں۔''

ایک دن میاں اسماعیل ریاضت میں مشغول تھے کہ غیب سے اشارہ ہوا کہ آپ لاہور جائیں۔ اس وقت آپ کی عمر پینتالیس سال تھی۔ لاہور پہنچ کر آپ نے محلّہ تیل واڑہ میں قیام کیا۔ یہ محلّہ اسی جگہ تھا جہاں آپ کا درس اور مسجد واقع ہے۔ آپ نے وہاں درس و تدریس اور تعلیم و تلقین کا سلسلہ شروع کیا۔ اس نیک کام کو شروع کرنے سے پیشتر آپ نے حضرت شیخ علی ہجویری عرف حضرت داتا گنج بخش کے مزار پر چلہ کشی کی۔ محلّہ تیل واڑہ کے ساتھ ہی ایک اور محلّہ آباد تھا جسے محلّہ گنج پورہ کہتے ہیں۔ وہاں ایک قدیم مسجد تھی۔ آپ نے اس مسجد کو از سر نو تعمیر کروایا اور اس مسجد میں درس کی ابتدا کی۔ میاں محمد اسماعیل قرآن پاک، حدیث، فقہ، تفسیر اور علوم دینیہ کا درس دیا کرتے تھے۔ آپ ۱۶۷۶ء میں بمقام لاہور ہی فوت ہوئے۔ آپ کا مزار درس کے احاطے میں ہے اور آپ کی وصیت کے مطابق کچا ہے۔ آپ کی وفات کے بعد مولانا محمد صالح پچیس برس تک اس مدرسے کے مہتمم رہے۔ جب سلطنت اسلامیہ کو زوال آیا تو دوسرے اداروں کے ساتھ اس

مدرسے کو بھی نقصان پہنچا۔

مدرسہ میانی صاحب

اسی زمانے میں لاہور کے مغربی حصے میں ایک دینی مدرسہ بڑے اہتمام سے خدمت دین کر رہا تھا۔اس مدرسے کے بانی شیخ محمد طاہرؒ تھے جو سلسلہ قادریہ نقشبندیہ سے تعلق رکھتے تھے۔شیخ محمد طاہرؒ مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کے مریدوں میں سے تھے۔آپ سرہند شریف میں مرشد زادوں کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد آپ کو حکم ہوا کہ آپ لاہور تشریف لے جائیں اور وہاں درس و تدریس کا کام شروع کر دیں۔ چنانچہ آپ اپنے پیر کے حکم سے لاہور تشریف لے آئے۔ یہاں آپ نے تدریس و تعلیم کا سلسلہ جاری کر دیا۔آپ کے درس میں ہزارہا لوگ شامل ہوتے اور اعلیٰ مراتب پر پہنچتے۔آپ تمام عمر کسی امیر کے پاس نہیں گئے اور نہ ان کو اپنے قریب آنے دیا۔آپ کسب حلال سے روزی کماتے اور احادیث و تفاسیر کی کتابوں کی کتابت کر کے بسر اوقات کرتے۔ پھر رات رات بھر یاد الٰہی میں مشغول رہتے۔کوئی سائل آپ کے در سے خالی نہ جاتا۔آپ کی وفات جمعرات ۸ محرم ۱۰۴۰ھ بمطابق ۱۶۳۰ء کو ہوئی اور اپنے مدرسے کے ایک گوشے میں دفن ہوئے۔

آپ کے بعد مولانا ابو محمد قادری اس مدرسے کے مہتمم مقرر ہوئے۔آہستہ آہستہ اس مدرسے کے گرد ایک زبردست محلّہ آباد ہو گیا۔جو محلّہ میانی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ان ایام میں ''میاں'' پڑھے لکھے اور فاضل آدمیوں کو کہتے تھے۔ چونکہ اس محلے میں لاہور کے بڑے بڑے عالم فاضل لوگ رہتے تھے اس لیے یہ محلّہ میانی کے نام سے پکارا جانے لگا۔سیالکوٹ میں میانہ پورہ اس محلے کا نام ہے۔جس میں علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی رہا کرتے تھے۔محلّہ میانی کے مدرسے کے ساتھ ایک زبردست کتب خانہ بھی تھا جو سلطنت اسلامیہ کے زوال تک قائم رہا۔رائے بہادر کنہیا لعل تاریخ لاہور میں لکھتے ہیں:

> ''سکھوں نے اس محلے کو لوٹتے وقت اس بیش بہا کتب خانے کو بھی آگ لگا دی۔اس طرح ہزارہا نادر کتابیں جل کر راکھ ہو گئیں۔''

آج کل یہ سارا علاقہ قبرستان کے طور پر استعمال ہو رہا ہے۔ غالباً اس سے بڑا قبرستان اور

کہیں نہیں ملے گا۔اسی کے وسط میں شیخ محمد طاہر بندگیؒ کا مزار ہے۔مزار کے گرداگرد ایک چار دیواری تھی جواب گر چکی ہے۔مزار ایک بلند چبوترے پر واقع ہے۔اس کے مشرق کی طرف مولانا ابومحمد قادری اور سید خیر شاہ کی قبریں ہیں۔مغرب کی جانب ایک قدیم مسجد ہے۔

مدرسہ خیر گڑھ

جس مقام پر آج کل گڑھی شاہو آباد ہے اس جگہ کو اکبر کے زمانے میں شیخو گڑھی کہتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اکبر نے یہ مختصر سی بستی اپنے بیٹے شہزادہ سلیم کے نام پر بسائی تھی جسے وہ شیخ سلیم چشتی کے احترام کی وجہ سے شیخو بابا کہہ کر پکارا کرتا تھا۔شاہ جہاں کے عہد میں بغداد سے ایک نہایت فاضل اور جید عالم مولانا ابوالخیر لاہور میں وارد ہوئے۔ان کی شہرت تھوڑے ہی عرصے میں دور دور تک پھیل گئی اور گھر گھر ان کے علم وفضل کے چرچے ہونے لگے۔چنانچہ حکومت کے ایما پر انہوں نے درس وتدریس کے لیے ایک مدرسہ شیخو کی گڑھی میں جاری کیا۔آپ نے مدرسے کے لیے ایک عالی شان عمارت تعمیر کی جس کے ساتھ ایک وسیع مسجد بھی تھی۔طلبہ کے قیام کے لیے حجرے تھے۔اس عالی شان مدرسے کی فصیل اور دیواریں قلعہ نما تھیں۔مدرسے کا تمام خرچ لاہور کے شاہی خزانے سے ادا ہوتا تھا۔مولانا ابوالخیر نے بڑی لمبی عمر پائی۔آپ کی وفات کے بعد اس مدرسے کا انتظام آپ کے خلیفہ مولانا محمد نعیم کے ہاتھ آیا۔انہوں نے اس فیض کو برابر جاری رکھا۔ سکھوں کی غارت گری کے زمانے میں اس مدرسے کو بھی نقصان پہنچا اور لاہور کے دوسرے علاقوں کی طرح یہ علاقہ بھی ویران ہو گیا۔کچھ مدت تک یہ علاقہ کسمپرسی کے عالم میں پڑا رہا۔

مولانا نور احمد چشتی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ ۱۷۵۷ء میں ماجھے کا ایک تیلی شاہو نام یہاں وارد ہوا۔وہ دن کے وقت بکریاں چراتا اور رات کے وقت ڈاکے مارتا تھا۔خدا کی شان ہے کہ یہ علاقہ جو شیخو گڑھی سے خیر گڑھ بنا تھا اب اسی کے نام پر گڑھی شاہو کہلاتا ہے۔واللہ عالم بالصواب۔مولانا ابوالخیر کا مزار گڑھی کی چار دیواری میں چند اور قبروں کے ساتھ بلند چبوترے پر واقع ہے۔

مدرسہ ابوالحسن خاں تربتی

یہ لاہور کا مدرسہ تھا اور سب سے خوب صورت اور امیر گزرگاہ مغلپورہ میں واقع تھا۔ نواب ابوالحسن خان عہد جہانگیری کا ایک امیر کبیر تھا اور وزارت عظمیٰ کے عہدے پر بھی فائز ہوا۔ اس کا لڑکا ظفر خان احسن کشمیر کا گورنر تھا۔ اس نے کئی حویلیاں، محل، باغ اور دیگر عمارتیں بنوائیں۔ نواب مرحوم کی بیگم مخدومہ جہاں کہلاتی تھیں۔ وہ اسلامی علوم وفنون میں بڑا ادراک رکھتی تھیں۔ انہوں نے اپنے خاوند کی یاد میں یہ مدرسہ جاری کیا اور ایک ہزار حافظ مقرر کیے جو وہاں باری باری قرآن حکیم کی تلاوت کرتے تھے۔ مدرسہ کے معلمین میں سب سے نمایاں نام شیخ حامد قاری کا ہے جو ایک مدت تک اس مدرسے کے مہتمم رہے۔ مولانا حامد قاری نہایت فصیح البیان واعظ اور فاضل عامل تھے۔ دور دور سے لوگ آپ کے ہاں استفادہ کے لیے آیا کرتے تھے۔ آپ ۱۷۵۲ء میں فوت ہوئے اور مدرسے کے ایک کونے میں دفن کیے گئے۔ آپ کی وفات کے بعد رحمت اللہ اس مدرسے کے منتظم مقرر ہوئے۔ مگر وہ زمانہ بدامنی کا تھا۔ سکھوں نے ہر جگہ قتل وغارت گری کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ چنانچہ یہ مدرسہ بھی ویران ہو گیا۔ اس وقت یہ جگہ ریلوے اسٹیشن کی چار دیواری میں آچکی ہے۔

مدرسہ ملا فاضل قادری

یہ مدرسہ اس جگہ تھا جہاں آج کل جیل روڈ اور وارث روڈ ملتی ہے۔ ملا فاضل قادری ایک نیک دل بزرگ تھے۔ حکومت انہیں مدد معاش دیتی تھی جسے وہ مدرسے پر صرف کرتے تھے۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کے شاگرد شاہ شرف نے اس کام کو جاری رکھا۔ استاد اور شاگرد دونوں کی قبریں ابھی تک مدرسے کے محل وقوع کا پتا دیتی ہیں۔

مدرسہ ملا خواجہ بہاری

یہ مدرسہ دہلی دروازے کے اندر واقع تھا۔ نواب سعد اللہ خان اسی مدرسے کے فارغ التحصیل تھے۔ ملا خواجہ بہاری کا اصل وطن حاجی پور تھا جو بہار میں واقع ہے۔ آپ چھوٹی عمر میں ہی

علم کی تلاش میں وطن سے نکلے۔ کچھ مدت تک قصبہ کورا میں شیخ جمال اولیا کی خدمت میں رہے۔ وہاں سے فیضان حاصل کر کے لاہور تشریف لے آئے اور ملا فاضل لاہوری سے ظاہری علوم کی تکمیل میں مصروف ہو گئے۔ ملا فاضل اپنے ہونہار شاگرد سے بہت خوش تھے اور انہیں اپنے گھر میں رکھتے تھے۔ان ایام میں حضرت شیخ میاں میر صاحبؒ کا باطنی فیض عام تھا۔آپ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بیعت کی اور ان کی توجہ سے باطنی علوم میں کامل ہو گئے۔ ملا خواجہ بہاری عالم علوم فقہ وحدیث وتفسیر تھے۔تذکرہ علمائے ہند کا مصنف لکھتا ہے:

''ملا بہاری فقیہہ محدث، مفسر وواقف اسرار حقانی بود۔''

حضرت میاں میر صاحبؒ کی وفات کے بعد ملا خواجہ بہاری کو قبولیت عام حاصل ہوئی۔ دارا شکوہ سکینۃ الاولیا میں لکھتا ہے:

''ایک مرتبہ موسم سرما میں آپ ایک عرس پر تشریف لے گئے وہاں توحید پر گفتگو شروع ہوئی۔ ہر شخص نے اپنی اپنی بساط کے مطابق اس بحث میں حصہ لیا۔آپ پر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی۔ پاس ہی آگ جل رہی تھی آپ اٹھے اور الاؤ میں بیٹھ گئے۔ کچھ دیر کے بعد باہر نکلے تو دیکھا گیا کہ آگ نے آپ کو چھوا تک نہیں تھا۔ آپ نے فرمایا توحید یہ ہے کہ اس کے قائل پر کوئی چیز اپنا اثر نہیں کرتی۔''

آپ کی بے نیازی کی حالت یہ تھی کہ شاہ جہاں ایک مرتبہ آپ کی ملاقات کے لیے آیا تو آپ یہ خبر سن کر وہاں سے چل دیے۔ جب اس کا سبب دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ میں طمانیت قلب کھونا نہیں چاہتا۔ایک فقیر کو بادشاہوں کی ملاقات سے کیا سروکار۔

دارا شکوہ لکھتا ہے کہ ایک دن آپ شالامار کی سیر کو گئے۔ وہاں دو تین مرتبہ آپ نے فرمایا، ''مجھے طلب نہیں کرتے۔ اگر وہ طلب کریں تو مجھے مرشد کی قبر کے پاس دفن کرنا۔ آپ نے ۱۶۴۹ء میں انتقال فرمایا۔

شیخ عبدالکریم چشتی لاہوری

مخدوم الملک عبداللہ انصاری کے صاحبزادے تھے۔ آپ بھی شیخ نظام الدین بلخی کے مرید تھے۔ جب اکبر نے مخدوم الملک کو حج پر روانہ کیا تو آپ بھی اپنے والد کے ہمراہ تھے۔اس کے بعد

آپ لاہور تشریف لے آئے اور لوگوں کو ہدایت اور تلقین شروع کر دی۔ آپ کی خانقاہ اور مدرسہ نواں کوٹ میں افضل خاں علامی کے باغ کے قریب تھا۔ آپ عالم عامل اور فاضل کامل تھے۔ آپ کی مشہور تصنیف خصوص الحکیم خاص و عام میں آج بھی ہر دلعزیز اور مشہور ہے۔ آپ ۱۶۲۵ء میں فوت ہوئے اور آپ کا مزار آج بھی نواں کوٹ میں واقع ہے۔

مدرسہ وزیر خان

یہ مدرسہ لاہور کا بڑا مشہور تھا۔ اس کا بانی حکیم علیم الدین انصاری تھا۔ اس نے اپنی مسجد ۱۶۳۴ء میں تعمیر کرنی شروع کی۔ نواب وزیر خاں نے بہت سی جائیداد اور املاک اس مدرسے اور مسجد کے اخراجات کے لیے وقف کی۔ ایک وصیت کی رو سے مسجد اور مدرسے کے بانی نے مسجد کے اندرونی دروازے کی دکانیں جلد سازوں، صحافوں وغیرہ کے استعمال کے لیے وقف کی ہیں اور حجروں میں طالب علم، جدول ساز، کاتب وغیرہ رہ سکتے ہیں۔ مولوی نور احمد چشتی کا بیان ہے کہ میں نے اس کا صحیح مصرف اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ جج محمد لطیف کا بیان ہے کہ مسجد کے نام بہت بڑی جائیداد تھی جو دہلی دروازے سے لے کر پرانی کوتوالی کے چوک تک پھیلی ہوئی تھی۔

امام گاموں

آپ مولانا محمد صدیق لاہور کے خلف الرشید تھے۔ قرآن پاک کے حافظ اور رائج الوقت علوم وفنون کے ماہر تھے۔ آپ بھی مسجد وزیر خان کے امام تھے۔ رنجیت سنگھ آپ کا دل سے احترام کرتا تھا۔ آپ بڑے نیک دل، نیک طینت اور نیک خیال بزرگ تھے۔ اہل اللہ کے دل دادہ اور درویشوں کے خدمت گزار تھے۔ زہد وتقویٰ کی بنا پر آپ قرآن پاک کی کتابت کرتے۔ اس سے جو میسر آتا اس میں سے کچھ حصہ اپنے اوپر صرف کرتے اور کچھ اہل علم اور درویشوں میں تقسیم کر دیتے۔ آپ اپنے درس کے طالب علموں کا بڑا خیال رکھتے۔ ان کے دکھ درد میں شریک ہوتے۔ آپ نے کئی کتابیں لکھیں جس میں ''شمس التوحید'' خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ یہ فارسی نثر میں ہے۔ آپ کا انتقال ۱۸۶۷ء میں ہوا۔ آپ کا مقبرہ مسجد وزیر خاں کے احاطے کے باہر جنوب کی جانب ایک بلند گنبد کے نیچے ہے۔

ملا یعقوب لاہوری

آپ لاہور کی منفرد شخصیت اور عمل صالح کے مصنف ملا محمد صالح کے ہمعصر تھے۔ آپ مختلف علوم وفنون میں باکمال تھے۔ فقہ، اصول فقہ، حدیث شریف، تفسیر، منطق، معانی اور کلام میں آپ کی شہرت سارے ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی۔ اخلاق اور دیگر اوصاف انسانی میں آپ بے نظیر تھے۔ آپ کا وجود سرچشمہ فیض اور منبع خیر تھا۔ آپ کے علمی کمالات اہل پنجاب کے لیے باعث فخر ہیں۔ آپ نے علم ہندسہ اور ہیئت میں بھی اتنا کمال حاصل کیا کہ ان کی جزئیات تک سے واقف تھے۔ ملا محمد صالح کہتے ہیں کہ جب آپ منطق اور معانی پر گفتگو کرتے تو سننے والے مسحور ہو کر رہ جاتے۔ جب آپ اپنے شاگردوں میں بیٹھ کر درس دیتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ عالم بالا سے علم کی بارش آپ کے قلب پر ہو رہی ہے۔

ملا یوسف لاہوری

آپ باعمل عالم تھے۔ لوگ آپ کے زہد وتقویٰ کی وجہ سے آپ کا بہت احترام کرتے تھے۔ آپ اکبری دور کے مشہور فاضل ملا جمال تلوی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ آپ نے اپنے والد مولانا جمال کے علاوہ ان کی خدمت میں رہ کر کسب کمال کیا۔ آپ کی طبیعت کا رجحان زیادہ تر مذہبی علوم وفنون کی طرف تھا۔ آپ نے تفسیر، حدیث، تاریخ اور دیگر منقولات ومعقولات میں فضیلت حاصل کی۔ تفسیر پر زیادہ دل جمتا تھا۔ اسے خوب پڑھا۔ مطالعہ کیا اور اس میں کافی محنت کی۔ آخر اس میں یکتائے روزگار ہو گئے۔ تفسیر کے رموز کو اتنے عمدہ اور پر اثر انداز میں بیان کرتے کہ دل میں اترتے چلے جاتے۔ علوم فلسفہ وحکمت میں بھی اچھی خاصی مہارت تھی۔ مگر ان کی شہرت کا محور قرآنی علوم ہی تھے۔ آپ ملا عبدالحمید لاہوری کے قول کے مطابق پچاس برس تک درس دیتے رہے۔ بہت سے لوگ آپ سے بہرہ مند ہوئے اور درجہ کمال تک پہنچے۔ آپ نے اسی برس کی عمر پائی۔

ملا جامی لاہوری

بہت بڑے فاضل تھے۔ عمر کا اکثر حصہ درس و تدریس میں صرف کیا۔ آپ شاعر بھی تھے۔ آپ کا انتقال ۱۶۶۱ء میں عہد عالمگیری میں ہوا۔ آپ کی قبر احاطہ مزار طاہر بندگی میں ہے۔ یہاں ایک چھوٹی سی مسجد بھی ہے۔

مفتی محمد باقر لاہوری

آپ کا شمار لاہور کے ممتاز اور معزز علما میں ہوتا تھا۔ آپ شہر کے ایک حصے کے مفتی بھی تھے۔ آپ کے نام پر چوہٹہ مفتی باقر اب تک موجود ہے۔ وہیں آپ کا مزار بھی ہے۔

ملا عبدالحمید لاہوری

ایک زندہ جاوید مؤرخ تھے۔ آپ لاہور کے رہنے والے تھے۔ آپ علامہ ابوالفضل کے شاگرد تھے۔ آپ کی شہرت کی ابتدا لاہور ہی سے ہوئی جہاں ایک عرصے تک درس و تدریس میں مصروف رہے۔ آپ ٹھٹھہ میں تشریف لے گئے۔ وہاں بھی آپ نے درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ آپ نے بادشاہ کے اصرار پر بادشاہ نامہ تاریخ کی نہایت اہم کتاب لکھی جس میں شاہ جہاں کے زمانہ کے سیاسی و تاریخی حالات کے ساتھ ساتھ تمدن، معاشرت اور تہذیب کے متعلق بھی کافی معلومات ہیں۔

شاہ عنایت قادری شطاری

عالمگیر کے زمانے میں لاہور شریعت و طریقت کا مرکز تھا۔ اس عہد میں جن لوگوں نے بڑا نام پیدا کیا ان میں شاہ چراغ اور شاہ عنایت خاص شہرت کے مالک ہیں۔ شاہ عنایت کا تعلق لاہور کے ایک علمی خاندان سے تھا اور درس و تدریس آبائی پیشہ تھا۔ آپ کے والد مولوی پیر محمد لاہور چھوڑ کر قصور آباد ہو گئے۔ شاہ عنایت کی ولادت بھی قصور میں ہی ہوئی۔ جب آپ نے ہوش سنبھالا تو آپ کی تعلیم و تربیت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ آپ نے چھوٹی عمر میں ہی قرآن پاک حفظ کر لیا۔ بارہ

برس کی عمر میں آپ نے سند فضیلت حاصل کر لی۔ یہ تو علوم ظاہر کی کیفیت تھی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد آپ کے دل میں علوم باطنی کے حصول کا ولولہ پیدا ہوا اور کسی درویش کامل کی تلاش میں گھر سے نکلے۔ گھومتے پھرتے لاہور پہنچے اور حضرت شاہ محمد رضا کے درس میں شامل ہو گئے۔ ان کی صحبت سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہی کے ہو گئے۔ ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان کی سرپرستی میں سلوک کی منزلیں طے کیں۔ جب آپ نے منزل مقصود کو پالیا تو آپ کے مرشد نے حکم دیا کہ آپ قصور واپس جائیں۔ قصور میں پنجابی زبان کے دو غیر فانی شعرا سید بلھے شاہ اور سید وارث شاہ آپ کے حلقہ ارادت میں شامل ہوئے۔ خلقت نے بڑی تیزی سے آپ کی طرف رجوع کیا اور ایک قلیل مدت میں آپ اہل قصور کی عقیدت کا مرکز بن گئے۔

کچھ عرصے بعد آپ قصور سے لاہور تشریف لے آئے اور یہاں پہنچ کر آپ نے تدریس علوم ظاہری و باطنی جاری کی۔ آپ بچاسی برس کی عمر پا کر محمد شاہ کے زمانے میں ۱۷۲۸ء میں فوت ہوئے۔ آپ کا مزار لاہور میں چڑیا گھر کے قریب ایک کوٹھی کے احاطے میں ایک اونچے چبوترے پر واقع ہے۔

مولانا عابد لاہوری

آپ بڑے عابد و زاہد تھے۔ آپ کے بارے میں اکثر تذکروں میں لکھا ہے کہ آپ ہر رات نماز تہجد میں ساٹھ دفعہ سورہ یاسین پڑھا کرتے تھے۔ آپ کی علمی مجلس میں تقریباً روزانہ دو سو عالم شریک ہوتے تھے۔ آپ نے پاپیادہ حج کیا۔ واپس آئے تو پھر اپنے معمولات میں مشغول ہو گئے۔ زہد، علم و عمل اور تقویٰ میں آپ یگانہ تھے۔ آپ قرآن پاک کے مفسر تھے۔ آپ نے ۱۷۴۷ء میں رمضان کے مبارک مہینے میں وفات پائی۔

مولانا شہر یار

جب احمد شاہ ابدالی نے لاہور پر قبضہ کیا تھا اس وقت ایک بڑے صاحب دل عالم مولانا شہر یار لاہور میں درس دیا کرتے تھے۔ ان کا مدرسہ چیلیاں والی مسجد میں تھا۔ نہ صرف پنجاب بلکہ ہندوستان کی حدود کے باہر کے لوگ بھی ان کے درس میں شامل ہوتے تھے۔

حافظ روح اللہ لاہوری

حافظ روح اللہ لاہوری ایک نادرۂ روزگار ہستی تھے۔ ان کی زندہ کرامت یہ ہے کہ جب آپ نے حج کا ارادہ کیا اور اس نیت سے جہاز پر سوار ہوئے تو راستے میں رمضان شریف کا چاند نمودار ہوا۔ جس قدر ہمسفر تھے وہ آپ کے علم و تقویٰ سے متاثر تھے۔ انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ آپ تراویح پڑھائیں۔ آپ نے ابھی تک قرآن حفظ نہیں کیا تھا مگر آپ نے ان سے وعدہ کر لیا۔ آپ روزانہ ایک پارہ حفظ کرتے اور رات کو تراویح میں پڑھتے۔ اس طرح تیس دن میں آپ نے قرآن پاک حفظ کر لیا۔ آپ ۱۷۵۷ء میں دنیا میں تشریف لائے۔ بچپن ہی سے آپ کو تحصیل علم کا بڑا شوق تھا۔ مختلف درسگاہوں میں حاضر ہو کر صرف و نحو، منطق، فلسفہ، معانی اور حدیث و تفسیر میں کمال حاصل کیا۔ اپنے اساتذہ میں انہیں مولوی محمد سلیم لاہور سے بہت عقیدت تھی۔ تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد آپ نے درس کا سلسلہ شروع کیا۔ آپ کا انتقال یمن میں ۱۸۲۸ء میں ہوا۔

مولوی غلام فرید

اپنے وقت کے علامہ تھے۔ ظاہری اور باطنی کمالات کے جامع، زاہد و عابد صوفی تھے۔ دنیا داروں سے دور دور رہتے تھے۔ وقت کا بیشتر حصہ درس میں گزارتے۔ باقی جو وقت بچتا اسے ذکر و فکر میں بسر کرتے۔ آپ کے صاحبزادے مولوی غلام رسول اپنے زمانے میں بڑی شہرت کے مالک تھے۔ آپ اگر فلسفہ و منطق میں ید طولیٰ رکھتے تھے تو تفسیر حدیث میں بھی یگانہ روزگار تھے۔ آپ نے ۱۸۳۴ء میں انتقال کیا۔

مولوی جان محمد لاہوری

مولوی جان محمد لاہوری عالم فاضل اور بے نظیر واعظ تھے۔ علم کی ہر شاخ پر ان کی نظر تھی۔ بڑے متقی، پرہیز گار اور سنت کے سخت پابند تھے۔ بڑی مدت تک لاہور میں درس دیتے رہے۔ بہت سی کتابیں لکھیں۔ ان کا وعظ بڑا پر تاثیر ہوتا تھا۔ جو آپ کے وعظ میں شریک ہوتا تائب ہو کر

اٹھتا۔ آپ کے درس میں شامل ہونے والے علم اور عمل کا پیکر بن کر ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گئے۔ انہوں نے پنجاب کے گوشے گوشے میں علم کا نور پھیلایا۔ یہ کہنا واقعات کے خلاف نہ ہوگا کہ پنجاب کا کوئی ضلع ایسا نہ ہوگا کہ جو مولوی جان محمد لاہور کے فیض سے محروم رہا ہو۔ آپ کا درس کشمیری بازار میں مسجد نورالایمان والا میں برسوں قائم رہا۔

مولوی غلام محی الدین بگوی

ضلع جہلم میں ایک گاؤں بگہ ہے۔ یہ کسی زمانے میں بڑا تعلیمی مرکز تھا۔ یہاں ایک خاندان آباد تھا جس میں پشت ہاپشت سے حفاظ چلے آتے تھے۔ اور ان میں سے اکثر صاحب تقویٰ وسجادہ ہوتے تھے۔ مولوی غلام محی الدین بگوی بھی اسی خاندان میں سے تھے۔ آپ کے چھوٹے بھائی مولوی احمد دین بھی حافظ قرآن تھے۔ مولوی غلام محی الدین نے حافظ حسن سے ناظرہ قرآن کریم پڑھا۔ قرآن کریم حفظ کرنے کا واقعہ بھی عجیب وغریب ہے۔ صاحب مدالق الحنیفہ لکھتے ہیں:

> ''آپ نے تھوڑے عرصے میں قرآن کریم ختم کر لیا تھا۔ لیکن چونکہ آپ بڑے خوش آواز تھے اس لیے جب رمضان شریف کا مہینہ آیا تو لوگوں نے آپ کے والد ماجد سے درخواست کی کہ رمضان میں غلام محی الدین سے قرآن سننا چاہیے۔ اس پر آپ کے والد نے پوچھا، محی الدین تم قرآن شریف سنا سکو گے؟ آپ نے عرض کی کہ اگر آپ میرے ساتھ ایک پارہ روز دور کر لیا کریں تو سنا دوں گا۔ اس طرح آپ نے اس رمضان شریف میں قرآن پاک حفظ کر لیا اور سنا دیا۔ آپ سے پوچھا گیا کیا آپ تمام دن میں ایک پارہ حفظ کر لیا کرتے تھے فرمایا نہیں صرف چاشت کے وقت تک ایک پارہ حفظ ہو جاتا تھا۔''

آپ نے علمائے پنجاب سے پڑھنا شروع کیا۔ یہاں سے فارغ ہو کر آپ اپنے چھوٹے بھائی احمد دین کو ساتھ لے کر دہلی پہنچے، اور بارہ برس تک تحصیل علم میں مصروف رہے۔ علم حدیث دونوں بھائیوں نے شاہ عبدالعزیز کے نواسے مولوی محمد اسحاق محدث دہلوی سے پڑھا۔ وہ آپ کی ذہانت سے متاثر ہو کر آپ کو شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں لے گئے۔ انہوں نے حدیث کے

بارے میں بہت سے سوالات کیے جن کا آپ نے تسلی بخش جواب دیا۔ شاہ صاحب بہت خوش ہوئے۔ آپ کے حق میں دعائے خیر کی اور سند حدیث بھی عطا فرمائی۔ جب آپ رخصت ہونے لگے تو نصیحت کی کہ وطن جا کر کوئی ایسی بات نہ کرنا جس سے لوگوں میں تفرقہ پھیلے۔ جاؤ لوگوں کو آپ سے بڑا فیض حاصل ہوگا۔ آپ لاہور واپس آئے اور تیس برس تک لال مسجد میں درس دیتے رہے۔

مولوی احمد دین بگوی

آپ مولوی غلام محی الدین بگوی کے چھوٹے بھائی تھے۔ عجیب اتفاق ہے کہ آپ اپنے بھائی سے تیرہ برس چھوٹے تھے اور آپ کی وفات بھی بھائی کی وفات کے تیرہ برس بعد ہوئی۔ آپ نے شرح وقائع تک اپنے بھائی سے پڑھا۔ پھر بھائی کے ساتھ دہلی چلے گئے۔ وہاں چودہ برس رہے اور مختلف علوم وفنون میں کمال حاصل کیا۔ حدیث شریف آپ نے شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی سے پڑھی اور انہیں سے اجازت حاصل کی۔ آپ ہمہ وقت ذکر الٰہی میں مصروف رہتے یا چلتے پھرتے صحت و بیماری میں طالبان علم کو سبق پڑھاتے۔ مروت کا یہ عالم تھا کہ کوئی طالب علم بیمار ہو جاتا تو اس کے لیے اپنے ہاتھ سے دوا تیار کرتے۔ اسے پلاتے جب تک وہ بیمار رہتا اس کی تیمارداری کرتے۔ آپ چھ ماہ بگہ میں درس دیتے اور چھ ماہ لاہور میں۔ ہزار ہا عالم ان دونوں بھائیوں کے درس سے فیضیاب ہوئے۔ چونکہ آپ ہر وقت درس یا ذکر الٰہی میں مصروف رہتے تھے۔ اس لیے آپ نے بہت کم تصانیف چھوڑیں۔ آپ کا مزار بگہ میں ہے۔

مولوی حافظ غلام رسول

آپ بڑے مشہور اور امیر کبیر گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس خاندان کا مورث اعلیٰ بابا حاجی نور محمد سکھیا ہے۔ ان کا محل سفید رنگ کا تھا۔ آپ اپنے وقت کے بہت بڑے سوداگر تھے۔ آپ کے خاندان میں نسلاً بعد نسل حافظ قرآن ہوتے چلے آئے ہیں۔ آپ تجارت کے ساتھ ساتھ درس و تدریس اور وعظ و تذکیر کا سلسلہ بھی جاری رکھتے تھے۔ آپ محلہ پیر گیلانیاں کی مسجد میں عصر سے لے کر عشا تک وعظ کہتے اور درس دیا کرتے تھے۔ بڑی لمبی عمر پائی۔ ۱۸۴۰ء میں وفات

پائی۔

مولوی محمد دین فوقی

اسی خاندان سے ایک اور فاضل اجل بھی پیدا ہوئے۔ ان کا نام ابوالحسن محمد معروف بہ مولوی محمد دین فوقی تھا۔ آپ ۱۸۵۱ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ سب سے پہلے قرآن پاک حفظ کیا۔ پھر لاہور، کشمیر اور دیگر مقامات پر مشاہیر علما سے استفادہ علوم کیا۔ آپ کا وعظ بڑا پر تاثیر ہوتا تھا۔ بڑی چھوٹی عمر میں آپ نے سند فضیلت حاصل کی۔ ابھی آپ بیس برس کے نہ ہوئے تھے کہ صاحب درس ہو گئے۔ آپ نے بادشاہی مسجد میں بھی وعظ کیا جہاں نامی علما موجود ہوتے تھے۔ یہیں آپ کا تعارف خان بہادر فقیر شمس الدین سے ہوا جو آخر دم تک آپ کی قدر کرتے رہے۔ آپ نے پنجاب یونیورسٹی کے بہت سے امتحانات پاس کیے۔ ۱۸۷۳ء میں آپ اورینٹل کالج میں استاد لے لیے گئے۔ آپ عربی فارسی کے علاوہ انگریزی بھی جانتے تھے۔

مدرسہ شیخ جان محمد سہروردی

جس جگہ آج کل گنبد نصرت جنگ واقع ہے یہاں ایک عظیم الشان مسجد اور مدرسہ ہوتا تھا۔ یہ مسجد قصاب خانے کی مسجد کہلاتی تھی۔ یہاں آپ درس دیا کرتے تھے۔ آپ نہایت فاضل، ظاہری اور باطنی کمال کے جامع تھے۔ آپ کی بے نیازی اور استغنا کا یہ عالم تھا کہ آپ سے ہزاروں آدمی پڑھتے مگر آپ کسی سے کچھ نہ لیتے تھے۔ کوئی کچھ پیش کرتا بھی تو آپ انکار کر دیتے۔ چکی پیس کر روٹی کماتے۔ درس کے علاوہ آپ مسجد کے امام بھی تھے۔ مفتی غلام سرور کا بیان ہے کہ جب میاں صاحب کا چرچا عام ہوا تو لوگوں نے درخواست کی کہ آپ ہماری مسجدوں میں بھی وعظ شروع کریں۔ آپ نے اپنے مرید کو وہاں بھیج دیا۔ آپ کا مزار مسجد کے متصل بنایا گیا۔

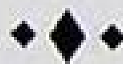
ملا بایزید

نویں صدی ہجری کے وسط میں گیلان کا ایک سید گھرانا وہاں سے ہجرت کر کے ملتان میں آباد ہوا۔ یہ خانوادہ اپنے علاقہ میں علمی شہرت رکھتا تھا۔ ادب سے اور مذہبی علوم سے بھی لگاؤ تھا۔

ملتان پہنچ کر اس خاندان کے جس بزرگ نے سب سے پہلے گمنامی سے نکل کر شہرت حاصل کی وہ سید نجم الدین تھے۔ بابر بادشاہ انہیں دہلی لے گیا۔ ان کے بعد ان کے بیٹے بایزید نے علوم وفنون میں کمال حاصل کرنے کے بعد سند فضیلت حاصل کی۔ دہلی سے لاہور آئے اور یہاں درس شروع کر دیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں آپ کی ذات مرجع خلائق بن گئی۔ علم کے پیاسے آپ کی خدمت میں آتے فیضیاب ہوتے اور صاحب درس بن کر نکلتے۔

مولوی عبدالحکیم گیلانی

ملا بایزید کے تین بیٹے تھے۔ مگران تینوں میں سے سید عبدالحکیم کو سب سے بڑھ کر شہرت ملی۔ وہ جہانگیری دور حکومت میں جوان ہوئے۔ علوم وفنون میں کمال حاصل کیا اور باپ کی گدی سنبھالی۔ انہوں نے اس جوش وخروش سے کام کیا کہ تھوڑے ہی عرصے میں ہر جگہ ان کا نام گونجنے لگا۔ انہوں نے بڑی لمبی عمر پائی۔ ان کا مقبرہ شاہ شمس قادری کے مزار کے مغرب کی طرف گورنمنٹ ہاؤس کے جنوب میں واقع تھا۔ مولوی عبدالحکیم بڑے متوکل اور قناعت پسند بزرگ تھے۔ دربار شاہی میں حاضری کے لیے آپ کو بار بار دعوت دی گئی۔ مگر آپ ہر بار ٹال دیتے اور پوری دل جمعی سے درس وتدریس میں مصروف رہے۔ آپ اخلاق حسنہ کے پیکر تھے۔ شاگردوں کے لیے آپ کی ذات ہمیشہ چشمہ فیض رہی۔



لاہور کے قدیم وجدید فنکار

لاہور کے آسمان نے داتا کی نگری میں ایسے ایسے باکمال فنکاروں، موسیقاروں اور دانشوروں کو گلی کوچوں اور بازاروں میں چلتے پھرتے دیکھا ہے کہ جن میں سے کسی ایک کا ثانی ملنا مشکل ہے۔ علمائے کرام اور دانشوروں کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ یہاں میں لاہور کے کچھ عظیم فنکاروں اور موسیقاروں کا تذکرہ کرنا چاہوں گا۔ ان میں سے کچھ کو میں نے اپنی آنکھوں سے چلتے پھرتے باتیں کرتے دیکھا ہے۔ کچھ میری ہوش سے پہلے کے ہیں۔ ان کا ذکر میں ان کی زبانی آپ کو سناؤں گا جو انہیں جانتے تھے اور ان کے فن سے بخوبی واقف تھے۔ ریڈیو پاکستان سے منسلک ہونے کی وجہ سے مجھے بعض نامور فنکاروں کو قریب سے دیکھنے اور ان کی باتیں سننے کا موقع ملا۔ سب سے پہلے میں لاہور بلکہ مشرق کے عظیم مصور عبدالرحمٰن چغتائی کا ذکر کروں گا۔ چغتائی صاحب کو پہلی بار میں نے غالباً ۱۹۴۹ء میں دیکھا یا ہو سکتا ہے اس سے ایک دو سال بعد دیکھا ہو۔ ان کے فن کی عظمت سے میں واقف تھا۔ وہ افسانے بھی لکھتے رہے تھے اور میں ان کے افسانے جہازی سائز کے رسالے ''ادبی دنیا'' میں امرتسر کی لائبریری میں بیٹھ کر پڑھا کرتا تھا مگر سب سے زیادہ متاثر میں ان کی تصویروں سے ہوا تھا۔ ان کی لکیر بڑی زندہ اور بولتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ وہ دیوان غالب کو مرقع چغتائی کے نام سے مصور کر چکے تھے۔ یہ بھی بڑے کمال کی تصویریں تھیں اور ہر تصویر میں غالب کے متعلقہ شعر کے موڈ کو پوری طرح قابو میں کیا گیا تھا۔

لاہور میں ۱۹۴۷ء میں آ کر جب میں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا تو میری شناسائی ادبی حلقوں سے ہو گئی۔ لاہور میں ناشرین کے دو بڑے مستند ادبی ادارے تھے۔ ایک مکتبہ اردو اور دوسرا نیا ادارہ۔ ان کے علاوہ مکتبہ جدید بھی قائم ہو گیا تھا۔ مکتبہ اردو کی طرف سے ''ادب لطیف'' رسالہ نکلتا تھا اور نیا ادارہ کی طرف سے رسالہ ''سویرا'' شائع ہوتا تھا۔ نیا ادارہ کے مالک چودھری نذیر احمد طباعت اور شعر و ادب کا بڑا اعلیٰ اور معیاری ذوق رکھتے تھے۔ اپنی خوش مذاقی اور فراخدلی کے باعث ادیبوں کے ساتھ بھی ان کے تعلقات بڑے اچھے تھے۔ ہمارے ساتھ وہ اکثر لاہور کی

گلی کوچوں میں گھومتے پھرتے اور چائے خانوں میں بیٹھ کر چائے بھی پیتے۔ ادیبوں سے ان کی دوستی تھی۔ وہ ان پبلشروں میں سے تھے جنہوں نے پاکستان میں اردو کی اعلیٰ ترین کتابیں چھاپیں اور اس فن کو آغاز ہی میں ایک معیاری راہ پر ڈالا۔ میرے افسانوں کی پہلی کتاب ''منزل منزل'' (بلکہ میری پہلی کتاب) چودھری نذیر صاحب نے ہی چھاپی۔ اس زمانے میں کتابیں لتھو پر چھپتی تھیں۔ مگر چودھری نذیر احمد کی لتھو پر چھاپی ہوئی ادبی کتابیں سارے ملک کے اہل ذوق سے داد وصول کرتی تھیں۔ آج اگر آپ چودھری صاحب کی لتھو پر چھپی ہوئی کتابیں دیکھیں تو وہ آف سیٹ پر چھپی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

چودھری صاحب کا ارادہ تھا کہ میری کتاب کا سرورق چغتائی صاحب سے بنوایا جائے۔ مگر کچھ ایسا اتفاق ہو گیا کہ چغتائی صاحب کسی اہم کام میں بے حد مصروف تھے۔ میں ذکر چغتائی صاحب سے پہلے اپنی پہلی ملاقات کا کر رہا تھا۔ نیا ادارہ کے مالک چودھری نذیر مجھے ساتھ لے کر عبدالرحمٰن چغتائی صاحب کے گھر گئے۔ مجھے یاد ہے یہ گھر بھاٹی اور ٹکسالی دروازے کے درمیان راوی روڈ پر مسیحی قبرستان کی ایک بغلی گلی میں تھا۔ چغتائی صاحب کے کمرے میں کتنے ہی کینوس ادھر ادھر پڑے تھے اور کھرل میں کوئی رنگ پیس رہے تھے۔ بس اس سے آگے مجھے کچھ یاد نہیں رہا کہ چودھری نذیر احمد نے اس عظیم مصور سے کیا باتیں کیں اور انہوں نے کیا جواب دیا۔ چغتائی صاحب کی مونچھیں ہٹلر کی طرح تھیں اور چہرے کے خدوخال مضبوط تھے واپسی پر چودھری صاحب نے مجھے بتایا کہ چغتائی بے حد محنت کرتے ہیں۔ محنت ہی سے کسی فن میں گہرائی آتی ہے۔ چودھری صاحب کی ادب اور فن پر اور زندگی کے بعض دوسرے حقائق پر اس قسم کی تجربہ کارانہ اور دانش مندی کی باتیں میرے لیے بڑی مشعل راہ ثابت ہوئیں اور اس کے لیے میں ان کا آج بھی ممنون احسان ہوں۔ بہر حال اس کے بعد چغتائی صاحب کو میں اکثر دیکھتا کبھی ''سویرا'' اور کبھی مکتبہ اردو کے دفتر میں اور کبھی کسی ادبی مجلس میں۔ وہ زیادہ باتیں نہیں کرتے تھے۔ اکثر انگریزی سوٹ میں ملبوس ہوتے اور ان کے سر پر قراقلی ٹوپی ہوتی تھی۔ چہرے پر دانشوروں ایسی متانت چھائی ہوتی۔

تاج الدین زریں رقم کی بیٹھک لوہاری کے اندر مٹی کے برتنوں کی ایک دکان کے اوپر ہوتی تھی۔ یہاں بھی میں چودھری نذیر کے ساتھ ہی گیا اور تاج الدین زریں رقم کے پہلی بار نیاز حاصل

ہوئے۔ ایسے خوش نویس زمانہ بڑی دیر کے بعد پیدا کرتا ہے۔ اونچے لمبے خوش شکل، بھرپور جوان، شگفتہ باتیں، بلند آہنگ آواز، فن میں یکتا، فن خوش نویسی کی تدریس اور اس فن کے نومشقوں کے واسطے اب ت کا قاعدہ لکھا جو آج بھی خوش نویس طلبا کی راہنمائی کرتا ہے۔ میں اس فن کی گہرائیوں سے واقف نہیں ہوں مگر لفظ کے حسن کا مجھ پر بے پناہ اثر ہوتا ہے۔ زریں رقم مسطر پر لفظوں کی صورت میں موتی پروتے تھے۔ خداداد صلاحیت کے مالک تھے۔ بڑی جلدی ہم سے جدا ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے آمین۔

سید محمد یوسف سدیدی بھی ہم سے جدا ہو گئے۔ فلک نے ایسا خوش رقم بلکہ پاکیزہ رقم خوش نویس بھی کم دیکھا ہوگا۔ جیسا خوت صورت لکھتے تھے ویسے ہی خود بھی خوب صورت تھے۔ مجھے یاد ہے۔ شروع شروع میں جب امروز کو حسرت صاحب ایڈیٹ کیا کرتے تھے تو میں ایک روز یوسف صاحب کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ وہ پھٹے سے ٹیک لگائے اخبار کی کوئی بڑی سرخی لکھ رہے تھے۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا:

"حافظ صاحب! آپ بڑے خوب صورت ہیں اور لکھتے بھی خوب صورت ہیں۔"

یوسف صاحب شرما گئے۔ بڑے کم گو اور شرمیلے تھے۔ مگر کیا حسن اور بلاغت دی تھی اللہ نے ان کے قلم کو۔ ان کا قلم کاغذ پر یوں متوازن اور بھرپور قشقہ کھینچتا چلا جاتا کہ محسوس ہوتا یوسف صاحب کے قلم سے روشنائی نہیں نکل رہی بلکہ پورے کا پورا لفظ اپنی حسین ترین مکمل صورت میں نکل کر کاغذ پر نقش ہوتا چلا جا رہا ہے۔ سعودی عرب میں کار کے ایک حادثے میں زخمی ہو کر جب وہ ہسپتال میں پڑے تو یہاں سبھی ان کی صحت یابی کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا گو تھے۔ لیکن موت کا تو ایک وقت معین ہوتا ہے۔ اسے کون ٹال سکتا ہے۔

گوجرانوالہ کے محمد حسین صاحب اپنے فن کے یکتائے زمانہ خوش نویس ہیں۔ مکتبہ اردو، نیا ادارہ کے شعری مجموعوں کی تقریباً ساری کتابت انہی کے خط زرنگار کی مرہون منت ہے۔ میری پہلی کتاب "منزل منزل" کے دونوں الفاظ انہوں نے ہی لکھے تھے اور کیا زندہ جاوید الفاظ لکھ دیے تھے کہ جو سرورق دیکھتا دیکھتا ہی رہ جاتا۔ محمد حسین صاحب زیادہ تر نظم لکھتے ہیں اور سرخیاں۔ ان جیسا باکمال خوش نویس اب کہاں ملے گا۔ مجھے یاد ہے ہم "سویرا" کے دفتر میں بیٹھے تھے۔ یہ ۴۹-۱۹۴۸ء کی بات ہوگی۔ محمد حسین صاحب بھی موجود تھے۔ چودھری نذیر صاحب نے انہیں

میری کتاب کا عنوان لکھ کر دیا اور کہا، ''بس تم نے یہی دو لفظ لکھنے ہیں اور یہی اس کتاب کا سرورق ہوگا۔'' محمد حسین صاحب مسکرا رہے تھے۔ کاغذ پر لکھے ہوئے منزل منزل کے الفاظ پڑھ کر سر کو اثبات کے انداز میں ہلایا اور کہا:

''گاؤں جا کر لکھوں گا۔''

شاید ہفتہ دس دن کے بعد وہ لاہور آئے تو مطلوبہ الفاظ لکھ کر ساتھ لائے تھے۔ منزل منزل کے کتابت شدہ الفاظ کاغذ پر پڑے سانس لیتے محسوس ہو رہے تھے۔ محمد شفیع خوش نویس تھا۔ مکتبہ اردو اور نیا ادارہ کی اکثر نثری کتابوں کی کتابت اسی نے کی ہوئی ہے۔ کس قدر بے مثال خوش نویس تھا۔ کس کس کا ذکر کروں۔ اس میدان میں ایک سے ایک بڑھ کر تھا۔ اب یہ فن بھی گوشہ نشین ہو گیا ہے۔ کیونکہ کتابیں کمپوز ہونے لگی ہیں۔ یہ کام اب مشینیں سرانجام دینے لگی ہیں۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ تاریخ میں یہ نشیب و فراز آتے ہی رہتے ہیں۔ زمانہ آگے بڑھتا رہتا ہے۔ جس فن کی زمانے کو ضرورت ہوتی ہے وہ شکل بدل کر زمانے کے ساتھ وابستہ رہتا ہے۔

میں نے ریڈیو پاکستان سے اپنی وابستگی اور کچھ بے مثال فنکاروں کا ذکر شروع میں کیا تھا کہ جن کو قریب سے دیکھنے کا مجھے موقع ملا۔ کثیر تعداد ایسے فنکاروں کی تھی جن کا قافلہ میرے سفر شروع ہونے سے پہلے گزر چکا تھا۔ ان کا ذکر میں ان اساتذہ کے حوالے سے بیان کروں گا جو ان سے مل چکے تھے۔ اور جوان فنکاروں کی فنی گہرائیوں سے بھی واقف تھے۔ بہتر ہوگا کہ پہلے میں گزرے ہوئے قافلے کے فنکاروں کا ذکر کروں۔

محترم سراج نظامی لاہور کے جانے پہچانے ادیب، صحافی اور دانشور تھے۔ اپنے ایک مضمون میں لاہور کے کچھ نابغہ روزگار فن کاروں کا تذکرہ انہوں نے بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ لاہور کے نامور کلاسیکل موسیقار استاد کالے خان کے بارے میں وہ لکھتے ہیں: ''آپ پنجاب کے مردم خیز خطے قصور کے کاونت خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ استاد کالے خاں کا رنگ بہت سیاہ تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی اور تن و توش پہلوانوں ایسا تھا۔ چہرے پر بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ انہیں کالے خاں کے نام سے پکارا جاتا۔ طبیعت عجیب پائی تھی۔ ہمیشہ کھوئے کھوئے سے رہتے تھے۔ عام لوگوں میں اس بات کا بڑا چرچا تھا کہ ایک مرتبہ اپنے استاد فتح علی خاں سے مل کر گانے لگے تو مقابلے پر اتر آئے۔ فتح علی نے شاگرد کی طرف دیکھ کر کہا، ''جارے پگلے'' بس اسی دن سے ان کی

طبیعت میں ایک جنون کی سی کیفیت پیدا ہوگئی۔ کالے خاں نے پنجاب اور ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور استادوں سے داد وصول کی۔ آپ خیال یا ترانہ گاتے اور تانیں مارتے تو یوں لگتا جیسے کوئی شیر دھاڑ رہا ہے۔ مجھے (محترم سراج نظامی) اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بار کالے خاں اور بھائی روزہ گار ہے تھے۔ میں ان دنوں اسلامیہ ہائی اسکول بھاٹی گیٹ میں پڑھتا تھا۔ مجھے ان کی تانیں بھاٹی گیٹ اسکول کی گراؤنڈ میں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

کالے خاں حویلی میاں خان کے سامنے کٹڑہ نادر شاہ میں رہا کرتے تھے۔ ایک دن کالے خاں نے خوب گھی اور مسالے ڈال کر گوشت بھونا اور دیگچی کو الماری میں رکھ کر تالا لگا دیا۔ اتفاق سے پولیس کسی چوری کی تفتیش کے سلسلے میں محلے میں آگئی۔ انہوں نے جو دیکھا کہ ایک کوٹھڑی میں ایک کالا کلوٹا پہلوان لنگوٹ باندھے بیٹھا ہے تو انہوں نے شبہ میں ان کی کوٹھڑی کی بھی تلاشی لینی چاہی۔ کالے خاں اچھل کر کھڑے ہوگئے اور الماری کے ساتھ پشت لگا کر بولے، ''الماری کے سوا ہر جگہ کی تلاشی لے لو۔'' پولیس والوں کا شبہ یقین میں بدل گیا اور سپاہی الماری کی تلاشی لینے پر مصر ہوئے لیکن جب تلاشی لی گئی تو اس میں سے بھنے ہوئے گوشت والی دیگچی کے سوا اور کچھ نہ نکلا۔ پولیس والے ہنسنے لگے۔ کالے خان نے کہا، ''اب یہ گوشت تم ہی لے جاؤ۔ میں نہیں کھاؤں گا۔ اسے نظر لگ گئی ہے۔''

کالے خاں کا معمول تھا کہ ہر روز گوشت بھونتے، تیل، صابن اور لنگوٹ ایک چھتری میں ڈالتے اور ٹکسالی دروازہ کے باہر کارپوریشن کے باغ میں پہنچ جاتے۔ چھتری زمین میں گاڑ دیتے لنگوٹ کستے، تیل ملتے اور پھر دونوں ہاتھوں کے نیچے دو اینٹیں رکھ کر ڈنڈ مارتے۔ ساتھ ساتھ تانیں بھی مارتے جاتے۔ کسرت کے بعد نہر میں نہاتے۔ گوشت کھاتے اور واپس چل پڑتے۔ ایک مرتبہ اسی حالت میں آرہے تھے کہ کسی نے انہیں اپنے پاس بٹھالیا اور پردیپکی راگ سنانے کی فرمائش کی۔ کالے خاں کہنے لگے، یہ کون سا راگ ہے؟ پھر چند سیکنڈ کے بعد کہا:

''او بھئی پردیپکی راگ آگیا ہے۔''

پھر جو راگ شروع کیا تو ایک سماں بندھ گیا۔

ایک دفعہ لاہور کے ایک مشہور ڈیرہ دار نے موسیقی کی محفل منعقد کی اور کالے خان کو بھی

گانے کی دعوت دی۔ قصور کے نامور سارنگی نواز استاد غلام محمد سے کالے خاں کی بول چال نہیں تھی۔ لوگوں نے خواہش کی کہ کالے خاں گائیں اور استاد غلام محمد سارنگی نواز ان کے ساتھ سنگت کریں۔ جن لوگوں نے یہ محفل دیکھی ہے اور کالے خاں کا گانا اور غلام محمد کی سارنگی سنی ہے وہ آج بھی سر دھنتے ہیں۔ دونوں فنکاروں نے اپنے فن کا پورا زور صرف کر دیا۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ دونوں فنکار رونے لگے اور روتے روتے ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے۔ یوں دونوں کی صلح ہو گئی۔

کالے خاں کی وفات سے چند روز پہلے کا واقعہ ہے کہ انہوں نے لکھنؤ میں گانا سنایا جہاں سے کافی انعام ملا۔ کالے خاں سیدھے دریائے گومتی پر پہنچے۔ پچاس روپے دریا میں پھینک کر کہا:

''اے خواجہ خضر! یہ تیری نذر ہیں۔''

اس کے بعد لکھنؤ کے ایک بازار میں سیدھے اصغر علی محمد علی عطر فروشوں کی مشہور دکان پر پہنچے اور آدھی سے زیادہ رقم کا عطر خرید لیا۔ وہیں کھڑے کھڑے تھوڑا سا عطر اپنے کپڑوں پر لگایا اور باقی سارا عطر اپنی بڑی بڑی مونچھوں پر مل دیا۔ عطر والوں نے حیران ہو کر پوچھا، ''خان صاحب یہ کیا کیا آپ نے؟'' کالے خاں نے کہا:

''بھیا! یہ کپڑے تو یہیں رہ جائیں گے۔ مونچھیں تو قبر میں بھی ساتھ جائیں گی۔''

اس کے کچھ روز بعد کالے خاں کا انتقال ہو گیا۔''

محترم سراج نظامی صاحب پٹیالہ گھرانے کے نامور موسیقار استاد عاشق علی خاں کے بارے میں لکھتے ہیں: ''عاشق علی خان پٹیالے کے مشہور موسیقار فتح علی خاں کے بیٹے تھے۔ ابھی چھوٹے ہی تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اور لاہور چلے آئے۔ یہاں کسمپرسی کے عالم میں رہنے لگے۔ انہوں نے اپنے ماموں سے گانے کی تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی اور دیکھتے دیکھتے عاشق علی خاں اپنے زمانے کے نامور گویے بن گئے۔ ہندوستان میں جس طرف گئے اپنے فن کا لوہا منوایا۔ ایک مرتبہ کلکتے میں ایک میوزک کانفرنس میں طبلہ نواز احمد جان تھرکوا نے سنگت کرنے سے پہلے پوچھا، ''کون سا تال بجاؤں۔'' عاشق علی خاں نے کہا جونسا آپ کا جی چاہے۔ پھر جو گانا شروع کیا، تانیں اڑائی اور گر کپٹر نے شروع کیے تو سامعین کا یہ حال تھا کہ کرسیوں سے اچھل اچھل پڑتے تھے۔ طبیعت میں لاابالی پن اور وارفتگی تھی۔ اس زمانے میں لاکھوں روپے کمائے مگر ایک

کوڑی بھی نہ بچائی۔ شادی ساری عمر نہیں کی۔ اللہ توکل رہتے تھے۔ جو ملا صبر شکر کر کے کھالیتے۔ جہاں سے گانے کے روپے ملتے وہیں مستحق لوگوں میں بانٹ کر دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوتے۔ خوش لباس تھے۔ انگریزی سوٹ بڑے شوق سے پہنتے تھے۔ ان کے شاگرد حسن لطیف کا بیان ہے کہ ایک بار گھر سے گرم انگریزی سوٹ پہن کر نکلے۔ تھوڑی دیر بعد واپس اس حالت میں گھر میں داخل ہوئے کہ جسم پر صرف جانگیہ ہی تھا۔ حسن لطیف نے پوچھا خان صاحب سوٹ کہاں چلا گیا؟ عاشق علی خاں نے کہا:

"سڑک پر ایک ننگا فقیر سردی میں ٹھٹھر رہا تھا۔ اسے دے دیا ہے۔"

اتنا بڑا گویا ہونے کے باوجود عاشق خاں میں غرور نام کو نہ تھا۔ بچوں کی طرح بھولی بھالی باتیں کیا کرتے تھے۔ میں نے (صاحب مضمون) عاشق علی خاں کو صرف ایک بار ہی دیکھا ہے۔ دبلے پتلے، گہرا سانولا رنگ، سر پر قراقلی کی ٹوپی، سفید شارک اسکن کا سوٹ، کالے بوٹ، سر کو کسی دھن میں ادھر ادھر ہلاتے ایک بازار میں سے نکل کر گلی میں داخل ہو رہے تھے۔

محترم سراج نظامی صاحب استاد عبدالوحید خاں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ قصبہ کیرانہ کے باشندے تھے۔ ان کا گھرانہ موسیقی کا بڑا گھرانہ تھا۔ جن میں بندے علی خاں بینکار اور عبدالکریم خاں ایسے مشہور موسیقار ہو گزرے ہیں۔ آپ موسیقی کے استاد تھے۔ کانوں سے تھوڑے بہرے تھے جس کی وجہ سے انہیں بہرے خاں بھی کہا جاتا تھا۔ استادی کا یہ عالم تھا کہ جب کبھی ان کی بات ہوتی تو لوگ کان پکڑ لیتے اور کہتے۔ "ہاں! وہ بہرا" انہوں نے بڑی بڑی ریاستوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور داد پائی۔ حقیقت یہ ہے جتنا صحیح راگ وہ گاتے تھے اور کوئی نہ گاتا تھا۔ خود کہا کرتے تھے کہ میرے بعد صرف اللہ دتا کی موسیقی کا ہی لطف آ سکتا ہے۔ خان صاحب عبدالوحید خان لاہور میں مقیم ہو گئے تھے کیونکہ وہ ایک بزرگ نفیر عالم صاحب کے مرید ہو گئے تھے۔ مرشد کے جیتے جی ان کا مزار باغبانپورے کے قریب بنوا دیا تھا۔ جب ان کا انتقال ہوا تو انہیں وہیں دفن کیا اور پھر اپنے وطن چلے گئے۔

خان صاحب عبدالوحید خاں بمبئی میں کافی عرصہ رہے اور وہاں بھی اپنی مہارت کا سکہ جمایا۔ آل انڈیا ریڈیو کے مختلف اسٹیشنوں سے کلاسیکی موسیقی نشر کی۔ خاں صاحب کا دستور تھا کہ جب گانے لگتے تو "یا اللہ" کے الاپ سے راگ شروع کرتے۔ آل انڈیا ریڈیو والوں نے

اعتراض بھی کیا مگر انہوں نے اپنی عادت نہ بدلی، اور ہر راگ ''یا اللہ'' کے الاپ سے ہی شروع کرتے رہے۔ ان کے شاگردوں میں فیروز نظامی، بھائی لال، وحیدہ خانم اور اختری بائی فیض آبادی بہت مشہور ہیں۔

خواجہ خورشید انور لاہور کے شہرۂ آفاق بیرسٹر خواجہ فیروز الدین کے صاحبزادے تھے۔ ان کا شمار شوقیہ موسیقاروں میں ہوتا تھا۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں تعلیم پائی اور ایم اے کی ڈگری لی۔ بچپن ہی سے موسیقی سے لگاؤ تھا۔ کالج کی زندگی میں ہی گانے لگے تھے۔ پھر بمبئی چلے گئے جہاں کئی فلموں کی کامیاب موسیقی دی۔ پاکستان بننے کے بعد لاہور آ گئے اور یہاں فلم کڑمائی، جھومر، انتظار اور کوئل کی موسیقی دی، جن کے گانے بے حد مقبول ہوئے۔ ان کا ایک مخصوص رنگ تھا جس کی وجہ سے وہ فوراً پہچان لیے جاتے ہیں۔

حیدر بخش فلو سے خاں کے تذکرے میں سراج نظامی لکھتے ہیں کہ یہ بھی خطہ قصور کے مطربوں سے تعلق رکھتے تھے اور نہایت ماہر سارنگی نواز تھے۔ انہوں نے کچھ عرصہ گراموفون کمپنیوں اور تھیٹروں میں بھی اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ پھر عنایت بائی ڈھیرو والی کے ساتھ سنگت کرنے لگے۔ فلموں میں بھی سارنگی بجائی۔ آخر میں ریڈیو پاکستان لاہور سے منسلک ہو گئے۔ بے حد شریف، کم زبان اور مرنجاں مرنج انسان تھے۔ سانولا رنگ، لحیم شحیم جسم، دراز قد، موٹے موٹے نقش، ململ کا کھلی آستین والا کرتہ، نیچے سفید تہمد، ہاتھ میں بیٹر، خراماں خراماں چلتے اور پھونک پھونک کر قدم رکھتے تھے۔ اچھے خاصے پہلوان معلوم ہوتے تھے۔ کوئی ناواقف ان کو دیکھ کر یہ خیال بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ موسیقی سے تعلق رکھتے ہیں۔ کھاتے بھی بہت تھے۔ ان کی بسیار خوری کے متعلق ایک لطیفہ مشہور ہے۔ موری دروازے کے باہر چنگڑ محلے میں ایک ہندو ہوٹل تھا۔ ہوٹل والوں کی شامت آئی کہ انہوں نے ہوٹل کے باہر لکھ کر لگا دیا، ''سالن لیجیے، چپاتیاں مفت۔''

ایک دن استاد فلو سے خان وہاں جا پہنچے۔ دو تین قسم کے سالن کا آرڈر دیا اور کھانے بیٹھ گئے۔ چپاتیاں آنے لگیں، دو چار، آٹھ، دس ہوٹل کا بیرا جب بھی پوچھتا کہ اور لاؤں تو وہ کہتے ہاں بھائی لیتے آؤ۔ ہوٹل والے اپنے اعلان کی وجہ سے مجبور تھے۔ روٹیاں دیتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ گندھا ہوا آٹا ختم ہو گیا اور ہوٹل والے استاد کے آگے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ چند روز کے بعد استاد فلو سے خاں کی طبیعت نے پھر جوش مارا اور پھر اسی ہوٹل میں جا دھمکے لیکن سخت مایوس

ہوئے۔ کیونکہ ہوٹل والوں نے چپاتیاں مفت والا بورڈ اتار کر پھینک دیا تھا۔

اس تن و توش کے باوجود استاد فلو سے خان بڑے نازک مزاج تھے۔ ایک دفعہ بیمار پڑ گئے۔ بیوی نے ڈاکٹر سے مشورہ کرنے کو کہا۔ رضا مرزا کا مطب پاس ہی تھا مگر استاد فلو سے خان کو وہاں جانے کا حوصلہ نہ ہوا۔ کہا کہ ڈاکٹر صاحب کو یہیں بلا لو۔ ڈاکٹر صاحب آ گئے۔ انہوں نے استاد کا اچھی طرح سے معائنہ کرنے کے بعد ٹیکہ تجویز کیا۔ استاد بہت گھبرائے۔ لجاجت سے کہا:

''ڈاکٹر صاحب کوئی اور دوائی تجویز کر دیں۔''

ڈاکٹر صاحب نے پوچھا:

''ٹیکے میں کیا قباحت ہے۔ جلدی اچھے ہو جائیں گے۔''

استاد فلو سے خان نے عاجزی سے کہا:

''ڈاکٹر صاحب مجھے ٹیکہ نہ لگائیں میں مر جاؤں گا۔''

ڈاکٹر نے سنی ان سنی کرتے ہوئے ٹیکے کا سامان نکالنا شروع کر دیا۔ استاد نے نہایت حسرت بھری نظروں سے بیوی کی طرف دیکھا اور کہا:

''کیا مجھے اپنے سامنے ہی مروا دو گی۔''

لاہور ریڈیو والوں نے ایک بار ان سے انٹرویو لیا اور پوچھا:

''استاد جی، آپ کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟''

استاد نے برجستہ جواب دیا۔

''میں تو یہ چاہتا ہوں جی کہ اللہ دے اور بندہ کھائے۔''

بابا علی بخش نے سارنگی نوازی کے رموز اپنے بزرگوں سے حاصل کیے۔ نوجوانی میں لاہور چلے آئے۔ کوچہ لٹھ ماراں اندرون موچی دروازہ میں رہائش اختیار کی۔ سانولا رنگ، دراز قامت، تیز نقش، ڈاڑھی مہندی سے رنگی ہوئی ہوتی۔ بڑے بڑے استادوں کے ساتھ سنگت کی۔ صوم وصلوٰۃ کے بڑے پابند تھے۔ زیارات عراق وعرب، نجف اشرف اور کربلائے معلیٰ سے مشرف ہونے کے بعد صرف مجالس میں سوز خوانی کرتے تھے۔ قیام پاکستان سے پہلے ایک سو پانچ برس کی عمر پا کر انتقال کیا اور قبرستان مومن پورہ لاہور میں دفن ہوئے۔

استاد بڈھے خان کا تعلق بھی قصور کے خاندان سے تھا۔ لاہور کے موچی دروازے کے اندر

رہتے تھے۔ دہلی والے کالے خان کے شاگرد تھے۔ اپنے فن کے ماہر تھے۔ بڑے وضعدار اور بانداق تھے۔ لاہور کے رئیسوں میں ان کی بڑی عزت و منزلت تھی۔ بے حد خوش عقیدہ تھے۔ محرم کا چاند دیکھتے ہی جوتی اور پگڑی اتار دیتے اور امام حسین کے سوئم کے بعد پھر پہنتے۔ نویں محرم کو ہر سال بڑی باقاعدگی سے نیاز دیتے۔ ان کا انتقال ۱۹۴۱ء میں ہوا اور قبرستان میانی صاحب میں مدفون ہوئے۔

سراج نظام صاحب آگے چل کر ایک قوال کا ذکر یوں کرتے ہیں۔ علی بخش خان لاہور کے بڑے پرانے قوالوں میں سے تھے۔ سانولا رنگ بھاری جسم۔ ساری عمر داتا گنج بخش کے مزار پر قوالی کرتے رہے۔ اردو، فارسی، پنجابی کلام بڑی خوش اسلوبی اور صحت سے سناتے تھے۔ قوالی کے ساتھ طنبورہ یا ستار بجاتے تھے۔ طبیعت بڑی شگفتہ تھی۔ بذلہ سنجی میں بے مثال تھے۔ ایک مرتبہ قلعہ جرسنگھ کی ایک محفل میں قوالی کرنے لگے۔ وہاں ایک جعلی پیر صاحب جو بورے والا کے قصاب تھے، پہلے سے بیٹھے تھے۔ علی بخش خاں کو معلوم تھا کہ یہ قصاب ہے اور پیری مریدی کا اس نے محض ڈھونگ رچایا ہوا ہے۔ علی بخش خان نے قوالی شروع کی تو جعلی پیر نے دائیں بائیں اپنے مریدوں پر ایک نگاہ ڈالی اور پھر حال کھیلنا شروع کر دیا۔ علی بخش خان اپنے معمول کے مطابق قوالی کرتا رہا۔ اچانک جعلی پیر نے کڑک کر پوچھا؟ کیا ہو رہا ہے۔

علی بخش خان نے کہا:

"قوالی ہو رہی ہے۔"

جعلی پیر نے پوچھا۔

"تم کون ہو؟"

علی بخش نے جواب دیا۔

"داتا کا قوال ہوں۔"

جعلی پیر نے کڑک کر پوچھا:

"میں کون ہوں؟"

علی بخش نے برجستہ جواب دیا:

"بورے والا کا قصائی۔"

یہ سنتے ہی پیر صاحب کا حال اتر گیا اور محفل کشت زعفران بن گئی۔ ماسٹر صادق علی بفضل تعالیٰ حیات ہیں اور ملک کے سب سے زیادہ ذہین اور مشاق پیانو نواز ہیں۔ محترم سراج نظامی نے بھی ان پر کچھ سطریں لکھی ہیں اور میں بھی ماسٹر صاحب کو بخوبی جانتا ہوں۔ وہ بھی مجھے عزیز رکھتے ہیں۔ میں ریڈیو کی کینٹین پر جاؤں اور ماسٹر صاحب وہاں موجود ہوں تو میری ذرا سی آواز پر پہچان جاتے ہیں اور بے اختیار پکار اٹھتے ہیں:

''حمید صاحب آئے ہیں۔''

ماسٹر صادق نابینا ہیں مگر قدرت نے بلا کا حافظہ دیا ہے۔ میاں امام الدین ڈھولکی والے کے صاحبزادے ہیں۔ پہلے طبلہ نواز تھے اور اس میں بھی بڑی مہارت پیدا کی۔ اب پیانو اور اکارڈین بجاتے ہیں۔ سروں پر انگلیاں بڑی روانی سے چلتی ہیں۔ بڑے رسیلے اور سریلے ہیں۔ خدا خوفی اور دل گدازی طبیعت میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ طبیعت میں شگفتگی بھی بہت ہے۔ اپنے دوستوں سے بڑی محبت کے ساتھ ملتے ہیں۔ ان کے اخلاق کی ہر کوئی تعریف کرتا ہے۔

لاہور کا کون ایسا شخص ہوگا جو ماسٹر سونی کے نام سے واقف نہ ہوگا۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے جب بارات کے ساتھ باجے کا رواج تھا تو تقریباً ہر دوسری بارات میں ماسٹر سونی کا بینڈ ہوتا تھا۔ ماسٹر سونی کو میں نے بھی دیکھا ہے اور انہیں سنا بھی ہے۔ بقول سراج نظامی ماسٹر سونی لاہور میں ہی پیدا ہوئے۔ دس برس کی عمر میں اللہ دتا نقارچی کی شاگردی اختیار کی۔ ان سے لے اور تال کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے بھائی محمد دین سے کلارنٹ سیکھی۔ پھر میاں علم دین اور توکل خان سے استادی موسیقی کی تعلیم حاصل کی۔ اور ہز ماسٹرز وائس گراموفون کمپنی میں ملازم ہو گئے۔ اس کے علاوہ انہوں نے لاہور میں تیار ہونے والی کئی فلموں میں کلارنٹ بجائی۔ کئی کانفرنسوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور داد حاصل کی۔ لاہور میں آپ کا براس بینڈ مشہور ہے۔ جب آپ کوئی فلمی دھن بجاتے ہوئے کلاسیکل موسیقی کی تانیں بکھیرتے ہیں تو لوگوں کے سر ہل جاتے ہیں۔ کلارنٹ نوازی میں امرتسر کے عالمگیر صاحب کا بھی کوئی جواب نہیں تھا۔ قیام پاکستان کے بعد عالمگیر لاہور آ گئے تھے۔ میں نے بچپن اور لڑکپن میں عالمگیر کو امرتسر میں بارات کے ساتھ کلارنٹ بجاتے اور لوگوں کو داد دیتے سنا ہے۔ انہیں سن کر بقول سراج نظامی دل پر وجد طاری ہو جاتا۔ کلارنٹ میں پکے راگ اس خوش اسلوبی سے بجاتے کہ لگتا کہ کوئی استاد گویا گا رہا ہے۔ اس وقت لاہور میں

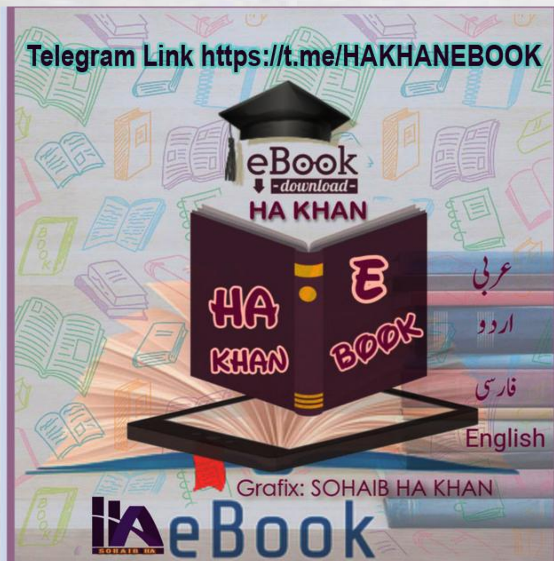
ماسٹر صادق علی مانڈو پاکستان کے صف اول کے فن کار ہیں۔ایک مدت سے مانڈو صاحب ریڈیو پاکستان لاہور سے وابستہ ہیں۔اگرچہ سرکاری نوکری سے ریٹائرڈ ہو گئے ہیں۔مگر ریڈیو کی طرف سے انہیں کنٹریکٹ مل جاتا ہے جس کی وجہ سے ان بزرگ فن کاروں کا چہرہ ریڈیو اسٹیشن پر دکھائی دے جاتا ہے۔یہ بھی غنیمت ہے۔مانڈو صاحب عمر رسیدہ ہو گئے ہیں مگر طبیعت میں بلا کی شوخی اور شگفتگی ہے۔موقع محل کے مطابق بڑی خوب صورت بات کرتے ہیں۔ایک بار لاہور ریڈیو اسٹیشن پر کوئی میوزک کانفرنس ہونے والی تھی۔اسٹیشن ڈائریکٹر بڑی پریشانی کے عالم میں تھے۔مانڈو صاحب کے پاس فنکاروں کو جمع کرنے کی ذمہ داری تھی۔اسٹیشن ڈائریکٹر ان کے پاس آئے اور پوچھا:

''مانڈو جی! ملکہ موسیقی آ گئی ہیں کیا؟''

مانڈو صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا:

''ملکہ موسیقی بھی آ گئی ہیں۔ملکہ غزل بھی آ گئی ہیں۔ملکہ ترنم نور جہاں بھی آ گئی ہیں بس اب صرف ملکہ الزبتھ کا انتظار ہے۔''





جہاں راتیں جاگتی تھیں

پہلے جہاں راتیں جاگتی تھیں اب وہاں راتیں بہت حد تک سوتی ہیں۔ میرا مطلب لاہور کے اس علاقے سے ہے جہاں رات گئے تک رقص و سرور کی محفلیں گرم رہتی تھیں اور جسے عرف عام میں ہیرامنڈی کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ یہ بڑی اچھی بات ہوئی ہے کہ حکومت نے اصلاح معاشرہ کی مہم کے تحت رقص و سرور کی ان محفلوں پر پابندی لگا دی ہے اور یہاں راتوں کو طبلے گھنگھروؤں کی آواز اب سنائی نہیں دیتی۔ اور کبھی کسی جگہ پر اگر باقاعدہ کسی لائسنس کے تحت یہ آواز بلند بھی ہوتی ہے تو اتنی دبی ہوئی ہوتی ہے کہ بازار سے گزرنے والے کسی شریف آدمی کے کان میں مشکل سے پڑتی ہے۔ اس علاقے کو شاہی محلہ بھی کہتے ہیں۔ یہ عجیب ستم ظریفی کی بات ہے کہ جہاں کبھی مغلیہ دربار کے امراوزرا کی حویلیاں اور عالی شان مکانات ہوا کرتے تھے آج اس محلے کا نام بدنام ہو گیا ہے۔ بہر حال یہ گردش زمانہ کی بات ہے۔ ہمیں اس وقت اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ ہم چونکہ شہر لاہور کے قدیم و جدید اور مشہور علاقوں کا ذکر کر رہے ہیں تو ضروری تھا کہ شہر کے اس محلے کا ذکر بھی کیا جائے جہاں ہمارے اردو ادب کے بعض مشہور ادیب اور شاعر اپنی محفلیں گرم کرتے رہے ہیں۔ یہ بھی ایک عجیب حسن اتفاق ہے کہ مجھے بھی ان بعض بلکہ گنتی کے چند ایک ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ اس بدنام علاقے میں جانے کا اکثر موقع ملتا رہا ہے۔

یہاں میں ایک بات کی وضاحت کرتا چلوں کہ مجھے مجرا سننے یا دیکھنے کا کبھی شوق نہیں رہا۔ ایک تاش اور دوسرا مجرا...... ان دو چیزوں سے مجھے ہمیشہ بوریت محسوس ہوئی ہے۔ تاش مجھے آج بھی کھیلنی نہیں آتی حالانکہ میں بڑے بڑے جواریوں کی بیٹھکوں میں بیٹھا ہوں اور لاکھوں روپے کا جوا ہوتے اور جواریوں کو قتل ہوتے بھی دیکھا ہے۔ جوا مجھے برا لگتا ہے اور مجرا اس لیے دیکھنا پسند نہیں کہ یہاں ایک پارٹی دوسری پارٹی کو صریحاً بے وقوف بنا رہی ہوتی ہے اور دوسری پارٹی بڑی احمقانہ خوشی کے ساتھ بے وقوف بن رہی ہوتی ہے، مگر جب مجھ سے سینئر نامور ادیب اور شاعر کسی وقت اپنے موڈ میں آ کر ادھر کا رخ کرتے ہیں تو میں بھی ان کے ساتھ چلا آتا تھا۔ یوں مجھے اس

علاقے میں بہت کچھ دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔

چونکہ لاہور شہر سے میرا بچپن کے زمانے سے ایک خاص تعلق رہا ہے۔ اس لیے شاہی محلے میں سے گزرنے کا بھی اتفاق ہوتا رہا۔ مگر اس علاقے کو زیادہ قریب سے میں نے ۴۸۔۱۹۴۷ء کے دوران دیکھا۔ امرتسر میں ہمارے ہاں جمعرات کی جمعرات نیاز دی جاتی تھی جس میں موسمی پھل زیادہ مقدار میں ہوتے تھے۔ اس نیاز کا بیشتر حصہ جیو میراثن آ کر لے جاتی تھی۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا گھر میں ہر جمعرات کا یہ معمول دیکھا۔ جمعرات کو گہرے سانولے رنگ کی ادھیڑ عمر جیو میراثن دعائیں دیتی۔ مکان کی سیڑھیاں چڑھ کر دالان میں آ کر بیٹھ جاتی۔ جب تک بیٹھی رہتی ایک ایک کے حق میں دعائیں دیتی رہتی اور نیاز کے چاولوں اور پھلوں کا مجمع یا طشت یا تھنوس اپنے بیٹے کے سر پر اٹھوا کر دعائیں دیتی چلی جاتی۔ پاکستان بنا تو سب ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ برسوں کے معمولات بھی عارضی طور پر درہم برہم ہو گئے۔ جب بقول شاہد احمد دہلوی کے کچھ امی جمی ہوئی یعنی لوگوں کو تھوڑا ہوش آیا تو انہوں نے آس پاس نگاہ ڈالی اور دیکھا کہ کون کون ساتھ نہیں آیا۔ کون کہاں رہ گیا اور کون کس مقام کی طرف ہجرت کر گیا ہے۔

چنانچہ یہاں بھی جب جمعرات کو پھل کی نیاز دلوائی جانے لگی تو مجھے آرڈر ملا کہ جیو میراثن کو تلاش کروں۔ مجھے سن گن ملی کہ وہ شاہی محلے میں قلعے والی سڑک پر اپنے کسی رشتے دار کے پاس مقیم ہے۔ چنانچہ میں وہاں پہنچ گیا۔ یہاں ایک چھوٹا سا پوسٹ آفس بھی تھا جو ایک متروکہ مکان کے دیوان خانے میں بنایا گیا تھا۔ اب وہاں گئے مدت ہو گئی ہے۔ پتہ نہیں یہ ڈاک خانہ اب ہے بھی کہ نہیں۔ بہر حال میں نے جیو کا مکان تلاش کر لیا۔ مکان آدھا جلا ہوا تھا۔ نیچے بہت کشادہ گیراج سا تھا۔ جس کے آگے بوریا پڑا تھا۔ میں نے جیو کے خاوند کا نام لے کر آواز دی تو جیو کی بڑی بیٹی نے بوریا اٹھا کر مجھے دیکھا اور خوش ہو کر بولی:

''بابو آیا ہے ماں۔''

جیو نے میری بلائیں لیں۔ ایک ایک کی خیریت پوچھی۔ میری خاطر داری کی۔ اتنی محبت اور اخلاق سے پیش آئی کہ میرے دل سے آج بھی ان سب کے لیے دعا ہی نکلتی ہے۔ میرے ساتھ پتہ نہیں کون تھا۔ میں یہاں سے نکلا تو شاہی محلے کی گلیوں میں گھومنے لگا۔ اکثر مکان خالی اور ادھ جلے تھے۔ کچھ مکان پورے جل کر سیاہ ہو چکے تھے۔ ابھی یہاں میری کسی سے واقفیت نہیں تھی۔ نہ

میں کسی کو جانتا تھا نہ کوئی مجھے جانتا تھا۔ قلعے کی جانب والی گلیاں کھلی کھلی اور خالی خالی تھیں۔ مکان اونچے اور پختہ تھے۔ کچھ مکانوں میں ایک سے زیادہ کنبے آباد ہو چکے تھے۔ یہ غالباً ستمبر ۱۹۴۷ء کا ذکر ہے۔ ابھی میں نے اپنا ادبی کیریئر شروع نہیں کیا اور اپنا پہلا افسانہ بھی نہیں لکھا تھا۔ گلیوں سے نکل کر میں ہیرا منڈی کے بڑے بازار میں آ گیا۔ یہاں ایک پان والے کی چمکتی ہوئی دکان سے سگریٹ خریدے۔ پھر بازار حکیماں میں سے ہوتا ہوا بھاٹی دروازے کی طرف نکل گیا۔

اس کے بعد میں یہاں اپنے ایک بزرگ امرتسری دوست کے ساتھ آیا۔ وہ اپنے ایک دیرینہ دوست سے ملنے آیا تھا۔ ہم نوگزے کے مزار کے قریب جہاں ایک کنواں تھا، ایک بہت بڑی چارپائی پر بیٹھے تھے۔ میرا دوست اپنے موسیقار دوست کے ساتھ باتیں کر رہا تھا اور میں یونہی ادھر ادھر مکانوں کو تک رہا تھا۔ اس کے بعد لاہور میں میرے نئے دوست بننے لگے۔ میں نے اپنا ادبی سفر شروع کیا تو ریڈیو پاکستان آنے لگا۔ ریڈیو پاکستان میں ملک کے بعض نامور اور ابھرتے ہوئے موسیقاروں اور سازندوں سے مراسم پیدا ہوئے۔ سلیم شاہد اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائریکٹر تھا۔ اس کے کمرے میں، میں اور انور جلال شمزہ اکثر جا کر بیٹھتے اور ادب، موسیقی، ڈرامہ اور شعر و شاعری پر گفتگو ہوتی۔ سلیم شاہد کو موسیقی سے بڑا لگاؤ تھا۔ ایک روز موسم ابر آلود تھا۔ شاید ساون کا مہینہ تھا۔ سلیم شاہد کہنے لگے، چلو خان صاحب برکت علی خان کے ہاں چل کر پہاڑی راگ سنتے ہیں۔ چنانچہ میں، انور جلال شمزہ اور سلیم شاہد...... ہم تینوں ایک تانگے میں بیٹھے اور شاہی محلے میں آ کر نوگزے کے مزار کے پاس تانگے کے اڈے پر اتر گئے۔ سامنے مٹی کے بھانڈوں کی دکان تھی۔ بغل میں ایک تنگ زینہ اوپر خان صاحب کی بیٹھک کو جاتا تھا۔ ایک طرف خان صاحب برکت علی خان اور خان صاحب بڑے غلام علی خان کی بیٹھک تھی۔ اتفاق ایسا ہوا کہ برکت علی خان نہ ملے مگر مبارک علی خان مل گئے۔ ہم ان کی بیٹھک میں آ کر بیٹھ گئے۔ مبارک علی خان کو میں نے بچپن میں پنجابی فلم سوہنی مہینوال میں دیکھا تھا۔ وہ اس فلم کا ہیرو تھا۔ وہ اب بھی بڑا گورا چٹا اور خوب صورت جوان تھا۔ جسم بھاری ہو گیا تھا۔ بوسکی کی قمیض اور پاجامے میں ملبوس تھا۔ ہماری بڑی آؤ بھگت کی۔ نیچے دکان سے چائے کی چینکیں آ گئیں۔ پان کے تھال اور سگریٹ آ گئے۔ باتیں شروع ہو گئیں۔ خان صاحب مبارک علی خان کی خوش اخلاقی، ادب آداب اور گفتگو سے میں بڑا متاثر ہوا۔ وہاں ایک لطیفہ بھی ہو گیا۔ جو میں آپ کو بھی سنانا چاہتا ہوں۔ لطیفہ کیا تھا

بس ایک جگت تھی جو بڑی اچھی تھی۔ اس میں تشبیہ کا کمال تھا۔ چائے پینے کے بعد سلیم شاہد نے خان صاحب برکت علی خان سے پہاڑی سنانے کی فرمائش کی تو انہوں نے مسکرا کر اپنے ایک آدمی کی طرف دیکھا اور کہا کہ گامی (شاید یہی نام لیا تھا انہوں نے) کو جا کر بلا لاؤ۔ پھر ہماری طرف متوجہ ہو کر بولے، ''دراصل میرے ساتھ وہی طبلے پر سنگت کرتا ہے۔''

ایک بار پھر باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کافی دیر بعد گامی آیا تو خان صاحب نے قدرے سرزنش کے لہجے میں کہا، ''یار تم کہاں غائب ہو جاتے ہو۔''

گامی بولے:

''خان صاحب ماموں بہت بیمار ہے۔ اسی کے پاس بیٹھا تھا۔ ڈاکٹر کہتے ہیں اس کا تپ دق اب ٹھیک نہیں ہو سکتا۔''

خان صاحب، برکت علی خان نے فکرمندی سے پوچھا، ''اللہ رحم کرے۔ اب کیا حال ہے۔''

گامی بولا، ''ہڈیاں ہڈیاں ہیں۔ بس لگتا ہے چارپائی پر ایکسرے پڑا ہے۔''

اس کی یہ تشبیہ مجھے آج بھی یاد ہے۔ یہ مشاہدے کی بات تھی اور بغیر مشاہدے کے بہتر تشبیہ کبھی ذہن میں نہیں آتی۔

خان صاحب نے پہاڑی کی مشہور ٹھمری سنائی جوان کے گھرانے کی بڑی مقبول پہاڑی ٹھمری ہے یعنی:

''راضی رہنا جندے میریئے

اس کے بعد کبھی کبھی ہم ریڈیو اسٹیشن سے اٹھ کر خان صاحب کی بیٹھک پر چلے جاتے تھے۔ مجھے ان موسیقاروں کے پاس بیٹھ کر ان کی باتیں سننا بڑا اچھا لگتا۔ ان لوگوں کے مزاج میں عاجزی اور خدا کا خوف کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ اپنے بزرگوں اور استادوں کا نام زبان پر آتے ہی ادب سے اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے۔ یہ بات مجھے بڑی پسند تھی۔ ادب بڑی چیز ہے۔ میں آج بھی اس بات کا قائل ہوں کہ ادب ہی انسان کو زندگی کے اعلیٰ مقام تک پہنچاتا ہے۔ محنت اور نیک نیتی اور خدا پر بھروسے کے ساتھ اگر ادب بھی شامل ہو جائے تو پھر کامیابی یقیناً قدم چومتی ہے۔ بعد میں جب کسی گانے والی کی بیٹھک میں مجرا سننے کا اتفاق ہوا تو میں بور ہو کر خاموش بیٹھا رہتا

تھا۔ مجھے ان جگہوں کے مقابلے میں استاد و موسیقاروں کی بیٹھک میں بیٹھنا، ان کی باتیں سننا زیادہ اچھا لگتا تھا۔ لیکن بہر حال ہیرا منڈی کی کئی رقص و سرور کی محفلیں بھی دیکھیں اور میرے دوستوں نے میرے سر پر روپے روپے کے نوٹ رکھ کر ویلیں بھی دیں۔ مگر میں نے طوائفوں کا کوئی بھی گانا کبھی شوق سے نہیں سنا۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ کہ میرے نزدیک جو گانا پیسے دے کر سنا جائے اس میں اس کی تاثیر غائب ہو جاتی ہے۔ دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ مجھے وہاں گانے والیوں کی ٹین ایسی آوازیں ناگوار لگتی تھیں۔ ایسی گانے والی کو میوزک کی اصطلاح میں ٹانٹ کہا جاتا ہے۔ بعض نامور گانے والیوں نے اپنی آواز کے اس عیب کو کافی حد تک چھپایا ہے، مگر وہ ٹین کی آواز کہیں نہ کہیں سے ضرور باہر نکل پڑتی ہے اور کانوں کو سخت ناگوار گزرتی ہے۔ بیٹھے بیٹھے ڈانس کرنا بھی مجھے عجیب احمقانہ سی بات لگتی۔ اگر کوئی گانے والی کھڑے ہو کر ڈانس بھی کرنا شروع کرتی تو مجھے ایسا لگتا جیسے وہ ڈانگ ہاتھ میں لیے چھت کے جالے صاف کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں نے بنگال مدراس اور برما، کولمبو میں دیو داسیوں کو رقص کرتے دیکھا تھا اور ان کے رقص میں عبادت کا عنصر غالب ہوتا تھا۔ اور یہ محض کاروبار اور اصلی رقص کی بھونڈی نقل تھی۔ مگر ان گانے والیوں سے جب گفتگو کرنے کا موقع ملا تو میں نے انہیں بھی بے حد بااخلاق، شائستہ اور خداترس پایا۔ ہوسکتا ہے یہ ان کی ٹریننگ کا ایک حصہ ہو۔ لیکن خوش اخلاقی اور دل گدازی اور خداترسی اگر اس طرح سے بھی مل جائے تو غنیمت ہے۔ زیادہ تر ان مغنیاؤں سے ریڈیو اسٹیشن پر ہی واسطہ پڑتا ہے۔ وہ حفظ مراتب کا بے حد خیال رکھتیں۔ ان کی باتیں بڑی شگفتہ اور زندگی کے تجربات سے بھرپور ہوتیں۔ ضلع جگت کا استعمال ان کی گفتگو میں نہ ہونے کے برابر ہوتا تھا۔ غزل گاتے ہوئے تلفظ کا بڑا خیال رہتا۔ کسی لفظ کا درست تلفظ معلوم نہ ہوتا تو ریڈیو پر موجود کسی شاعر یا دانش ور سے پوچھ لیتیں۔ اپنے سے بڑے موسیقار کو آتے دیکھ کر ادب سے اٹھ کھڑی ہوتیں اور اس کی دعائیں لیتیں۔ یہ باتیں مجھے بطور ایک ادیب بھی اچھی لگتی تھیں۔ ان میں کچھ ایسی بھی تھیں کہ جنھوں نے بڑے نامور استادوں سے موسیقی کی تعلیم حاصل کی تھیں اور جنھیں سر کا پورا شعور تھا۔ ایسی فنکاریں عام طور پر مجرا نہیں کرتیں تھیں بلکہ بیٹھک پروف کلاسیکل راگ ہی سناتی تھیں۔ ان میں زاہدہ پروین کا نام سرفہرست ہے۔ کافی گانے میں اس کا اپنا ایک منفرد انداز تھا۔ مجھے یاد ہے ایک بار ہماری شاعروں ادیبوں کی ایک چھوٹی سی ٹولی زاہدہ پروین کے مکان پر جا

پہنچی۔ زاہدہ پروین نے بڑی خندہ پیشانی سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ چائے منگوائی اور پھر ہمارے اصرار پر راگ درباری سنایا۔ مجھے کلاسیکی موسیقی کے اسرار و رموز کی زیادہ سمجھ نہیں ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ زاہدہ پروین نے اس رات درباری راگ کو ہمارے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔

ایک بار ہماری ٹولی میں ایک ایسا نوجوان بھی شامل ہو گیا جس کا ادب سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ مگر وہ ادیبوں میں بیٹھتا اٹھتا تھا۔ ہم لوگ ایک بیٹھک میں گانا سن رہے تھے۔ وہ تھوڑی دیر بعد اٹھ کر باتھ روم میں جاتا اور واپس آ کر رومال سے منہ پونچھتا ہوا بیٹھ جاتا۔ جب ہم لوگ بیٹھک سے اترے تو اس نے مجھے ایک طرف لے جا کر کوٹ کے بٹن کھول کر دکھایا کہ اس کی اندرونی جیبوں میں لکس صابن، سرخی، نیل پالش اور زنانہ سنگھار کے سامان کی چیزیں بھری ہوئی تھیں۔ میں نے اسے کہا کہ تم نے یہ چیزیں چرا کر اچھا نہیں کیا۔ وہ سر جھٹک کر بولا:

"تم لوگ بھی تو ان عورتوں پر یونہی روپے لٹاتے پھرتے ہو۔ میں نے تھوڑی بہت قیمت وصول کر لی تو کیا ہوا۔"

سرور کی ان محفلوں میں عبدالحمید عدم کا کلام بڑا مقبول تھا۔ چنانچہ کبھی کبھی جب عدم صاحب موڈ میں ہوتے تو بے اختیار پکار اٹھتے، "چلو چل کر کسی سریلی مغنیہ سے اپنی غزل سنتے ہیں۔" ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ہم لوگ ہیرا منڈی کی ایک بیٹھک پر گئے۔ اب مجھے یاد نہیں رہا کہ یہ کس گانے والی کی بیٹھک تھی۔ بہرحال وہاں کی تقریباً سبھی اچھی گانے والیاں عدم صاحب کا بڑا احترام کرتی تھیں۔ عدم صاحب ہمیں بڑے فخر اور بڑے مان کے ساتھ اس خاتون کے ہاں لیے جا رہے تھے۔ وہ بار بار کہتے:

"حضور وہ آپ کی غلام ہے۔ دیکھنا کتنی آؤ بھگت کرتی ہے۔"

اور اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ میں نے ان خواتین کو عدم صاحب کی آؤ بھگت کرتے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ہم ایک تنگ زینہ چڑھ کر اوپر ڈیوڑھی میں آئے تو بیٹھک کا دروازہ بند تھا مگر اندر سے طبلے گھنگھروں اور گانے کی آواز آ رہی تھی۔ عدم صاحب نے زور زور سے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔ اندر سے کسی نے پوچھا:

"کون ہے؟ جاؤ۔ اس وقت گانا بند ہے۔"

عدم صاحب نے بلند آواز میں کہا:

''نہیں کہو عدم صاحب آئے ہیں۔''

تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا۔ اندر سے ایک شخص نمودار ہوا۔ اس نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا اور عدم صاحب سے معذرت کے لہجے میں کہا:

''حضور بائی جی نے کہا ہے کہ آپ اوپر والے کمرے میں تشریف رکھیں۔ سیٹھ صاحب اتفاق سے آ گئے ہیں۔ وہ ابھی گانا سن کر چلے جائیں گے۔ پھر آپ نیچے آ جائیے گا۔''

عدم صاحب نے کہا:

''حضور کوئی بات نہیں۔ ہم اوپر ہی چل کر بیٹھ جاتے ہیں۔ بس ہمیں پانی کا ایک جگ لا کر دے دیں۔''

اوپر کی منزل والا کمرہ آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ چھوٹا کمرہ تھا جس میں ایک پلنگ اور ایک سنگھار میز رکھا تھا۔ مگر الم غلم چیزوں اور پرانے کپڑوں سے اس قدر بھرا ہوا تھا کہ ہمیں کئی چیزوں کے اوپر سے گزر کر پلنگ تک جانا پڑا۔ سنگھار میز کے شیشے پر بھی دس بارہ زنانی پرانی قمیضیں لٹک رہی تھیں۔ باہر چھوٹا سا دالان تھا۔ سامنے ایک کوٹھڑی تھی۔ سردیوں کا موسم تھا۔ رات سرد تھی۔ اس کوٹھڑی سے کسی بچے کے رونے کی مسلسل آواز آ رہی تھی جسے کوئی بوڑھی عورت چپ کرانے کی مسلسل کوشش کر رہی تھی۔ سنگھار میز پر آرائش کا سامان گرد آلود تھا اور بے انتہا بے ترتیبی سے بکھرا پڑا تھا۔ شاید ہی کسی بوتل پر ڈھکنا چڑھا ہوا ہو۔ وہ بے چارہ آدمی ساتھ والی کوٹھڑی سے ہمارے لیے پانی کا جگ اور دو گلاس لے کر آ گیا۔ اس نے پوچھا:

''کچھ اور چاہیے عدم صاحب؟''

عدم نے سر ہلاتے ہوئے کہا:

''حضور! بس آپ آرام کریں۔ ہمیں جو چاہیے تھا آ گیا ہے۔''

اس کے بعد مجھے یاد نہیں کہ ہم کب اس کوٹھڑی سے باہر نکلے اور اس کے بعد کہاں گئے۔ اسی علاقے میں ایک اور مغنیہ رہا کرتی تھی جس کا نام زاہدہ سلطانہ تھا۔ وہ جوان اور خوبصورت تھی۔ اس زمانے کے لاہور کے انٹرنیشنل ہوٹل میں سنہری وگ لگا کر رقص کا پروگرام بھی کیا کرتی تھی۔ ہماری اس سے ملاقات زیادہ تر ریڈیو اسٹیشن پر ہی ہوتی۔ وہ بہت کم آمیز اور کم گو تھی۔ مگر بڑے اچھے سبھاؤ

کی تھی۔ اسے کبھی کبھار کی جگت بھی کرنی نہیں آتی تھی۔ کوئی سازندہ اس کے لباس یا بالوں کے اسٹائل پر کوئی پھبتی کستا تو زاہدہ سلطانہ مسکراتی رہتی۔ آگے سے کوئی جگت نہ کرتی۔ نہ کوئی جواب ہی دیتی۔ ایک دفعہ ریڈیو کے کسی میوزک پروڈیوسر کو اچانک زاہدہ سلطانہ کی ریکارڈنگ کی ضرورت پڑ گئی۔ دن کا وقت تھا۔ وہ اس کے گھر جانے لگا تو میں بھی اس کے ساتھ ہو گیا۔ ہم نے ریڈیو کی گاڑی پکڑی اور ہیرا منڈی میں آئے۔ زاہدہ سلطانہ کا مکان اس روز میں نے پہلی بار دیکھا۔ وہی نیم تاریک تنگ زینہ اوپر جاتا تھا۔ زاہدہ سلطانہ نے اس وقت سر میں سرسوں کا تیل لگا رکھا تھا اور گردن کے گرد میلا سا کپڑا لپیٹا ہوا تھا۔ مگر وہ اسی طرح ہمارے پاس بیٹھی رہی۔ چائے منگوانے لگی تو میوزک پروڈیوسر نے کہا:

''نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ بس تم جتنی جلدی ہو سکے تیار ہو کر ریڈیو اسٹیشن پہنچ جاؤ۔ ریکارڈنگ کا ٹائم بہت تھوڑا رہ گیا ہے۔''

ہم بڑی احتیاط سے رسی کو پکڑ کر سیڑھیاں اتر کر نیچے بازار میں آئے۔ زاہدہ سلطانہ کے ماتھے پر جب گولی لگی تو وہ اسی تنگ و تاریک زینے پر لڑھکتی ہوئی نیچے ڈیوڑھی میں آن گری تھی اور وہیں ہلاک ہو گئی تھی۔ آج بھی ان سیڑھیوں کا تصور کر کے میں کانپ اٹھتا ہوں۔ مجھے یاد ہے امرتسر میں میرے لڑکپن کے زمانے میں کسی جواری کا ایک جملہ میرے کان میں پڑا تھا۔ اس نے کہا تھا:

''ہمارا انجام یہی ہوتا ہے۔ ایک نہ ایک دن ہماری لاش گلی میں نالی کے پاس پڑی ہوتی ہے۔''

حقیقت یہ ہے کہ برے کام کا نتیجہ ہمیشہ برا نکلتا ہے۔ آدمی اگر کسی برے ماحول میں پھنس جائے تو لامحالہ طور پر اسے اس ماحول کے اچھے برے نتائج بھگتنے ہی پڑتے ہیں۔ اس لیے آدمی کو کوشش کرنی چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو برائی کے ماحول سے جتنا بچا سکتا ہے بچا کر رکھے۔

پہلے زمانے میں ایسے بدمعاش لوگ ہوتے تھے جو دوسروں کی اولاد کو برائی سے روکتے تھے۔ یہ لوگ اپنے محلے میں سر جھکا کر، نظریں نیچی کر کے گزرتے تھے۔ خود کسی نہ کسی وجہ سے اگر برے ماحول میں پھنس گئے تھے تو دوسروں کے بچوں کو اس ماحول سے بچانے کی کوشش کرتے تھے۔ ہمارے محلے میں ایک نامی جواریا گا ماسنگھاڑیا ہوتا تھا۔ ہم اسے چاچا جی کہتے تھے۔ میں ان

دنوں شاید تیسری جماعت میں محلے کے مشن اسکول میں پڑھتا تھا۔ ہمارے بازار میں ایک بیٹھک تھی جہاں جوا ہوتا تھا۔ ایک دفعہ یونہی میں اس بیٹھک میں چلا گیا۔ وہاں پندرہ بیس جواری بیٹھے تھے۔ جوا ہو رہا تھا۔ جوا بھی گھمسئی کا تھا۔ یعنی دانہ ڈال کر جوا کھیلا جا رہا تھا جو پیشہ ور جواری ہی کھیلا کرتے تھے۔ گاما بھی وہیں تھا۔ اس نے مجھے دیکھا تو جوا روک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ منظر پوری جزئیات کے ساتھ میری یادوں میں ابھی تک محفوظ ہے۔ میرے قریب آکر اس نے زور سے ایک تھپڑ میرے گال پر مارا اور غصے سے کہا:

''یہاں کیوں آئے ہو؟ خبردار اگر پھر کبھی اس بیٹھک پر آئے۔''

اور گاما سنگھاڑیا مجھے گردن سے پکڑ کر نیچے بازار میں لے آیا۔ مجھے گاما سنگھاڑیے کی شکل اور اس کا حلیہ سارے کا سارا آج بھی پورے کا پورا یاد ہے۔ بے حد صفائی پسند تھا۔ بوسکی کا کرتہ اور ناسے کا کالی کنی والا تہمد باندھتا تھا۔ لباس پر اگر آم کے رس کا یا کسی دوسری شے کا داغ پڑتا تو اس وقت گلی کے نلکے پر جا کر لال صافے یعنی پرنے کو گیلا کر کے اسے اسی وقت صاف کرنے لگتا۔ ایک بار میں گورنمنٹ ہائی اسکول امرتسر کے سامنے والے میدان میں ڈی اے وی ہائی اسکول کے باہر پروفیسر مندری کے مجمع میں لوگوں کے درمیان کھڑا تھا کہ میں نے دیکھا کہ ایک ہندو لڑکا ایک آدمی کی جیب سے بٹوہ نکال رہا ہے۔ اس زمانے میں امرتسر میں رتن نامی ایک ہندو بدمعاش بڑا مشہور تھا۔ یہ چھوٹے درجے کا بدمعاش تھا اور اس نے لوگوں کی جیبیں کترنے کے لیے کچھ لڑکے پال رکھے تھے۔ میں نے اسی مجمع میں رتن بدمعاش کو بھی دیکھ لیا تھا۔ ہندو لڑکے نے جب دیکھا کہ میں نے اسے جیب کاٹتے دیکھ لیا ہے تو اس نے مجمع سے نکلتے ہی رتن کو خبر کر دی کہ اس لڑکے نے دیکھ لیا ہے۔ جس کی جیب کٹی تھی اس بے چارے کو خبر تک نہیں ہوئی تھی۔ میں بھی گھبرا گیا۔ رتن بدمعاش میری طرف بڑھا۔ اس نے مجھے گردن سے دبوچا اور تخی سرور تکیے کی طرف لے گیا۔ اس نے اوپر تلے مجھے دو تین تھپڑ مار دیے۔ میری عمر چھوٹی تھی۔ سامنے اکھاڑے میں اتفاق سے گاما سنگھاڑیا بھی بیٹھا تھا۔ اس نے جب مجھے مار پڑتی دیکھی تو دوڑ کر وہاں آ گیا۔ یہ منظر آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ گامے سنگھاڑیے نے آتے ہی للکار کر کہا:

''اہنوں چھڈ دے اوئے۔''

اور اس کے ساتھ ہی گامے نے تہمد کے ڈھب میں سے گراری والا چاقو نکال کر اسے کھولا تو رتن

بدمعاش کے ہوش اڑ گئے۔ ہاتھ باندھ کر بولا:

"گاما جی معاف کردیو۔ مجھے پتہ نہیں تھا۔"

گامے سنگھاڑیے نے چاقو بند کر کے جیب میں ڈالا اور آگے بڑھ کر رتن بدمعاش کو جو مارنا شروع کیا تو وہ لہولہان ہو گیا۔ تکیے کے لوگوں نے آ کر اسے چھڑایا۔

اب میں آپ کو گامے سنگھاڑیے سے اپنی آخری ملاقات کا حال سناتا ہوں۔ اتفاق سے یہ ملاقات بھی ہیرامنڈی میں ہی ہوئی تھی۔ یہاں مجھے کوئی پوچھنے والا تو تھا نہیں۔ چنانچہ میں اپنے موسیقار یا شاعر ادیب دوستوں کے ساتھ آزادی سے ہیرامنڈی میں آ جایا کرتا تھا۔ کبھی خان صاحب مبارک علی خان سے ملنے، کبھی خان صاحب امانت علی خان سے ملاقات کرنے اور کبھی یونہی دن کے وقت اس بازار کی سیر کرنے کی غرض سے آ جاتا تھا۔ اس دکان سے پان کھاتا۔ اس چائے خانے میں کسی دوست کے ساتھ بیٹھ کر چائے پیتا۔ اسی بازار کے ایک چائے خانے میں چائے پیتے ہوئے مجھے اس دکان کے مالک نے بتایا تھا کہ ہیر سیال فلم کی ہیروئن اور بالو ماہیا عشقیہ کہانی کی مشہور کردار بالو اس سامنے والے مکان میں آ کر رہی تھی۔

"وہ خود بے چاری یہاں نہیں آئی تھی۔ اسے زبردستی وہ شخص کھینچ کر لے آیا تھا جس نے اسے گجرات سے نکالا تھا اور جس کے ساتھ وہ اپنی مرضی سے لاہور آئی تھی۔ بالو بڑی وفادار عورت تھی، مگر جس شخص نے اس کے ساتھ محبت کا کھیل رچایا اور پھر لاہور میں لا کر اس سے شادی کر لی تھی وہ غدار نکلا۔ اس نے بالو کو کوٹھے پر بٹھا دیا۔ یہاں سے بالو آگے ایک گلی میں لے جائی گئی جہاں اسے ایک مہلک مرض لگ گیا اور اس گلی میں بالو نے سسک سسک کر دم توڑ دیا۔"

بالو کی کہانی کا المناک انجام اس چائے والے کے سامنے ہوا تھا۔ چائے کی دکان سے مجھے اس چائے والے کی بتائی ہوئی باتیں یاد آ گئیں اور میں نے انہیں بھی یہاں لکھ دیا تا کہ ریکارڈ ہو جائیں۔ کیونکہ اس کہانی کی دوسرے چشم دید گواہوں نے تائید اور تصدیق کی تھی۔ اب میں ہیرامنڈی میں گاما سنگھاڑیے سے اپنی آخری ملاقات کا ذکر کرتا ہوں۔ میں ایک روز دوپہر یا شاید شام کے وقت اس بازار میں سے گزر رہا تھا کہ میں نے گاما سنگھاڑیے کو ایک پان کی دکان کے آگے بنچ پر اس طرح بیٹھے دیکھا کہ صافہ اس کے کاندھے پر تھا۔ سفید ریشمی تہمد بندھا تھا۔ ایک

ٹانگ دوسری ٹانگ کے گھٹنے پر رکھی ہوئی تھی اور وہ گا رہا تھا:

سندر ناری پریتم پیاری

پیاری چھب دکھلائے پیاری

آپ سن کر ضرور حیران ہوں گے کہ یہ نیوتھیٹرز کی ایک فلم کا گانا تھا جسے آرزو لکھنوی نے لکھا اور پنکج ملک نے گایا تھا۔ آپ اس زمانے کے لٹریری یعنی دانشور لوگوں کے ذہنی معیار کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جس زمانے کے بدمعاش آرزو لکھنوی کے لکھے ہوئے اور پنکج ملک کے گائے ہوئے گانے گایا کرتے تھے۔

بہرحال گامے سنگھاڑیے نے مجھے دیکھا تو گانا بند کر دیا۔ میں اب بچہ نہیں رہا تھا۔ پھر بھی وہ بنچ پر سے اٹھ کر میرے پاس آیا سب کی خیر خیریت پوچھی۔

''امرتسر سے سب آ گئے تھے؟ کوئی وہاں رہ تو نہیں گیا؟ خلیفہ جی کیسے ہیں؟''

پھر اسی اپنے درشت لہجے میں کہنے لگا:

''اس محلے میں کیوں آئے ہو؟''

مجھے خود پر ایک بچے کا احساس ہوا۔ میں نے جلدی سے کہا:

''وہ چاچا جی...... یہاں ریڈیو کا ایک فنکار رہتا ہے۔ اسے ملنے آیا ہوں۔ میں ریڈیو اسٹیشن پر کام کرتا ہوں نا۔''

گامے نے سنی ان سنی کر دی اور اسی درشت لہجے میں مجھے متنبہ کیا:

''آئندہ میں تمہیں یہاں نہ دیکھوں۔ جس طرف سے آئے ہو اسی طرف سے واپس چلے جاؤ۔''

میں جانے کے لیے مڑا تو مجھے اس کی آواز آئی:

''خبردار دوبارہ ادھر کا رخ نہ کرنا۔''

میں منہ لٹکائے پانی والے تالاب کی طرف چل دیا۔ اس کے ایک ہفتہ بعد میں والد صاحب کا کوئی پیغام لے کر گامے سنگھاڑیے کی تلاش میں وہاں آیا تو پتہ چلا کہ ایک دن پہلے اس کا انتقال ہو گیا ہے۔

ایک موسیقار یہاں میرا دوست ہوا کرتا تھا۔ میں کبھی کبھی اس سے ملنے اس کے گھر آتا۔ ہم

دونوں بیٹھک میں بیٹھ جاتے۔ میوزک پر باتیں کرتے۔ بازار سے چائے منگوا کر پیتے۔ کبھی وہ ہارمونیم کھول کر آہستہ آہستہ بجاتے ہوئے مجھے داغ یا کسی دوسرے شاعر کی کوئی غزل سناتا۔ جس راگ میں اس غزل کی طرز بٹھائی ہوتی تھی میرا دوست اس راگ کے اسرار و رموز مجھے سمجھاتا۔ کسی ایک خاص سر کو بار بار لگا کر سناتا اور کہتا:

''یہ سر اس راگ کی جان ہے۔ یوں سمجھ لو کہ جس طرح طوطے میں دیو کی جان ہوتی ہے اسی طرح اس سر میں اس راگ کی جان ہے۔''

میں بڑے جوش کے ساتھ اس سے موسیقی پر بحث کیا کرتا تھا۔ حالانکہ میرا موسیقی کا علم اس شخص کے مقابلے میں صفر تھا۔ لیکن جذبات کا زمانہ تھا۔ ہر کام میں ایک جذبہ اور نئی زندگی کی امنگ ہوتی تھی۔ اس موسیقار کی بیٹھک میں جو محفلیں لگتی تھیں اور اس کے ساتھ میوزک پر جو باتیں ہوا کرتی تھیں وہ آج بھی بہت یاد آتی ہیں۔ میرا وہ دوست بفضل تعالیٰ آج بھی زندہ سلامت ہے مگر میرا اس بازار میں اب کبھی جانا نہیں ہوا۔ دل بہت چاہتا ہے کہ کسی روز گھر سے نکل کر سیدھا شاہی محلے کا رخ کروں اور اپنے موسیقار دوست مکان کا دروازہ کھٹکھٹا کر کہوں، ''یار میں آ گیا ہوں۔'' اور پھر ہم بیٹھک میں بیٹھ جائیں۔ بازار سے فل سیٹ چائے منگوا لیں۔ میں پیالیوں میں چائے ڈالوں۔ وہ ہارمونیم کو جھاڑنے لگے۔ ہم چائے پئیں۔ میوزک پر باتیں کریں اور تھوڑی دیر کے لیے اس نیم روشن بیٹھک کے باہر لاہور میں، پاکستان میں، دنیا میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے اسے بھول جائیں مگر میری خواہش کے باوجود ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ بہت اہم مگر بہت بیکار قسم کے کاموں نے ہم دونوں کو اپنے اپنے جال میں پھنسا رکھا ہے۔ ہم وہ طوطے ہیں جن کے اندر حالات کے دیو کی جان ہے۔ چنانچہ حالات کا دیو ہمیں ایک پل کے لیے بھی اپنی نگاہوں سے ادھر ادھر نہیں ہونے دیتا۔

میں جو بجلی کے کھمبے کے ساتھ بھی رومانٹک ہو جاتا ہوں اور ہر درخت سے عشق کرتا ہوں مگر کسی پیشہ ور گانے والی کے حسن جہاں سوز سے کبھی متاثر نہیں ہوا۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ میرے دل میں یہ خیال بیٹھ گیا ہے کہ یہ سب کچھ جھوٹ ہے۔ بناوٹ ہے۔ ملمع ہے۔ ہو سکتا ہے اس میں کہیں کہیں سچائی کی شمع بھی روشن ہو مگر میرا اس طرف کبھی دھیان ہی نہیں گیا۔ لیکن میرا ایک شاعر دوست ہیرا منڈی میں ایک گانے والی کو دل دے بیٹھا۔ میں اس شاعر کا اور اس گانے والی کا

نام بھی نہیں لکھوں گا۔ کیوں کہ عشق میں راز داری کا پاس کرنا بھی ایک خاص بات ہے اور ایک رومانٹک روایت ہے۔ گانے والی کو شاعر کی محبت کا احساس تک نہیں تھا۔ میں اپنے دوست کے ساتھ ہی ہوتا تھا۔ میرا شاعر دوست اس کے ہاں مجھے دوپہر کو لے کر جاتا اور اسے اپنی تازہ غزل پیش کرتا اور زیادہ تر وہاں بیٹھا ٹھنڈی آہیں بھرتا رہتا۔ یہ شاعر آج کے زمانے کے بڑے مشہور شعرا میں سے ہے آپ سب اسے جانتے ہیں مگر میں اس کا نام نہیں لکھوں گا۔ کیونکہ اب وہ عاشق نہیں رہا۔ خاوند بن گیا ہے۔ خاوند بن جانا کوئی بری بات نہیں۔ بلکہ یہ بڑی ذمے داری کی بات ہے اور جو شخص بھی اس ذمے داری کو نبھاتا ہے انسانیت کی خدمت کرتا ہے۔ مگر میرا شاعر دوست بہت زیادہ خاوند بن چکا ہے۔ مجھے اس کے بہت زیادہ خاوند بن جانے پر بھی کوئی شکایت نہیں۔ افسوس تو صرف اس بات کا ہے کہ ایک بار عاشق بن جانے کے بعد وہ عاشق نہیں رہا۔ عشق اس کی زندگی سے نکل گیا ہے۔ چلا گیا ہے۔ شاعری کا تھیلا بھی یہ عشق اپنے ساتھ ہی لیتا گیا ہے۔ اب میرا یہ دوست شاعر باہر سے شعر کہتا ہے اندر سے نہیں۔ دماغ پر زور دے کر شعر لکھتا ہے دل پر ہاتھ رکھ کر شعر نہیں کہتا۔ دماغ پر ضرورت سے زیادہ زور دینے سے اس کا دماغ کمزور ہو گیا ہے۔ جس کی وجہ سے شعر بھی بہت کمزور آنے لگے ہیں۔

اب میں آپ کو اس بازار کی ایک ایسی مغنیہ سے ملواتا ہوں جس کے دیوان خانے کو دیکھ کر مجھے قدیم یونان کی وہ علم دوست، ادب پرست، آزاد خیال امیر زادیاں یاد آگئیں جن کے اپنے سیلون ہوتے تھے جہاں اس زمانے کے ممتاز فلفسی، شاعر، ادیب اور ڈرامہ نگار آ کر بیٹھتے اور فلسفے، علم الکلام اور شعر و شاعری پر بحثیں کیا کرتے تھے۔ بلکہ ان علم دوست یونانی امیر زادیوں کی ان نشست گاہوں کی وجہ سے سیلون کا نام معرض وجود میں آیا جو آج تک مختلف شکلوں اور معنوں میں چل رہا ہے۔ میں مغنیہ کا بھی اصل نام نہیں بتاؤں گا۔ آپ سمجھ لیں کہ اس کا نام تارا تھا۔

تارا نے گانا بجانا چھوڑ دیا تھا اور بازار والی بیٹھک سے اتر کر اپنے گلی والے پختہ مکان میں آ گئی تھی۔ یہاں اپنی بیٹھک کو اس نے مختلف مصوروں کی تصویروں، ادیبوں شاعروں کی کتابوں اور آرٹ کے بعض بڑے نایاب اور نازک نوادرات سے سجا رکھا تھا۔ تارا کو شعر، افسانے، مصوری اور موسیقی سے گہرا لگاؤ تھا۔ میں اسے پہلی بار مشہور افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کی معرفت ملا۔

ایک بار ایسا ہوا کہ منٹو صاحب تانگہ لے کر شاد امرتسری کے ہاں آئے تو بڑے موڈ میں

تھے۔ وہاں میں بھی بیٹھا تھا۔ منٹو صاحب نے شاد سے کہا، "چلو ہیرا منڈی چل کر گانا سنتے ہیں۔" پھر میری طرف دیکھ کر بولے، "تم بھی چلو۔" تانگہ ٹکسالی دروازے کی طرف سے شاہی محلے میں داخل ہو کر ایک گلی کے باہر رک گیا۔ منٹو صاحب ہمیں تارا کے گھر لے آئے۔ تارا صوفے پر بیٹھی سویٹر بن رہی تھی۔ قریب ہی فیض احمد فیض کی کتاب کھلی پڑی تھی۔ منٹو کو دیکھ کر وہ تعظیماً اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے دیوان خانے کا جائزہ لیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں غلطی سے شاید کسی کالج کے پرنسپل کے کمرے میں آ گیا ہوں۔ شیشے کی الماریوں میں کتابیں سجی تھیں۔ کارنس پر چینی کے نازک گلدان پڑے تھے۔ دیواروں پر پال گوگین، عبدالرحمٰن چغتائی اور استاد اللہ بخش کی بعض مشہور تصویروں کے بڑے بڑے پرنٹ لگے تھے۔ ایک طرف الماری کے اوپر، غالب، فیض اور منٹو کی تصویریں نظر آ رہی تھیں۔ منٹو صاحب اپنے مخصوص انداز میں تیز تیز باتیں کر رہے تھے۔ پھر انہوں نے تارا سے میرا اور شاد امرتسری کا تعارف کروایا۔ تارا کا یہ جملہ مجھے آج بھی روز اول کی طرح یاد ہے کہنے لگی:

"بس منٹو صاحب اب احمد ندیم قاسمی صاحب سے ملنا باقی رہ گیا ہے۔ کبھی ان کو بھی یہاں لے آئیں۔"

منٹو صاحب نے آگے سے کچھ جواب دیا تھا جو مجھے یاد نہیں رہا۔

تارا واقعی بڑی سلجھی ہوئی باذوق عورت تھی۔ اس کی عمر تیس پینتیس سال کی ہو گی۔ خوش شکل اور صحت مند تھی۔ گانا بجانا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ تھوڑی بہت جائیداد بنا لی تھی اسی پر بڑی خوشحالی اور خوش ذوقی کے ساتھ زندگی بسر کر رہی تھی۔ شاعروں، ادیبوں سے ملنے، ان کی دعوتیں کرنے اور ان کی باتیں سننے، ان کی زبان سے ان کا کلام اور افسانوں کے ٹکڑے سننے کا اسے بہت شوق تھا۔ مشکل صرف یہ تھی کہ وہاں چند ایک قلندر قسم کے ادیب اور شاعر ہی آ سکتے تھے۔ باقی ادیبوں شاعروں کے پاس خود جانا پڑتا تھا۔ تارا بنیادی طور پر ست الوجود اور سہل پسند عورت تھی۔ ایک جگہ گھنٹوں بیٹھی کتاب پڑھتی یا سویٹر بنتی رہتی تھی۔ ایسی عورت تانگہ لے کر کہاں شہر کی دور دراز سڑکوں پر ماری ماری پھر سکتی ہے۔ اس کی یہی خواہش تھی کہ کسی طرح اس کے گھر سارے ادیب آ جایا کریں۔ وہ ان کے لیے طرح طرح کے کھانے بنائے۔ ان کو خود اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر پیش کرے۔ ان کی باتیں سنے۔ انہیں ایک دوسرے سے باتیں کرتا، ایک دوسرے سے بحث کرتے

اور ایک دوسرے کو اپنے اپنے شعر سناتے دیکھے۔

ان ہی دنوں ایک دفعہ اردو کے پہلی نسل کے افسانہ نگاروں میں سے ایک مشہور افسانہ نگار دیوندر ستیارتھی لاہور آیا۔ وہ میرے افسانوں کا بھی مداح تھا۔ میری تلاش میں وہ پاک ٹی ہاؤس اور کافی ہاؤس بھی گیا۔ مگر اب میں ان جگہوں پر نہیں بیٹھتا تھا۔ کسی نے اسے موچی دروازے میرے سسرال والوں کا پتہ بتا دیا۔ وہ وہاں پہنچ گیا۔ اتفاق سے اس روز میں موچی دروازے والے مکان پر ہی تھا۔ مجھے اطلاع ملی کہ انڈیا سے کوئی بزرگ آپ سے ملنے آیا ہے۔ میں نے کھڑکی میں سے گلی میں دیکھا اور لمبے کوٹ اور آزاد چھوڑی ہوئی لمبی ڈاڑھی والے دیوندر ستیارتھی کو پہچان لیا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ کھانے پر دیوندر ستیارتھی نے صرف دہی کا رائتہ اور روٹی کھائی۔ پھر ہم چینی لنچ ہوم میں آگئے۔ یہاں دوسرے ادیبوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ دیوندر ستیارتھی اپنے مخصوص انداز میں اپنے افسانوں اور ان کے انگریزی تراجم پر باتیں کرتا رہا۔ یہ مجھے یاد نہیں کہ وہاں بیٹھے ہوئے کس ادیب نے ہیرا منڈی کی تارا کا ذکر چھیڑ دیا۔

دیوندر ستیارتھی نے پرشوق انداز میں کہا:

''اس دیوی کے درشن تو میں ابھی کروں گا۔''

ہم لوگ تانگے میں بیٹھ کر ٹکسالی دروازے آگئے۔ دیوندر ستیارتھی کا تارا سے تعارف کرایا گیا۔ وہ دیوندر ستیارتھی کے نام سے واقف تھی اور اس کی کتاب ''میں ہوں خانہ بدوش'' اس کے دیوان خانے کی الماری میں سجی ہوئی تھی۔ دیوندر ستیارتھی تارا کے دیوان خانے یا ڈرائنگ روم کو دیکھ کر بڑا متاثر ہوا۔ وہ تارا کے پاس صوبے پر بیٹھ کر اس سے باتیں کرنے لگا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ تارا اس کی خانہ بدوشی کی کہانیوں کو بڑے شوق سے پڑھتی ہے تو ستیارتھی مچل اٹھا۔ دیوندر ستیارتھی بڑا ان گھڑ قسم کا آدمی تھا اور مجلسی ادب آداب کو خاطر میں رکھنا نہیں جانتا تھا جبکہ تارا ایک خوش ذوق، باسلیقہ اور مجلسی آداب کی سختی سے پابندی کرتی تھی۔ چنانچہ بہت جلد وہ دیوندر ستیارتھی سے بور ہوگئی اور ہم اس سے اجازت لے کر وہاں سے واپس آگئے۔

وقت کا پہیہ کبھی جام نہیں ہوتا۔ یہ پہیہ ہمیشہ گردش میں رہتا ہے۔ وقت گزرتا گیا۔ زندگی کی مصروفیات اور ذمے داریوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ دوستوں کی ٹولیاں بکھرنے لگیں۔ کبھی ہفتے میں تین چار مرتبہ اس بازار کا چکر لگتا تھا اور پھر مہینوں میں کبھی ایک بار دوستوں کا پروگرام بنتا۔ آہستہ

آہستہ یہ مہینے کے بعد لگنے والا چکر بھی ختم ہوگیا۔ مجھے پہلے بھی اس بازار سے کوئی رغبت نہیں تھی۔ دوست بچھڑے تو وہ علاقہ بھی بچھڑ گیا۔ کئی سال بیت گئے۔ اس بازار میں جانے کا کبھی خیال بھی نہ آیا۔ تارا بھی ذہن سے نکل گئی۔ آسمان پر کئی نئے تارے نکل آئے تھے۔ میں ریڈیو پاکستان پر بطور پروڈیوسر مستقل ہوگیا تھا۔ ہیرا منڈی کی طرف پھیرا لگائے میرے اندازے کے مطابق مجھے پندرہ بیس سال گزر گئے تھے۔ میرے پاس ان دنوں ایک ایسا پروگرام تھا جس میں میوزک بھی سنوایا جاتا تھا۔ ایک دن کی بات ہے کہ میں اسٹوڈیوز میں سے نکل کر ریڈیو پاکستان کے لان کی طرف جا رہا تھا کہ لابی میں مجھے ایک مدبری سنجیدہ چہرے والی خاتون نے بڑے سلیقے سے آداب عرض کیا۔ میں نے اسی طور پر وعلیکم کہا اور آگے بڑھ گیا۔ میں یہی سمجھا کہ کوئی آرٹسٹ ہوگی جسے میں نہیں جانتا۔ میں دو قدم ہی بڑھا تھا کہ پیچھے سے اس خاتون نے میرا نام لے کر مجھے آواز دی۔ آواز کچھ جانی پہچانی لگی۔ میں وہیں رک گیا۔ پلٹ کر دیکھا۔ اس خاتون کے چہرے پر عمر کی گرد صاف ہونے لگی۔

اس نے مسکرا کر کہا:

''مجھے پہچانا نہیں؟''

میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ یہ تارا تھی۔ اس بازار کی دانش ور مغنیہ............ مجھے اس سے مل کر واقعی بڑی خوشی ہوئی۔ ہم ریڈیو اسٹیشن کے باغ میں گلاب کی کیاری کے پاس بیٹھ گئے۔

میں نے وہیں چائے منگوائی۔ ہم باتیں کرنے لگے۔ تارا نے بتایا کہ وہ اب بھی اپنے ڈرائنگ روم میں رہتی ہے اور صرف کتابیں پڑھتی ہے۔ وہ چائے بناتے ہوئے بولی:

''کئی برس بیت گئے ہیں، آپ نے پھر ادھر کا رخ ہی نہیں کیا۔ کبھی میرے ہاں آئیں۔ میں آپ کو کوریا کی چائے پلاؤں گی۔ کوریا کے فنکاروں کا ایک وفد لاہور آیا تھا۔ اس کی ایک آرٹسٹ نے مجھے یہ چائے دی تھی۔''

وہ باتیں کرتی رہی۔ میں چائے پیتا رہا۔ کیاری میں کھلے ہوئے گلاب جنوری کی سنہری نیم گرم دھوپ میں چپ چاپ ہماری باتیں سنتے رہے۔

اس کے بعد تارا سے پھر ملاقات نہ ہوئی۔ آج اس بات کو بھی کئی سال بیت گئے ہیں۔



بچھڑی ہوئی محبتوں کے راستے

لاہور کی سڑکیں پہلے سے زیادہ ہنگامہ پرور اور پر شور ہو گئی ہیں۔ بعض سڑکیں بالکل پہچانی نہیں جاتیں کہ وہی سڑکیں ہیں جہاں سے کبھی کوئی تانگہ بھی گزرتا تو درخت کی کسی ڈال پر بیٹھا پرندہ چونک کر دیکھتا کہ یہ شور کہاں سے پیدا ہوا؟ اب ان سڑکوں پر صبح سے رات گئے تک ٹریفک کا شور بپا رہتا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ لاہور کی آبادی بڑھ گئی ہے اور بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ شہر کی سڑکیں کیا کریں؟ کہاں جائیں؟ بڑھی ہوئی آبادی کی اپنی مجبوری ہے۔ اگر میں آپ کو قیام پاکستان کے وقت کے لاہور کی کسی سڑک پر لے جا سکتا تو آپ حیرت سے آنکھیں جھپکنے لگتے کہ کیا یہ وہی سڑک ہے۔ جس کو کوئی پیدل عبور کرنے کے بعد زندہ نہیں بچ سکتا؟

میرا کام یہ نہیں کہ میں ان وجوہات کی تحقیق کروں، جو شہر کی ان پرسکون سڑکوں کا حسن ختم کرنے کا باعث بنی ہیں۔ یہ کام شہر کی پلاننگ کرنے اور بہبود آبادی کے اداروں کا ہے۔ میں ایک آرٹسٹ ہوں۔ رومان نگار اور افسانہ نویس ہوں۔ میرا کام صرف آپ کو حسن و زیبائش کی ان تصویروں کو دکھانا اور پینٹ کرنا ہے۔ جن کو ہم نے مسخ کر ڈالا ہے۔

سب سے پہلے میں آپ کو ڈیوس روڈ کی اصل تصویر دکھاؤں گا۔ یہ اصل ڈیوس روڈ آج کی ڈیوس روڈ کے نیچے، بہت نیچے کہیں دب کر رہ گئی ہے۔ یہ کام ایسا ہی ہے جیسے کوئی دفن شدہ دفینے یا گمشدہ محل کی کھدائی کا کام شروع کرے۔ مگر یہ کوئی زیادہ دیر کی بات نہیں ہے۔ جن لوگوں نے پرانی ڈیوس روڈ دیکھی ہے اور اس کے پختہ اینٹوں کے چھوٹے سے فٹ پاتھ پر سے گزرے ہیں وہ آج بھی اسی لاہور میں زندہ سلامت ہیں اور جب میں انہیں اس کی اصلی تصویر دکھاؤں گا تو وہ اسے فوراً پہچان لیں گے کہ ہاں یہ وہی ہماری یادوں میں بسنے والی خاموش پرسکون سڑک ہے۔

پرانی ڈیوس روڈ شملہ پہاڑی سے شروع ہو کر مال روڈ پر جا کر ختم ہو جاتی تھی۔ اسی زمانے میں یہ اتنی کشادہ نہیں تھی۔ دونوں طرف پختہ سرخ اینٹوں کے چھوٹے سے فٹ پاتھ تھے۔ ان کے اوپر پھول دار درختوں کی دو رویہ قطار شملہ پہاڑی سے مال روڈ تک چلی گئی تھی۔ یہ کسی انگلش کاؤنٹی

کی سڑک لگتی تھی۔اس کی ایک جانب کشادہ باغیچوں والی پرانی طرز کی خاموش خاموش پراسرار زرد رنگ کی کوٹھیاں تھیں جہاں شاذونادر ہی کوئی انسان نظر آتا تھا اور ایک جانب آدھی سڑک تک ایچی سن کالج کے بانس کے گنجان درختوں کے جھاڑ پھیلے ہوئے تھے۔سڑک کی دونوں جانب جو خاص قسم کے درخت تھے،ان پر موسم بہار میں چڑیا کی چونچ کی شکل کے سرخ پھولوں کے گچھے لٹکنے لگتے۔ان درختوں کا اصل نام مجھے معلوم نہیں مگر ہم انہیں چڑی پھول والے درخت ہی کہتے تھے۔ یہ درخت لاہور کی کسی دوسری سڑک پر بہت ہی کم نظر آتے تھے۔بہار کے آخر دنوں میں ان پھولوں کی پنکھڑیاں گرنے لگتیں اور ڈیوس روڈ کے خاموش اور دور تک خالی خالی فٹ پاتھوں پر ان پھولوں کا سرخ قالین بچھ جاتا،ہم نے کبھی ان دنوں میں فٹ پاتھ پر چلنے کی بے ادبی نہیں کی تھی۔ بلکہ فٹ پاتھ چھوڑ کر سڑک پر چلتے اور پھولوں کے زندہ قالین کا نظارہ کرتے چلے جاتے۔اس دوران درختوں کی ڈالیوں پر سے ٹوٹ ٹوٹ کر پھولوں کی پنکھڑیاں ہمارے اوپر بھی گرتی رہتیں۔ اس دوران کبھی کوئی موٹر یا تانگہ اس سڑک پر سے نہیں گزرتا تھا۔یہ سڑک سدا کی خاموش اور خالی خالی پرسکون سڑک تھی۔شاذونادر ہی اس پر سے کوئی تانگہ یا کوئی سائیکل سوار گزرتا۔موٹر کاریں لاہور میں ویسے بھی بہت کم تھیں۔اس سڑک پر سے گزرتے ہوئے ذہن میں کئی کہانیوں کے پلاٹ جنم لیتے۔کئی ان چھوئے خیال ذہن سے گزرتے۔دسمبر کی ابر آلود صبحوں کو یہ سڑک دھند میں ڈوبی ہوتی تھی۔میں سگریٹ سلگائے اور کوٹ کے کالر چڑھائے اس سڑک پر سے گزرتا تو مجھے محسوس ہوتا کہ میں سو برس پہلے کے پیرس شہر کی کسی رومانٹک سڑک پر سے گزر رہا ہوں اور ابھی سامنے سے کوئی وانگو،کوئی پال گوگین،کوئی ایمیل زولا،بند بگھی میں بیٹھا سڑک پر سے گزر جائے گا اور گھوڑوں کے سموں کی کلپ کلوپ کی آوازیں دھند میں دور تک گونجتی چلی جائے گی۔

سردیوں کے موسم میں جب مطلع صاف ہوتا،نیلے آسمان پر سفید کبوتروں کی ٹولیاں چکر لگا رہی ہوتیں تو ڈیوس روڈ سنہری دھوپ میں ایک ایسی روشن سڑک لگتی جو مستقبل کے حسین سبزہ زاروں کی طرف جا رہی ہو۔جس سڑک پر دن کے وقت خاموشی طاری رہتی ہو اس کی رات کے وقت خاموشی کا آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔رات کو یہ سڑک کسی گمنام جزیرے کا خواب انگیز راستہ معلوم ہوتا ہے جسے ابھی کسی انسان نے دریافت نہ کیا ہو۔جس کی زمین ابھی انسانی قدموں کی چاپ سے ناآشنا ہو۔جب ساون کی جھڑیاں لگتیں تو بارش میں اس پرسکون خالی خالی

سڑک پر ایک ایسی جنگلی عورت کا گمان ہوتا جو سنسان جنگل میں اکیلی بارش میں نکل آئی ہو اور بال کھولے نہا رہی ہو۔ اب آپ آج کی ڈیوس روڈ کو دیکھ کر اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہم نے اس سڑک کا کیا حلیہ بنا دیا ہے۔ اس پر ایسے ایسے بل ڈوزر پھیرے ہیں کہ بارش میں اکیلی نہانے والی جنگلی عورت کا کہیں نام و نشان تک نہیں ملتا۔ میری آنکھوں کے سامنے آہستہ آہستہ اس خوبصورت سڑک کا حسن اس سے بچھڑتا چلا گیا۔ یہ سڑک بوڑھی نہیں ہوئی۔ سڑکیں خوبصورت عورتوں کی طرح بوڑھی ہو کر زیادہ خوبصورت ہو جاتی ہیں۔ اس سڑک کو ہم نے عین عالم شباب میں زمین میں زندہ دفن کر دیا اور سڑک کے اوپر اتنا شور برپا کر دیا کہ ہم آج ہیڈ فون لگا کر بھی اس ڈیوس روڈ کی دبی دبی آوازیں نہیں سن سکتے جو آج بھی سڑک کے نیچے سے ہمیں پکار رہی ہیں۔ کبھی اس سڑک پر ہم دوست آمنے سامنے کے فٹ پاتھوں پر چلتے ہوئے بڑے اطمینان سے ایک دوسرے سے باتیں کیا کرتے تھے۔ آج اس ڈیوس روڈ کے کنارے چلتے ہوئے ہمیں ایک دوسرے کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی۔ کبھی اس سڑک کے درمیان میں کھڑے ہو کر ہم سگریٹ سلگایا کرتے تھے اور آج ہم ایک گھنٹے بھی کھڑے رہیں تو اسے پار نہیں کر سکتے۔ میری آنکھوں کے سامنے پرانی ڈیوس روڈ مجھ سے جدا ہوئی۔ مجھ سے بچھڑتی چلی گئی۔

پہلے اس کی شملہ پہاڑی کے کونے والی کوٹھی فروخت ہوئی اور اس کے کشادہ باغیچے میں ایک ماڈرن ہوٹل کے واسطے بنیادیں کھدنی شروع ہو گئیں۔ پھر سامنے کی جانب والی کوٹھیوں کے باغیچوں میں بھی کھدائی ہونے لگی۔ اس کے بعد ہم نے مزید ترقی کی طرف قدم بڑھایا تو ڈیوس روڈ کے درختوں پر عذاب ٹوٹ پڑا۔ سرخ پھولوں والے درخت کاٹے جانے لگے۔ فٹ پاتھ کی اینٹیں اکھاڑ کر پھینک دی گئیں۔ پہلے سڑک کا ایک فٹ پاتھ اور اس کے درخت غائب ہوئے۔ اس کے بعد دوسرے فٹ پاتھ کی باری آئی اور اس کے درخت بھی فٹ پاتھ سمیت معدوم ہو گئے۔ جوں جوں لوگوں کے دل تنگ ہو گئے، ڈیوس روڈ کشادہ ہوتی گئی۔ درختوں پر کلہاڑے چلتے گئے۔ اور پھر وہ وقت آیا کہ اصلی سڑک کی جگہ ایک ایسی سڑک نمودار ہو گئی جس کا اصل سے دور کا بھی کوئی تعلق نہ تھا۔ کبھی یہ سڑک فطرت کی آغوش میں سانس لینے والی ایک آزاد جنگلی لڑکی تھی جو جنگل کی بارش میں بے فکری سے نہایا کرتی تھی اور آج یہ سڑک مجھے ایک ایسی بھکاری عورت کی طرح دکھائی دیتی ہے جس کے کپڑے پھٹے ہوئے ہیں، جس کے بالوں میں گرد جمی ہے اور جو خوف زدہ آنکھوں

سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سڑک پار کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

آج کل اس کا نام شاہراہ قائداعظم ہے۔ پہلے اسے دی مال کہا جاتا تھا۔ دی مال یورپ کے تقریباً ہر شہر میں موجود ہے۔ اسی نظریے کے ساتھ انگریزوں نے اسے دی مال کا نام دیا تھا۔ لیکن پاکستان کے قیام کے بعد اسے ہم نے اسے اپنے عظیم لیڈر قائداعظم کے نام سے موسوم کر دیا جو بڑی قابل فخر بات ہے لیکن میں چونکہ اس وقت کا ذکر کرنے لگا ہوں جب ابھی اس سڑک کا نام مال روڈ ہی تھا۔ اس لیے معذرت کے ساتھ میں اسے اس کے پرانے نام ہی سے پکاروں گا۔ عجائب گھر سے شروع ہو کر گورنر ہاؤس کے آگے تک اس سڑک کا نام مال ہی تھا اس سے پہلے لوئر مال اور اس کے آگے اپر مال کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ تب مال پر صرف ایک ہی بس چلتی تھی جو دو منزلہ ہوا کرتی تھی۔ اس کا روٹ کرشن نگر سے آرائے بازار تک تھا۔ یہ بس جب پاک ٹی ہاؤس کے آگے سے مال روڈ پر سے گزرتی تو اکثر خالی خالی ہوتی تھی۔ نچلی منزل میں چھ سات اور اوپر والی منزل میں دو ایک سواریاں ہی دکھائی دیتیں۔ میں اور انور جلال شمزہ کبھی کبھی محض سیر کی غرض سے اس کی دوسری منزل کی اگلی سیٹوں پر بیٹھ کر آرائے بازار تک جاتے اور وہاں سے واپس پاک ٹی ہاؤس آتے اور کئی جگہوں پر ان کی ٹہنیاں اومنی بس کی دوسری منزل سے ٹکرایا کرتی تھیں جس پر ہمیں بڑا افسوس ہوتا کہ ان ٹہنیوں کو تکلیف پہنچتی ہو گی۔ عام دنوں میں بھی مال روڈ پر اتنا کم ٹریفک ہوتا تھا کہ جی پی او کے پاس کھڑے ہو کر ہم ریگل چوک کراس کرنے والے آدمی کو بڑی آسانی سے دیکھ سکتے تھے۔ ابھی لاہور میں رکشوں، بسوں، ویگنوں، اسکوٹروں، ٹرکوں اور موٹر سائیکلوں اور کاروں نے افراتفری نہیں مچائی تھی۔ مال پر سے کبھی کبھی کوئی تانگہ یا موٹر گزر جاتی۔ اکثر لوگ سائیکلوں پر نظر آتے یا فٹ پاتھ پر مزے مزے چلتے دکھائی دیتے۔ اتوار کے دن چھٹی ہوتی تھی۔ اس روز تو مال روڈ دیکھنے کے لائق ہوتی۔ ہمیں اتوار کی مال روڈ خاص طور پر بڑی پسند تھی۔ میں انور جلال اور نواز اتوار کو خاص طور پر پاک ٹی ہاؤس سے اٹھ کر مال پر نکل آتے۔ پیپل کے درختوں میں گھری ہوئی لاہور کی یہ سب سے خوب صورت سڑک دور تک خالی اور سنسان ہوتی۔ ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالنے سے یوں لگتا جیسے درختوں کے درمیان کوئی سرمئی رنگ کے پانیوں والی نہر بہہ رہی ہو۔ واقعی اتوار کے دن مال روڈ بڑی خالی اور سنسان ہوا کرتی تھی۔ ہم کبھی جی پی او کے آگے لوہے کے پائپ کی ریلنگ پر آمنے سامنے بیٹھ جاتے اور اس زمانے کے مقبول فلمی گانے گاتے۔ سڑک

کے آر پار بیٹھے ایک دوسرے سے باتیں کرتے۔ گانے گاتے۔ ایک دوسرے کے لطیفوں پر قہقہے لگاتے۔ شاید ہی ہمارے درمیان سڑک پر سے کوئی تانگہ یا موٹر کار گزرتی۔

یہاں سے اٹھ کر مال کی فٹ پاتھ پر پیپل کے درختوں کے نیچے خراماں خراماں ریگل کی طرف چل پڑتے۔ مال کی دونوں جانب پہلو میں جو راستے تھے وہاں کبھی کوئی موٹر کار یا تانگہ کھڑا دکھائی نہیں دیا تھا۔ یہ ذیلی سڑکیں یا راستے خالی پڑے رہتے تھے۔ صرف دیال سنگھ بلڈنگ کے نیچے ایک سائیکل اسٹینڈ ہوتا تھا۔ اسٹینڈ پر چھ سات سائیکلیں کھڑی ہوتیں۔ آگے ''آفاق'' اخبار کے دفتر کے نیچے بھی دو ایک سائیکلیں نظر آ جاتیں۔ پھر ریگل سینما کا مال روڈ والا کشادہ گیٹ آ جاتا۔ یہاں گیٹ کی دونوں جانب پھول بیچنے والے موسم کے پھول گلدانوں اور پانی سے بھری ہوئی بالٹیوں میں ڈالے بیٹھے پھولوں کے گلدستے بنا رہے ہوتے۔ ہم یہاں تھوڑی دیر کو رکتے تاکہ گلاب اور نرگس کے پھولوں کے ساتھ سانس لے سکیں۔ ابھی پھولوں کو اخباروں کے کاغذ اور پلاسٹک کے لفافوں میں دم گھونٹ کر مارنے کا رواج شروع نہیں ہوا تھا۔ ابھی ریگل کے چوک میں گلاب، موتیا، گیندا اور نرگس کے پھول پانی کی بالٹیوں میں ٹھنڈے پڑے ہوتے اور اپنے شگفتہ چہرے اٹھا کر گزرنے والے خوبصورت پرسکون لوگوں کو دیکھ کر خوش ہوا کرتے تھے۔ کوئی لڑکی یا لڑکا پھول خریدنے آتا تو اسے پھولوں کا گلدستہ ویسے ہی بالٹی سے نکال کر پکڑا دیا جاتا اور یوں پھول زندہ اور تر و تازہ حالت میں بولتے، باتیں کرتے، ہنستے مسکراتے اس لڑکی یا لڑکے کے کمرے تک جاتے۔

تب مال روڈ کی دونوں جانب کھڑے پیپل کے درخت بھی صحت مند ہرے بھرے اور سرسبز و شاداب تھے۔ ابھی ویگنوں، رکشوں اور بسوں کے دھوئیں اور شور شرابے نے انہیں کینسر اور ٹی بی کی مہلک بیماریوں میں مبتلا نہیں کیا تھا۔ مارچ اپریل میں ان کی ڈالیوں پر گلابی، سبز اور نسواری رنگ کی چمکیلی کونپلیں پھوٹتیں اور دیکھتے دیکھتے نازک لچکیلے پتوں میں تبدیل ہو جاتیں۔ خزاں میں سرد ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ان پیپل کے درختوں پر سے زرد پتے ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے اور مال روڈ پر دور تک دوڑتے بھاگتے چلے جاتے۔ انہیں دیکھ کر یوں محسوس ہوتا جیسے یہ زرد پتے سڑک پر کھیل رہے ہوں۔ جس طرح بچے کھیلا کرتے ہیں۔ کوئی ویگن کوئی رکشا کوئی لاری انہیں روندتی ہوئی نہیں گزرتی تھی۔ ہوا کا پہلا جھونکا انہیں اپنی ڈالی سے توڑ کر سڑک پر گراتا۔ دوسرا جھونکا انہیں

مال روڈ پر دور تک دوڑا تا لے جاتا اور تیسرا جھونکا انہیں سڑک سے اچھال کر فٹ پاتھ پر ڈال دیتا۔ ابھی مال روڈ پر ان زرد پتوں میں سے کسی ایک کی بھی کچلی ہوئی لاش نظر نہ آتی تھی۔ شاہ دین بلڈنگ کی دکانوں کے آگے جو اونچے برآمدے تھے وہ خالی اور ٹھنڈے ہوتے تھے۔ مئی جون کی گرمی میں ہم ان ٹھنڈے برآمدوں میں سے ہوتے ہوئے پلازا سینما تک جاتے تھے۔ ان برآمدوں اور مال روڈ کی فٹ پاتھ کی درمیانی جگہ خالی پڑی رہتی تھی۔ کہیں کوئی کار یا رکشا یا اسکوٹر کھڑا نہیں ہوتا تھا۔

چیئرنگ کراس کے چوک میں شاہ دین بلڈنگ کے سامنے والے فٹ پاتھ کے اوپر یوکلپٹس کے چار درخت ہوا کرتے تھے جو ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ یہ اصلی یوکلپٹس کے درخت تھے اور ان کی نازک لچکیلی ڈالیاں ہوا میں لہرایا کرتی تھیں۔ آج ان میں سے صرف ایک ہی درخت باقی رہ گیا ہے۔ تین درخت اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ بسوں ویگنوں کے دھوئیں نے انہیں وقت سے پہلے ہلاک کر ڈالا ہے۔ آخری درخت بھی اداس اور بیمار ہے اور جس بیمار کی کوئی خبر لینے والا نہ ہو، کوئی علاج کرنے والا نہ ہو، وہ کب تک زندہ رہ سکتا ہے۔

مال روڈ کے ریگل چوک میں ہی بھٹی فوٹو گرافر کے پہلو میں شیزان ہوٹل کے شیشوں کے پیچھے وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کے چمکتے ہوئے چہرے نظر آتے تھے۔ شیزان میں کبھی رش نہیں دیکھا تھا۔ آگے سڑک ہمیشہ خالی رہتی اور گرمیوں کی شام کو موتیے کے ہار اور گجرے بیچنے والے آ کر گھوما کرتے۔ چند قدم آگے بائیں جانب ایک چھوٹا سا فرنچ ٹائپ کا چھوٹا سا کاٹج نما کافی ہاؤس کھل گیا جس کی نیم روشن فضا بڑی پراسرار لگتی۔ یوں محسوس ہوتا جیسے کسی ایسے بحری جہاز کی کینٹین میں بیٹھے کافی پی رہے ہیں جو آدھا سمندری ریت میں دھنس گیا ہے اور جس کے مسافر اور عملہ اسے چھوڑ کر جا چکا ہے۔ اس کاٹج کا فرانسیسی نام شالیٹ ہوا کرتا تھا۔ اور اس کی ایک دیوار پر بحری جہاز کا ایک لنگر بھی لٹکا ہوا ہوتا تھا جہاں اب الفلاح بلڈنگ کھڑی ہے۔ وہاں شاید پنجاب اسمال انڈسٹریز کا ایک چھوٹا سا دفتر ہوتا تھا جس کے گرداگرد بڑا خوش نما باغیچہ لگا تھا۔ اس میں موسم کے پھول دھوپ میں مسکرایا کرتے تھے۔ اسمبلی ہال کے سامنے والے قطعے میں اتنے گھنے اور گنجان درخت ہوتے تھے کہ یہ قطعہ جنگل کا ایک ٹکڑا لگتا تھا۔ پلازا سینما کی طرف سے ان درختوں کی وجہ سے اسمبلی ہال کی عمارت بالکل دکھائی نہیں دیتی تھی۔ دوسری طرف فری میسن ہال پر ایک پراسرار

آسیبی قسم کی خاموشی ہر وقت چھائی رہتی تھی۔ اس سنسان عمارت سے خاموشی کی لہریں نکل نکل کر مال روڈ کو اپنی بانہوں میں سمیٹی رہتی تھیں۔ اس خاموشی میں چڑیا گھر میں کوئی مور بولتا تو اس کی آواز دیر تک فضا میں گونجتی رہتی۔ لارنس باغ کی طرف سے پھولوں، سبزے کی خوشبو اور پرندوں کے بولنے کی آوازیں سنائی دیا کرتیں۔ شہر میں آبادی کا پھیلاؤ اور سیم وزر کی ریل پیل شروع ہوئی تو مال روڈ کا حسن بکھرنے لگا اور بکھرتا ہی چلا گیا۔ اب شاہراہ قائداعظم اور شاہ عالمی کی سڑک میں صرف یہی ایک فرق ہے کہ شاہ عالمی سے رنگ محل جانے والی سڑک لوہاری دروازے کے پاس واقع ہے۔ جبکہ شاہراہ قائداعظم ٹمپل روڈ کے پاس واقع ہے۔ آج کی شاہراہ قائداعظم کا حال احوال بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ وہ آپ کے سامنے ہے اور اس پر سے آپ اکثر گزرنے کا خطرہ مول لیتے رہتے ہیں۔ میں نے تو آپ کو صرف اس شاہراہ قائداعظم کی ایک جھلک دکھائی تھی جو آج آپ کے سامنے نہیں ہے اور جس پر سے شاید ہی آپ کبھی گزرے ہوں۔

لاہور کی ایک اور چھوٹی سی ذیلی سڑک برڈ ووڈ روڈ ہوا کرتی تھی جو جیل روڈ سے نکلتی اور کوئنز روڈ پر جا کر ختم ہو جاتی تھی۔ بفضل تعالیٰ یہ سڑک آج بھی اپنی جگہ پر قائم و دائم ہے اور انشاء اللہ ہمیشہ سلامت رہے گی۔ لیکن جس برڈ ووڈ روڈ کا میں ذکر کرنے والا ہوں وہ آج کی برڈ ووڈ روڈ سے بہت مختلف تھی۔ جس طرح کسی بڑی نہر سے ایک چھوٹی سی نہر نکال کر پھل دار باغوں میں ڈال دی جاتی ہے بالکل اسی طرح یہ سڑک جیل روڈ سے نکل کر کوئنز روڈ کی طرف ایک خاموش بے آواز نہر کی طرح چلی گئی تھی۔ اس سڑک پر ہمارے ایک دوست کی کوٹھی ہوا کرتی تھی۔ پرانی طرز کی برآمدوں اور کچی چھت والی کوٹھی تھی جس کے آگے پیچھے ویران باغ تھا۔ دیوار کے ساتھ ساتھ ٹاہلی اور شہتوت کے درخت سارا دن چپ چاپ کھڑے رہا کرتے۔ ہم کبھی اپنے دوست سے ملنے اس کی کوٹھی کے پرانے گیٹ سے گزر کر کچے راستے پر چلتے ہوئے برآمدے کی طرف جاتے تو ہمیں اپنے قدموں کی آواز اپنا تعاقب کرتی سنائی دیتی۔ اس کوٹھی سے آگے مجھے یاد نہیں کہ کوئی کوٹھی آتی ہو۔ کافی آگے جا کر بائیں جانب ایک سال خوردہ کوٹھی ضرور آتی تھی جس کے لان میں اتنے درخت اگے ہوئے تھے کہ کوٹھی کا برآمدہ بمشکل نظر آتا۔ پھر آگے بائیں جانب تالاب آ جاتا جہاں کچھ لوگ کناروں پر بیٹھے مچھلیاں پکڑنے کے انتظار میں جیسے پتھر ہو گئے ہوتے تھے۔ تالاب کی سطح پر ہری ہری کائی کی تہہ چڑھی ہوئی تھی۔ کوئنز روڈ پر سامنے پہاڑی کی ڈھلان پر بھی درخت جھک کر

خالی سڑک کا نظارہ کر رہے ہوتے۔ کوئنز روڈ بھی جیسے کسی کے انتظار میں چپ چپ سی رہا کرتی۔ مزنگ چونگی والے چوک میں نہ ہونے کے برابر ٹریفک ہوتا تھا۔ یہاں سے جو سڑک ٹمپل روڈ کی طرف جاتی ہے۔ اس کی ایک جانب چھوٹی سی پرانی مسجد کے پیچھے ایک تکونا کھیت ہوا کرتا تھا جہاں عام طور پر تمباکو کی کاشت کی جاتی تھی۔ پہلے تمباکو کے چھوٹے چھوٹے پتے کیاریوں میں نمودار ہوتے جو دھوپ میں چمکا کرتے۔ پھر یہ پودے بن جاتے۔ پتے چوڑے چوڑے ہوتے تھے دھوپ میں کچھ دنوں کے بعد ان کا رنگ گہرا نسواری ہو جاتا۔ پھر فصل کاٹ لی جاتی اور کھیت اگلی فصل تک کے لیے خالی ہو جاتا۔ مجھے ایک کسان نے بتایا تھا کہ ہم یہاں تمباکو بوتے ہیں۔ اس کے بالکل سامنے جہاں آج کل عابد مارکیٹ بن گئی ہے وہاں اینٹوں کی ایک بوسیدہ دیوار کے پاس کچھ سرکی بندوں کی جھونپڑیاں بنی ہوتی تھیں۔

جیل روڈ پر بھی کوئی رش نہیں تھا۔ اس کی ٹاہلیوں کے درخت بڑے گنجان اور گہری چھاؤں والے تھے۔ ایک طرف جیل کی اونچی کچی دیوار نظر آتی تھی۔ آگے جیل کے محکمے کے کچھ رہائشی کوارٹرز ہوا کرتے تھے۔ شادمان کا ابھی کوئی وجود نہیں تھا۔ شادمان کا چوک بھی نہیں بنا تھا۔ جیل کے کوارٹر اس چوک سے بھی آگے تک چلے گئے تھے۔ یہاں ایک جگہ تھی جہاں کبھی پھانسی گھر ہوا کرتا تھا۔ لوگ کہا کرتے تھے کہ اس جگہ کسی مشہور انقلابی کو پھانسی دی گئی تھی۔ ویسے یہاں عام طور پر موت کی سزا پانے والوں کو پھانسی چڑھایا جاتا تھا۔ چنانچہ جب شادمان کالونی بنی اور اس کے پلاٹ دھڑا دھڑ بکنے شروع ہوئے تو وہ پلاٹ خالی ہی پڑا رہا جہاں جیل کا پھانسی گھر ہوتا تھا۔ کوئی بھی خوف کے مارے یہ پلاٹ نہیں خریدتا تھا کہ کہیں پھانسی پا چکے مجرموں کی روحیں ان کی کوٹھیوں میں آ کر انہیں تنگ نہ کریں۔ شمع سینما سے شادمان چوک کی طرف جاتے ہوئے میں نے خود دیکھا ہے کہ آس پاس کی ساری کوٹھیاں بن گئی تھیں مگر یہ پھانسی کی کوٹھڑی والا پلاٹ ایک مدت تک خالی پڑا رہا۔ لوگ اس جگہ کوڑا کرکٹ پھینکنے لگے تھے۔ لیکن جیسا کہ ہوتا ہے صنعتی ترقی کے دور کے ساتھ ساتھ لوگوں کے توہمات بھی مدھم پڑتے جاتے ہیں اور یہ بھی ہم نے بڑے بوڑھوں سے سنا ہے کہ جیسے جیسے آبادی بڑھتی ہے جن بھوت جنگلوں ویرانوں کی طرف بھاگنا شروع ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ آخر یہ پھانسی کی کوٹھڑی والا پلاٹ بھی فروخت ہو گیا اور وہاں کوٹھی بن گئی۔ آج اس طرف سے گزرتے ہوئے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ یہاں پھانسی کی کوٹھڑی والا پلاٹ کون سا تھا۔

جو سڑک...... بلکہ چھوٹی سی گلی نما سڑک میکلوڈ روڈ سے نکل کر ناز سینما کے سامنے سے ہوتی ہوئی گوالمنڈی چوک کی طرف جاتی ہے، اس کا نام چرچ روڈ ہے۔ قیام پاکستان سے کافی دیر بعد یہ چھوٹی سی سڑک ایک ایسے گمنام غار کی طرح ہوا کرتی تھی جس کے اوپر چھت نہ پڑی ہو۔ خال خال ہی ادھر سے کوئی انسان گزرتا تھا۔ رات کے وقت تو جیسے یہ کوئی آسیبی سڑک بن جاتی تھی اور چوکیدار بھی ادھر سے گزرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ یہاں دونوں جانب دیواریں تھیں۔ ایک طرف چرچ کی دیوار اور دوسری طرف میڈیکل کالج کے گراؤنڈ کی دیوار۔ یہ بڑی پرانی دیواریں تھیں اور ان پر کسی پرانے قلعے کی دیواروں کا گمان ہوتا تھا۔ میں اکثر بڑے اداس شعر گنگناتے ہوئے اس سڑک پر سے گزرا کرتا تھا۔ یہ میرے لیے رومان خیز سڑک تھی۔ لیکن جب گوالمنڈی کی طرف ٹریفک کا شور اور گرد و غبار کا دباؤ بڑھ گیا تو گوالمنڈی سے میکلوڈ روڈ کی طرف پیدل آنے کے واسطے میں اس سڑک کو ایک ڈھال کے طور پر استعمال کرنے لگا۔ آہستہ آہستہ یہ ڈھال بھی شکستہ ہوتی گئی۔ چرچ روڈ پر اتنے رکشے اور گاڑیاں اور اسکوٹر دوڑنے لگے کہ خود چرچ روڈ سے بچ کر نکلنا مشکل ہو گیا۔ لاہور کی یہ سڑک بھی مجھ سے جدا ہو گئی۔ چونکہ اس سڑک پر کوئی فٹ پاتھ نہیں ہے اور دونوں جانب دیواریں ہیں اور ٹریفک یہاں بھی بڑی تیز رفتاری سے صبح و شام جاری رہتا ہے اس لیے میں پیدل چلنے والے حضرات کو اس سڑک پر جانے کا خطرناک مشورہ نہیں دوں گا۔ چرچ روڈ...... کس قدر خوب صورت اور پاکیزہ نام ہے اس پتلی سی سڑک کا۔ مگر بڑھتی ہوئی آبادی نے ہم پیدل چلنے والوں اور لاہور کی سڑکوں کے وفادار دوستوں کو اس سڑک سے بھی محروم کر دیا ہے۔ صد افسوس۔

لاہور ہوٹل سے جو منٹگمری روڈ اسمبلی ہال کی طرف جاتی ہے اس کا حسن بھی ان دنوں اپنی ایک الگ انفرادیت رکھتا ہے۔ اس سڑک کی دونوں جانب بھی پیپل کے اونچے اونچے اور بڑے پرانے درخت تھے۔ لاہور ہوٹل سے لے کر اسمبلی تک اس سڑک پر کسی جگہ کوئی دکان نہیں تھی۔ ایک دو کھوکھے تھے جہاں سائیکلوں وغیرہ کی مرمت ہوتی تھی۔ بائیں طرف قلعہ گوجر سنگھ عبدالکریم روڈ کی گلیاں اور مکان تھے۔ جہاں گلستان سینما ہے وہاں ایک پرانی وضع کی کوٹھی ہوا کرتی تھی جو کافی حد تک ڈھے چکی تھی اور ایک عرصے سے خالی پڑی تھی۔ آگے میڈیکل اسکول کا ہوسٹل تھا۔ اس سے آگے ایک ویران ہوٹل تھا جس کا نچلا پورشن پاکستان رائٹرز گلڈ نے کرائے پر لے لیا تھا۔

سامنے وہی کاٹج نما پراسرار آسیبی ہوٹل تھا جس کے قریب سے بھی لوگ نہیں گزرتے تھے۔ دن بھر اس سڑک پر سے بھی بہت کم لوگوں کا گزر ہوتا۔ خزاں کی آمد کے ساتھ ہی پیپل کے درختوں پر سے زرد رنگ کے پتے گرنے لگتے اور ساری سڑک پر اڑتے پھرا کرتے۔ ان پتوں کی چمک ایسی ہوتی تھی کہ جیسے ان پر کسی کریم کا پالش کیا گیا ہو۔ یہاں سے گزرتے ہوئے میں ایک پتا ضرور اٹھا لیتا تھا۔ اس سڑک کا بھی حلیہ بدلنا شروع ہو گیا۔ ایک ایک کر کے درخت کٹنے لگے۔ پہلے اس طرف کے درخت کٹے جدھر قبرستان کی دیوار لگتی تھی۔ مقصد سڑک کو بڑھتی ہوئی ٹریفک کے لیے کشادہ کرنا تھا۔ یہاں کھوکھے پڑنے لگے جنہیں بعد میں لوگوں نے باقاعدہ پکی دکانوں میں تبدیل کر لیا۔ سامنے کی طرف کے درخت بھی کٹ گئے۔ یہاں لوگوں نے پہلے اپنے مکانوں کے نیچے دکانیں کھول لیں۔ پھر یہ دکانیں دفتروں اور چھوٹی چھوٹی مارکیٹوں کی شکل اختیار کر گئیں۔ اب صورت حال یہ ہے کہ اس سڑک پر نشانی کے طور پر شاید ایک آدھ پیپل کا درخت ہی رہ گیا ہے۔ دن بھر یہاں بھی لاہور کی دوسری مصروف ترین سڑکوں کی طرح ٹریفک کا شور مچا رہتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ لاہور شہر نے بڑی ترقی کر لی ہے اور سڑکیں کشادہ اور خوبصورت بنا دی گئی ہیں لیکن مصیبت یہ ہوئی کہ ہم نے لاہور شہر کو پیدل چلنے والوں کے لیے ناممکن بنا دیا ہے۔ جہاں سڑکوں کے ساتھ ساتھ فٹ پاتھ بنے ہیں وہاں یہ حال ہے کہ ہر وقت لوگوں نے اسکوٹر کھڑے کر رکھے ہوتے ہیں۔ گاڑیاں اوپر چڑھائی ہوتی ہیں۔ شاید ہی لاہور شہر کے وسطی علاقے میں کوئی ایسی سڑک ہو جہاں سے آپ سکون کے ساتھ پیدل گزر سکیں۔ ہم امریکہ اور یورپ کی سڑکوں کے ساتھ اپنی سڑکوں کا موازنہ نہیں کر سکتے۔ ان لوگوں کا اپنا ماحول اپنی بیک گراؤنڈ ہے۔ ہمارا اپنا ماحول اور اپنی تہذیب ہے۔ ان ٹھنڈے ملکوں میں رہنے والوں کا دوپہر کو فیکٹریوں اور ریستورانوں میں کام کرنا بہت ضروری ہے جب کہ ہمارا گرمیوں میں دوپہروں میں درختوں کی چھاؤں میں بے سدھ ہو کر سونا بھی بہت ضروری ہے۔ ہم اگر اپنے ملک میں گرمیوں کی چلچلاتی دوپہروں میں گھروں یا باغوں میں آرام کرنے والوں کو اٹھا کر فیکٹریوں میں مشینوں کے آگے کھڑا کر دیں تو یہ ان لوگوں کے ساتھ ایسی ہی زیادتی ہو گی کہ جیسے ہم یورپ کے کسی ٹھنڈے ملک میں دوپہر کو فیکٹری میں کام کرتے آدمی کو کہیں کہ وہ کام چھوڑ کر سو جائے۔ ہر ملک کی تہذیب، تمدن اور رہن سہن اور طور طریقے اپنے اپنے ملک کی آب و ہوا کے مطابق ہوا کرتے ہیں۔ یہ

تاریخ بلکہ جغرافیے کا ایک نہ بدلنے والا اصول ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے شہر کی سڑکوں پر زیادہ رش نہ ہونے دیں اور ذرا سے کام کے لیے اسکوٹر یا موٹر پکڑ کر گھر سے نہ نکلیں۔ ہم لوگ تو بغیر کسی کام کے بھی گھر سے نکل پڑتے ہیں۔ اسی لیے سڑکوں پر ٹریفک زیادہ ہو جاتی ہے اور اس کی وجہ سے کئی ایک مسئلے پیدا ہو جاتے ہیں۔

لاہور ہی میں ایک سندر داس روڈ ہے جو ڈیوس روڈ والے چوک سے حضرت میاں میر صاحب کی نہر کے پل کی طرف جاتی ہے۔ اس سڑک پر ایچی سن کالج کے بانس کے درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ جھکے ہوتے تھے۔ دوسری جانب آم کے درختوں کی گھنی اور ٹھنڈی چھاؤں والی قطار شروع سے آخر تک چلی گئی تھی۔ ان درختوں کے قدموں میں ایک چھوٹی سی نہر بہتی تھی۔ ساون کی بارشوں میں اس سڑک کی خوبصورتی اور حسن دیکھنے سے تعلق رکھتا۔ بارش ویسے بھی بانس اور آم کے درختوں کی عاشق ہے۔ یہ درخت بھی بارش سے پیار کرتے ہیں۔ یہاں ساون کے دنوں میں کوئلیں ضرور بولتی تھیں۔ بانس کی نازک ہری بھری ٹہنیاں برسات کے سرمئی بادلوں کو دور سے دیکھتے ہی ہاتھ ہلانے لگتی تھیں۔ آم کے درختوں کی ڈالیاں ہرے ہرے کچے آموں کے گچھوں کے بوجھ سے جھک جاتی تھیں۔ پھر ایسا ہوا کہ اس علاقے میں بڑھتی ہوئی ٹریفک کا دباؤ اس سندر داس روڈ پر بھی پڑنے لگا اور ایک دن درختوں کے جلاد یہاں بھی آرے کلہاڑیاں اور سیڑھیاں لے کر آ گئے۔ انہوں نے ایچی سن کالج کی دیوار گرا کر اس جانب کے بانس کے درختوں کا صفایا کر دیا۔ اس سے کیا مسئلہ حل ہو گیا؟ نہیں۔ ٹریفک کا دباؤ اب اس سڑک پر بھی بڑھ گیا ہے۔ لیکن اب اسے مزید کشادہ نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ آگے لوگوں کے گھر ہیں۔

کہتے ہیں وہ سڑک لاہور کی سب سے بڑھ کر خوب صورت سڑک ہے جو میاں میر نہر کے ساتھ ساتھ ملتان روڈ کی طرف جاتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بہت ہی خوب صورت اور دلکش سڑک ہے اور غیر ملکی سیاح اور سفارت کار اس سڑک کو بہت ہی پسند کرتے ہیں اور یہاں خاص طور پر تصویریں اتروا تے ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس سڑک کو جن لوگوں نے آج سے کچھ عرصہ پہلے دیکھا ہے وہ اس کے حقیقی حسن کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ تب اس سڑک پر اتنی موٹر کاریں، رکشا اور ویگنیں نہیں چلتی تھیں۔ صرف نہر چلتی تھی اور نہر کے چلنے کی آواز بھی سنائی دیا کرتی تھی لیکن اب نہر کم چلتی ہے اور ٹریفک زیادہ چلتی ہے۔ تب اس کے کنارے یہی پاپولر کے

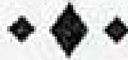
درخت نئے نئے لگے تھے۔ میرا خیال ہے کہ ان دنوں یہ درخت اپنی دسویں یا گیارہویں سالگرہ منا رہے ہوں گے۔ پت جھڑ کے دنوں میں یہ نہر کنارے والی رومانٹک خالی خالی سڑک خشک پتوں سے بھر جاتی تھی اور ہلکی ہلکی بوندا باندی کی طرح پتے درختوں کی ڈالیوں سے گرتے ہی رہتے تھے۔ ان دنوں ٹریفک صرف نہر کے ایک کنارے پر ہی جاری تھی۔ دوسرا کنارہ ابھی کچا تھا۔ ادھر کوئی پختہ سڑک نہیں بنی تھی۔ چنانچہ اس سڑک پر سے گزرتے ہوئے جب درختوں پر سے پتے گرتے تو یوں لگتا جیسے پت جھڑ کی بارش ہو رہی ہے۔ ایک جانب لارنس باغ تھا۔ دوسری طرف نرسریاں تھیں جہاں رنگ برنگ کے پھول پودے گملوں میں لگے مسکرایا کرتے۔

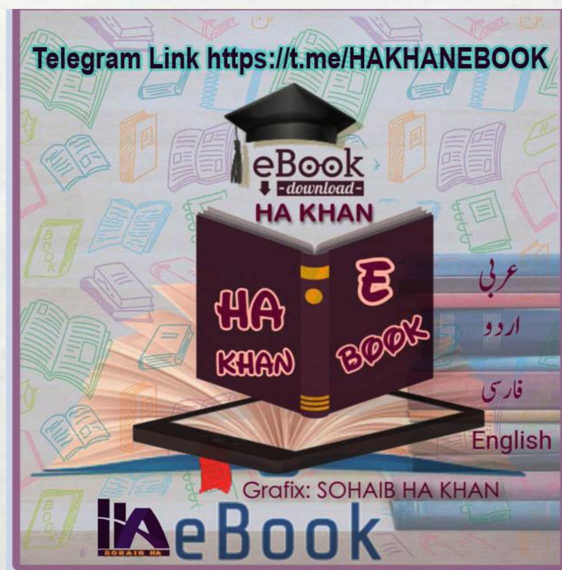
اگر ہم بے مقصد گاڑیوں میں بیٹھ کر گھروں سے نکلنا چھوڑ دیں تو اس خوب صورت سڑک کا اصلی حسن واپس آسکتا ہے۔

ایسی ہی خاموش اور پرسکون ایمپریس روڈ بھی ہوا کرتی تھی۔ اس کی دونوں جانب بھی پیپل کے درخت تھے۔ یہ درخت آج بھی ہیں مگر پٹرول اور ڈیزل کے دھوئیں نے ان کا حلیہ بگاڑ ڈالا ہے۔ یہ درخت پہچانے نہیں جاتے اور ماہرین کا کہنا ہے کہ اگر فضا میں ڈیزل اور پٹرول کی آلودگی کا یہی حال رہا تو یہ درخت بہت جلد مر جائیں گے۔ میرا خیال ہے کہ یہ درخت مر چکے ہیں صرف ان کو دفنانا ہی باقی رہ گیا ہے۔

ایک اور رومانٹک سڑک ہوتی تھی جو شاہدرہ چوک سے دریائے راوی کی طرف نکلتی تھی۔ اس سڑک کو یوکلپٹس کے نازک درختوں نے اپنی گود میں لے رکھا تھا۔ ہوا کے جھونکوں کے ساتھ یہ درخت جھومتے رہتے تھے۔ یہ پتلی سی سڑک کھیتوں کے درمیان میں سے گزرتی تھی۔ میں کئی بار اس سڑک پر سے گزر کر دریا پر گیا ہوں۔ مگر ادھر کارخانوں کی تعمیر شروع ہوئی تو یہ سڑک غائب ہو گئی۔ اس جگہ اب اونچی اونچی چمنیوں والے کارخانے نظر آتے ہیں۔ کھاد، رنگ روغن اور دوسرے کارخانے اس سڑک کو کھا گئے ہیں۔ اب یہ سڑک کارخانے کبھی واپس نہیں کریں گے۔
اسی شاہدرہ چوک سے جو کچی سڑک کھجور کے درختوں کی طرف جاتی تھی اور جس کی دونوں جانب خانہ بدوشوں کی جھونپڑیاں ہوتی تھیں۔ اس سڑک کا اب کہیں کوئی نام و نشان تک نظر نہیں آتا۔ اس کی جگہ خدا جانے کیا کیا کچھ بن گیا ہے۔ مستی گیٹ سے بادامی باغ ریلوے اسٹیشن کو جانے والی سڑک بھی قیام پاکستان کے وقت بڑی تنہا تنہا اور چپ چاپ سی ہوا کرتی تھی۔ اب اول تو یہ سڑک

پہچانی ہی نہیں جاتی دوسرے اگر آپ اس پر نکل آئیں اور پھر واپس مستی گیٹ بھی پہنچ جائیں تو میں آپ کو خوش قسمت ترین انسان سمجھوں گا۔ پرانی، سڑکیں، پرانے راستے محبتوں کے راستے لگتے تھے۔ درختوں میں گھرے ہوئے، خاموش خاموش، پرسکون راستے۔ نئی سڑکوں اور نئے راستوں پر ایک کمرشل افراتفری مچی ہوئی ہے کوئی کسی کو نہیں پہچانتا۔ بس بھاگے جارہے ہیں۔ بھاگے جارہے ہیں۔ کیا کبھی زندگی پھر سے ان محبت بھرے پرسکون راستوں پر واپس لوٹ آئے گی؟





لاہور کے پرانی تھیٹر کمپنیاں اور سینما گھر

لاہور کے سینما گھروں اور تھیٹروں کی تاریخ بھی کافی پرانی ہے اوران کے ساتھ لاہور شہر کی ادبی، ثقافتی اور تہذیبی زندگی کی بڑی اہم روایات وابستہ ہیں۔ سب سے پہلے میں لاہور کے کچھ پرانے اور کچھ نئے سینما گھروں کا ذکر کروں گا۔

لاہور کے ریوالی سینما میں میں نے پہلی فلم ''دیوداس'' دیکھی تھی۔ میں کسی کی گود میں بیٹھا ہوا تھا اور میرے کانوں میں کسی کی آواز پڑی تھی جس سے مجھے معلوم ہوا کہ جو فلم اسکرین پر چل رہی ہے اس کا نام ''دیوداس'' ہے۔ اس کے بعد اس سینما گھر میں میں نے اس وقت کے مشہور ہیرو شاہو موڈک کی فلم ''لیل ونہار'' دیکھی۔ اس وقت میری عمر چھ سات برس ہوگی۔ ہمارا اپنا گھر امرتسر میں تھا مگر لاہور میں کچھ ایسی رشتے داریاں تھیں کہ امرتسر سے لاہور ہمارا آنا جانا لگا ہی رہتا تھا۔ میری سب سے بڑی بہن تو مستقل طور پر لاہور آگئیں تھیں۔ ہفتے میں دو تین چکر میرے ان کے ہاں لگ جاتے تھے۔ ریوالی سینما کا پہلا نام منور تھیٹر تھا۔ یہاں پہلے تھیٹر کے کھیل دکھائے جاتے تھے جو میری ہوش سے پہلے کی بات ہے۔ اس کے بعد اس کا نام نولکھا سینما پڑ گیا۔ پھر ریوالی سینما رکھ دیا گیا۔ یہ سینما گھر لاہور ریلوے اسٹیشن کے سامنے بادامی باغ کو جانے والی سڑک پر واقع تھا۔ شروع ہی سے مجھے انگریزی فلمیں دیکھنے کا شوق تھا۔ امرتسر کے چھاؤنی والے سینما گھر میں انگریزی فلمیں لگتیں تھیں مگر یہ سینما گھر گورے فوجیوں کے لیے ایک بارک میں پردہ ڈال کر بنایا گیا تھا۔ ہال میں بنچ بچھے ہوتے تھے۔ یہ بے آرام سینما گھر تھا۔ اسی زمانے میں ریوالی سینما میں بھی انگریزی فلمیں لگنے لگیں اور یہاں اکثر خوفناک فلمیں لگتی تھیں جو مجھے بہت پسند تھیں۔ چنانچہ میں امرتسر سے ریل میں بیٹھ کر لاہور پہنچتا۔ چونکہ میں عام طور پر بغیر ٹکٹ سفر کرتا تھا اس لیے ریل سے اتر کر لائنوں لائن بادامی باغ کی طرف چل پڑتا۔ ریوالی سینما کے عین سامنے ریلوے لائن کی دو مرد اونچی دیوار کے ساتھ بجلی کا ایک کھمبا لگا ہوا تھا۔ میں اس کھمبے سے لپٹ کر گھسٹتا ہوا نیچے سڑک پر اتر آتا۔ سینما گھر میں جاتے ہی تھرڈ کلاس کی ٹکٹ لیتا اور ہال میں بنچ پر جا کر بیٹھ جاتا۔ میں نے

یہاں جو انگریزی فلمیں دیکھیں، ان میں سے مجھے ''فرینکن اسٹائن'' ''دی وولف مین'' ''فرینکن اسٹائن اینڈ دی وولف مین'' وغیرہ فلمیں آج بھی یاد ہیں۔ فلم دیکھنے کے بعد میں سیدھا ریلوے اسٹیشن پر آتا۔ رات کو امرتسر جانے والی آخری ٹرین پٹھان کوٹ ایکسپریس تیار ہوتی تھیں۔ اس میں سوار ہو جاتا اور رات ساڑھے دس بجے کے قریب امرتسر پہنچ جاتا۔ گھر میں کوئی پوچھتا تو کہتا کہ لکڑ منڈی میں دوستوں کے ساتھ لیڈی بہادر کھیل رہا تھا۔ کبھی کبھی والد صاحب سے مار بھی پڑ جاتی۔

لاہور کا چوک بھاٹی گیٹ قدیم سینما گھروں کا گڑھ تھا۔ یہاں دو تین سینما گھر تھے جو قیام پاکستان سے بہت پہلے تعمیر ہوئے تھے۔ بلکہ خاموش فلموں کے ساتھ ہی بن گئے تھے۔

مگر مجھے یہاں خاموش فلموں کا زمانہ یاد نہیں۔ وہ بچپن سے پہلے کی بات ہے۔ ویسے امرتسر کے پرل ٹاکیز میں میں نے دو خاموش فلمیں دیکھی تھیں جن کے دو ایک منظر آج بھی یاد ہیں۔ ایک فلم شاید صبح کا ستارہ دیکھنے میں اپنے محلے کے شفیع سنیارے کی انگلی پکڑ کر گیا اور دوسری فلم سلوچنا کی ''مادھوری'' تھی۔ لاہور کے چوک بھاٹی گیٹ کے عین درمیان میں جو سینما گھر تھا وہاں اس زمانے میں گل حمید کی فلم ''باغی سپاہی'' لگی تھی۔ اس فلم کی بڑی شہرت تھی۔ یہ کاردار نے بنائی تھی اور سارے ہندوستان میں بڑی مقبول ہوئی تھی۔ میں نے یہ فلم اس سینما ہاؤس میں اگلے بنچوں پر بیٹھ کر دیکھی جس کے دو چار منظر خواب کی طرح یاد رہ گئے ہیں۔

ایک اور سینما ہاؤس بھاٹی گیٹ کے سامنے ضلع کچہری والی سڑک کے کنارے واقع تھا۔ یہ سینما گھر آج بھی ہے۔ جس سینما گھر میں باغی سپاہی فلم لگی تھی شاید اس کا نام کراؤن سینما تھا۔ وہ ڈھا دیا گیا ہے اور اس کی جگہ اب سڑک بن گئی ہے۔ بھاٹی گیٹ کے سامنے والے سینما گھر میں پنجابی کی فلم ''سہتی مراد'' لگی۔ میں بڑے شوق سے یہ فلم دیکھنے گیا تھا۔ اس فلم کا طوفان کا منظر مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے۔ اس طوفان میں آہو چشم راگنی اپنے دوپٹے کو سنبھالتی ہوئی سرکنڈوں میں سے گزرنے کی کوشش کر رہی ہوتی ہے۔

ہیرا منڈی میں دو سینما گھر تھے۔ ایک چوک میں تھا اور دوسرا سینما ٹکسالی دروازے کی طرف جائیں تو بائیں ہاتھ واقع تھا۔ یہ بڑے گندے سینما ہاؤس ہوا کرتے تھے۔ ہال کی کرسیوں اور بنچوں میں کھٹمل بھرے ہوتے تھے۔ کھٹمل سے میں شروع ہی سے الرجک رہا ہوں۔ پنڈی میں ایک

بار اپنے ایک دوست کے گھر سویا تو چارپائی کے کھٹمل بیدار ہو گئے۔ رات کے دس بجے پہلے کھٹمل نے حملہ کیا تو میں اٹھ بیٹھا اور چپکے سے کمرے سے نکل کر پنڈی ریلوے اسٹیشن پر آ گیا۔ وہ رات میں نے پنڈی ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارموں پر ٹہل کر اور کچھ بنچ پر سو کر گزاری۔ مجھے ریلوے اسٹیشنوں پر راتوں کو جاگنا یا بنچوں پر سونا اچھا لگتا ہے۔ ٹکسالی دروازے والے سینما گھر میں ایک بار فلم دیکھنے گیا تو کھٹملوں نے کاٹنا شروع کر دیا۔ اسی وقت سینما ہال سے باہر آ گیا اور پھر کبھی اس سینما ہاؤس میں نہیں گیا۔ ہیرا منڈی کے چوک میں جو سینما گھر ہے وہاں شاید ہی میں نے کوئی فلم دیکھی ہو۔ قیام پاکستان کے بعد یہ سینما گھر میرے ایک دوست نے ٹھیکے پر لے لیا تھا۔ ایک بار اس کے ساتھ گیلری میں بیٹھ کر انگریزی فلموں کے دو ٹکڑے دیکھے تھے جو سنسر کر دیے گئے تھے۔

لاہور کے ریگل اور پلازا سینما بھی کافی پرانے ہیں مگر اتفاق کی بات ہے کہ قیام پاکستان سے پہلے یہاں میں نے کوئی فلم نہیں دیکھی تھی۔ ریگل سینما میں قیام پاکستان کے بعد فلم دیکھنے کا سلسلہ شروع ہوا اور یہاں بڑی اعلیٰ پائے کی معیاری انگریزی فلمیں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ پلازا سینما میں بھی بڑی اچھی انگریزی فلمیں لگتی تھیں۔ منٹگمری کلف ہمارا پسندیدہ رومانٹک ہیرو تھا۔ اس کی مشہور فلمیں ''اے پلیس ان دی سن''، ''آئی کنفیس'' اور ''دی ہیرلیس'' میں نے اپنے دوستوں کے ساتھ ان ہی سینما گھروں میں دیکھی تھیں۔ میکلوڈ روڈ کی طرف آ جائیں تو یہاں نشاط سینما کی شہرت سب سے زیادہ تھی۔ ریجنٹ سینما، رٹز سینما، قیصر سینما اور صنوبر سینما بھی پاکستان سے پہلے کے تھے۔ قیصر سینما میں، میں نے پراسرار نینا کی دو فلمیں ''ایک رات'' اور ''من کی جیت'' دیکھی تھیں۔ ۴۸-۱۹۴۷ء میں لاہور میں انڈین فلمیں بھی سینما گھروں میں چلتی تھیں۔ ریڈیو پاکستان پر بھی انڈین فلمی گیت نشر ہوتے تھے۔ صنوبر سینما میں پنجابی فلم ''پھیری'' لگی تو اس کے گانوں نے دھوم مچا دی۔ انور جلال شمزہ، نواز وغیرہ یہ فلم دیکھنے گئے۔ رتن سینما بھی اگرچہ مشہور تھا مگر اس طرف صرف اس لیے جاتے تھے کہ فلمی ہفت روزہ ''اداکار'' کا دفتر تھا اور ہمارا دوست قمر اجنالوی اس کا مدیر تھا۔

اوڈین سینما کی کہانی بھی بڑی عبرت ناک ہے۔ اس کا مالک کوئی ہندو سیٹھ تھا۔ اس نے بڑے شوق سے یہ سینما گھر بنوایا۔ اسے ہر طرح کی آرائش اور جدید مشینری سے لیس کیا۔ سینما ہاؤس تیار ہو گیا۔ بجلی بھی آ گئی۔ پہلی فلم کی نمائش کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ فسادات شروع ہو گئے۔

پھر پاکستان بن گیا اور یہ سینما گھر کسی مسلمان مہاجر کو الاٹ ہو گیا۔ یہاں بھی شروع شروع میں انگریزی فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔ بعد میں اردو پنجابی فلموں کی نمائش بھی ہونے لگی۔ اپنے دوست صدیق ظریف کی فلم ”پاٹے خان“ ہم نے اسی سینما ہاؤس میں دیکھی۔ اس سینما ہاؤس کے سامنے ابن انشا کا گھر تھا۔ یہاں ہمارا اکثر آنا جانا رہتا تھا۔ چنانچہ فلمیں دیکھنے کا پروگرام اوڈین یا نشاط سینما میں ہی بنتا تھا۔ ۵۱-۱۹۵۰ء کے لگ بھگ مجھے ایک فلم لکھنے کا کام مل گیا جس کا دفتر کیپٹل سینما میں تھا۔ یہ فلم ”سوسائٹی“ تھی جس میں سدھیر اور مسرت نذیر نے اہم رول کیے تھے۔ اب میرا زیادہ وقت کیپٹل سینما والے دفتر میں ہی گزرتا۔ یہاں دوسرے فلم سازوں اور تقسیم کاروں کے دفاتر بھی تھے۔ یہاں رشید صاحب کا دفتر بھی تھا۔ ایک روز میں کیپٹل سینما کے مالک کے تہہ خانے والے دفتر میں منیجر ہدایت صاحب کے پاس بیٹھا تھا کہ رشید صاحب پریشان تہہ خانے کی سیڑھیاں اتر کر اندر آئے اور میری طرف متوجہ ہو کر کہا:

”بڑا غضب ہو گیا ہے۔ پی آئی اے کا بوئنگ طیارہ قاہرہ کے قریب گر کر تباہ ہو گیا ہے۔ اس میں یقیناً آپ کے کئی صحافی دوست ہوں گے۔“

ہدایت اللہ کیپٹل سینما کے تہہ خانے والے دفتر میں کام کرتے تھے۔ بڑے خوش اخلاق، ہنس مکھ اور دوست نواز شخصیت کے مالک۔ میری ان سے بڑی دوستی ہو گئی تھی۔ ہم دوپہر کو اکثر وہیں بازار سے قلچے چھولے منگوا کر کھاتے۔ چائے کے دور بھی چلتے رہتے۔ میری زندگی کا یہ دور بھی بڑا یادگار دور تھا۔ یہاں بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ ایسی خواتین سے بھی ملنے کا موقع ملا جو میرے دل میں اپنی خوشگوار یادیں چھوڑ گئیں۔ اسی کیپٹل سینما کے پیچھے کچھ رہائشی مکانات تھے۔ یہاں ایک مکان میں ایک ادھیڑ عمر مصری خاتون رہتی تھیں۔ گردن تک کٹے ہوئے گھنگھریالے بال جن میں سفیدی آ گئی تھی۔ ان کی ایک بیٹی پی آئی اے میں ایئر ہوسٹس تھی جو اس زمانے کی سب سے خوبصورت اور مقبول ترین ایئر ہوسٹس تھی۔ پی آئی اے کے قد آدم اشتہاروں پر اس کی تصویر ہوتی تھی۔ میں اس کا نام بھول گیا ہوں۔ واقعی وہ بڑی دلکش شخصیت کی مالک تھی۔ پی آئی اے کا جو پہلا بوئنگ طیارہ قاہرہ کے قریب گر کر تباہ ہوا، یہ خوبصورت ایئر ہوسٹس بھی اسی طیارے میں تھی اور شعلوں کی نذر ہو گئی۔ اس حادثے کے بعد میں نے اس مصری خاتون کو اکثر مکان کی گیلری میں کرسی پر اداس اداس بیٹھے دیکھا۔ پھر پتہ نہیں یہ خاتون کدھر چلی گئی۔ کیپٹل سینما میں

پنجابی اردو ہر قسم کی فلمیں لگتی تھیں۔ یہاں ایک گیٹ کیپر انور ہوتا تھا جو بعد میں پلازا سینما میں چلا گیا۔ اس کا ذکر پلازا سینما کے ذکر کے ساتھ آئے گا۔ (شاید اس مصری نژاد خوب صورت ایئر ہوسٹس کا نام محمودہ گل تھا جو تباہ شدہ بوئنگ طیارے کے شعلوں کی نذر ہوگئی۔)

اس زمانے میں ایسا اتفاق ہوا کہ لاہور کے پلازا سینما میں ہمارے ایک بزرگ دوست منیجر لگ گئے۔ ہمارا کام ہی آوارہ گردی کرنا ہوتا تھا۔ معاشی تفکرات سے میں آزاد تھا۔ میرے ناول اور افسانوں کی کتابیں خوب بک رہی تھیں اور میں لکھتا چلا جا رہا تھا۔ زیادہ تر رات کے وقت لکھتا تھا۔ چنانچہ دن کو اپنے دوستوں کے ساتھ پاکستان ٹی ہاؤس یا کافی ہاؤس میں گپیں لڑاتا یا مال، میکلوڈ پر سیریں کرتا۔ پلازا سینما میں ہمارا دوست منیجر لگا تو ہم شام کو وہیں آ کر ڈیرا لگا لیتے۔ میرا دوست اختر عکسی بھی یہاں بکنگ کلرک لگ گیا۔ یہ نوکری اس نے محض شوق کی خاطر اختیار کی تھی۔ خاصا پڑھا لکھا نوجوان تھا مگر طبیعت میں لاابالی پن تھا۔ سرکاری نوکریوں کی پابندی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ سینما میں اس لیے کام کرنے لگا کہ یہاں بھی اس کے یار دوست تھے اور کام بھی رنگین اور دلچسپ تھا۔ میری اس سے بڑی دوستی تھی۔ چنانچہ ہم اکثر یہاں اکٹھے دیکھے جاتے۔ اس زمانے میں پلازا سینما میں مشہور انڈین فلم ''محل'' لگی۔ اس فلم نے لاہور میں طوفان مچا دیا۔ سپرہٹ ہوئی۔ اختر عکسی کو کان کھجانے کی فرصت نہیں ملتی تھی۔ ایک روز تنگ آ کر مجھے کہنے لگا:

''شیخ جی! یہ آپ کے کمال امروہی نے مجھے کس مصیبت میں پھنسا دیا ہے۔''

اختر عکسی خوش طبعی سے سب کو شیخ جی کے نام سے ہی پکارتا تھا۔ پلازا سینما کے باکس بھی مجھے بہت یاد رہیں گے۔ یہاں میں نے اپنی اکثر دوست لڑکیوں کے ساتھ فلمیں دیکھیں۔ فلم ''محل'' کی ریلیز کے دنوں میں میرا یہ معمول تھا کہ میں دوپہر کے شو سے پہلے ہی پاک ٹی ہاؤس میں آ جاتا۔ اختر عکسی بھی وہاں موجود ہوتا۔ ہم چائے پیتے۔ ہنسی مذاق کی باتیں کرتے۔ پھر وہاں سے پلازا سینما آ جاتے۔ یہاں گیلری کے ٹکٹوں کی کاپیاں لے کر ہم دونوں اپنے دوست منیجر کے کمرے میں بیٹھ جاتے اور ان پر ٹیکس کے ٹکٹ لگانے شروع کر دیتے۔ یہ کام عام طور پر گیٹ کیپر کرتا تھا مگر رش زیادہ ہونے کی وجہ سے ہمیں بھی یہ کام کرنا پڑ گیا تھا۔ اختر عکسی ساتھ ساتھ لطیفے بھی سناتا جاتا اور ہمارے قہقہے کمرے میں گونجتے رہتے۔ پلازا سینما کی کینٹین بڑی صاف ستھری ہوا

کرتی تھی اور یہاں کی چائے بھی بڑی اعلیٰ کوالٹی کی ہوتی تھی۔ میں کئی بار اپنی دوست لڑکیوں کو یہاں چائے پلانے لے آتا تھا۔ پلازا سینما کی بلڈنگ کے اوپر دائیں بائیں جو انگریزی ٹوپ والے مجسمے آج بھی کھڑے ہیں، ان دونوں بتوں کو وائلن بجاتے دکھایا گیا ہے۔ لیکن ایک بت کے ہاتھ میں وائلن کا گز ٹوٹ چکا ہے۔ ایک روز سینما کے الاٹی مالک نے اوپر نگاہ ڈال کر منیجر سے کہا:

"یار اس کے ہاتھ میں وائلن کا گز تو کہیں سے لا کر پکڑا دو۔"

مگر اس بت کا ایک ہاتھ آج بھی گز سے خالی ہے۔ سینما کے جو اصلی مالک تھے وہ چلے گئے۔ جن کو سینما الاٹ ہوا انہیں سوائے پیسے کمانے کے اور کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کسی کو کیا پڑی تھی کہ بت کی مرمت کروانے کے لیے کسی کو ٹھیکہ دیتا پھرتا۔ کیپٹل سینما والا گیٹ کیپر انور بھی پلازا سینما میں آ گیا۔ سانولے رنگ کا سیاہ گھنگھریالے بالوں والا نوجوان تھا۔ سرسوں کے تیل سے بالوں کو ہمیشہ چمکا کر رکھتا۔ وہ سیکنڈ کلاس کے گیٹ پر لگا۔ آدمی صاف گو اور غیر منافق قسم کا تھا۔ پلازا سینما کا تھرڈ کلاس کا گیٹ سینما کی پشت کی طرف واقع ہے۔ تھرڈ کلاس کا گیٹ کیپر چونا منڈی کا ایک ادھیڑ عمر ربابی تھا۔ درمیانہ قد، سر پر نسواری قراقلی کی پرانی ٹوپی۔ پرانا سانسواری کوٹ اور شلوار پہنے ہوتا۔ ہر وقت کسی نہ کسی راگ کی تانیں اڑاتا رہتا تھا۔ ہر کسی کو جھک کر سلام کرتا اور ضرورت سے زیادہ عجز و انکسار سے پیش آتا۔ خالی سینما ہال کی کرسیوں پر ہم بیٹھ جاتے اور میری فرمائش پر وہ مجھے دھیمی آواز میں راگ بسنت بہار گا کر سنایا کرتا۔ میوزک سے مجھے گہری دلچسپی تھی اور اختر عکسی تو باقاعدہ کلاسیکل موسیقی جانتا تھا اور ستار بھی بجایا کرتا تھا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ شام کے شو میں ایکسائز والوں کا چھاپہ پڑ گیا۔ انہوں نے یہ دیکھنے کے لیے چیکنگ شروع کی کہیں لوگوں کو بغیر ٹیکس کے تو نہیں بٹھا دیا گیا۔

اتفاق سے چیکنگ سیکنڈ کلاس کی شروع ہوئی جس کا گیٹ کیپر انور تھا۔ انور بڑے سکون کے ساتھ گیٹ والی کرسی پر بیٹھا سگریٹ پیتا رہا۔ فلم چل رہی تھی۔ ایکسائز کے آدمی اندر سیکنڈ کلاس کے تماشائیوں کی گنتی کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ایکسائز انسپکٹر اپنے آدمیوں کو لے کر ہال سے نکلا اور انور کی طرف دیکھ کر بولا:

"تمہاری کلاس میں پندرہ آدمی فالتو بیٹھے ہوئے ہیں۔"

انور تو ہکا بکا سا ہو کر رہ گیا کہنے لگا:

''نہیں سر! آپ دوبارہ گنتی کریں۔ جتنے ٹکٹ ایشو ہوئے ہیں اتنے ہی آدمی بیٹھے ہیں۔''

ایکسائز انسپکٹر بولا:

''میرے ساتھ آ کر خود گنتی کرلو۔''

انور فوراً ان کے ساتھ ہال میں گھس گیا اور گنتی شروع کر دی۔ ایک بار گنتی کی۔ دو بار گنتی کی۔ واقعی اس کی کلاس میں پندرہ آدمی بغیر ٹکٹ کے بیٹھے تھے۔ اب یہ پتہ چلانا باقی تھا کہ یہ پندرہ آدمی کون ہیں۔ انور حیران پریشان مینیجر کے کمرے میں آ گیا۔ کہنے لگا:

''سر! میں قسم کھاتا ہوں کہ میں نے کسی آدمی سے پیسے لے کر اسے ہال میں نہیں بٹھایا۔ ٹھیک ہے۔ میں کبھی کبھی یہ کام کر لیتا ہوں مگر قسم ہے کہ آج میں نے کسی ایک آدمی کو بغیر ٹکٹ کے نہیں بٹھایا۔''

مینیجر نے پوچھا:

''تو پھر یہ پندرہ آدمی کہاں سے آ گئے؟''

انور سر کھجاتے ہوئے سوچ میں پڑ گیا۔ اچانک جیسے اس کے دماغ میں کوئی خیال آ گیا۔ اس نے مینیجر سے کہا:

''سر! میں ابھی پتہ کر کے آپ کو بتاتا ہوں۔''

میں بھی انور کے ساتھ تھا۔ انور دوبارہ سینما ہال میں گھس گیا۔ اس نے جھک کر لوگوں کے ٹکٹ چیک کرنے شروع کر دیے۔ ایک آدمی کے پاس ٹکٹ نہیں تھا۔ یہ آدمی سینما ہال کی پچھلی دیوار کی طرف بیٹھا تھا جہاں سے آگے تھرڈ کلاس کی کرسیاں شروع ہو جاتی تھیں۔ انور اس آدمی کو باہر لے آیا اور اس سے پوچھا کہ اسے کس نے سینما ہال میں بٹھایا ہے۔ اس شخص نے صاف کہہ دیا کہ تھرڈ کلاس کے گیٹ کیپر نے سو روپے لے کر اسے وہاں بٹھایا تھا۔ انور نے تلخی سے کہا:

''سر! یہ ربانی ہمیں بھی بدنام کرتا ہے۔ پیسے لے کر آدمی میری کلاس میں گھسیڑ دیتا ہے۔ میں ابھی اسے آپ کے سامنے لاتا ہوں۔''

انور نے مجھے ساتھ لیا اور ہم سینما کی پچھلی طرف چلے آئے جہاں کھانے پینے کے کھوکھے

تھے۔فلم شروع تھی۔تھرڈ کلاس والا کلاسیکی راگوں کا رسیا گیٹ کیپر گیٹ پر نہیں تھا۔ پتہ چلا کہ وہ دوسری طرف گیا ہے۔ ہم پیچھے آئے تو دیکھا کہ وہ اسٹول پر بیٹھا چائے کا کوپ ہاتھ میں لیے پلیٹ میں چائے ڈال کر مزے سے پی رہا تھا۔انور کو دیکھتے ہی رنگ اڑ گیا۔مگر فوراً ہی اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور مسکرا کر بولا:

''انور میاں! آؤ بیٹھو۔تم بھی چائے پی لو۔''

انور کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ربابی اندر ہی اندر ڈر گیا۔سمجھ گیا کہ اصل معاملہ کیا ہے۔

انور نے جاتے ہی اسے گردن سے پکڑلیا اور پوچھا:

''پندرہ آدمی میری کلاس میں کیوں ڈالے تھے؟''

ربابی گیٹ کیپر تو صاف مکر گیا۔کانوں پر ہاتھ لگا کر بولا:

''قسم ہے اس ذات کی۔میں ایسا کر سکتا ہوں کبھی انور؟تم نے ایسا کس طرح سوچ لیا؟ کیا میں تمہارا دشمن ہوں انور؟''

انور نے گردن پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے دو تین زوردار جھٹکے دیے تو اڈھیر عمر گیٹ کیپر نے ہاتھ جوڑ دیے۔بولا:

''یار غلطی ہوگئی انور بھا۔غلطی ہو گئی۔معاف کر دو۔آدھے—چلو تم پورے پیسے لے لو۔''

انور اسے گردن سے پکڑ کر منیجر کے کمرے میں لے آیا۔

''سر!اس نے پندرہ آدمی میری کلاس میں پیسے لے کر ڈالے تھے۔پوچھ لیں اس سے۔''

تھرڈ کلاس کے گیٹ کیپر نے منیجر کے سامنے بھی اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا اور سب کے سامنے معافی مانگ کر وعدہ کیا کہ وہ آئندہ کبھی ایسی حرکت نہیں کرے گا۔منیجر نے اسے معاف کر دیا اور نوکری سے جواب نہ دیا۔مگر انور نے اسے خبردار کر دیا کہ اگر پھر کوئی آدمی میری کلاس میں بھیجا تو اس کی خیر نہیں۔گیٹ کیپر نے انور کے ہاتھ چوم کر کہا:

''انور جی!میرا دماغ خراب ہوگیا ہے جو میں ایسا کرنے لگا؟میں نے تو ان سے پیسے لے کر اپنی تھرڈ کلاس میں بٹھایا تھا۔وہ تو کوئی کوڑھ آدمی

تھے۔ٹپ کر تمہاری کلاس میں چلے گئے۔''

انور نے ڈانٹتے ہوئے کہا:

''بس بس اب زیادہ جھوٹ نہ بولو۔''

اور موسیقار گیٹ کیپر کسی کلاسیکل راگ کی تانیں اڑاتا اپنے گیٹ کی طرف چل دیا۔

پلازا سینما میں ہی ایک نیا نیا گیٹ کیپر آکر ملازم ہوا۔بال بچے دار آدمی تھا۔دن میں کسی سرکاری دفتر میں کام کرتا اور شام کو سینما کی گیٹ کیپری کرنے آجاتا۔دبلا پتلا بڑا چاق و چوبند آدمی تھا۔ہر وقت حرکت میں رہتا تھا۔کچھ نہ کچھ کرتا رہتا۔گیٹ کے دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوتا تو انگلیوں سے کیواڑ بجاتا رہتا۔کبھی کرسی پر ٹک کر نہیں بیٹھتا تھا۔ایک بار سینما ہال میں کوئی انگریزی فلم لگی تھی۔دوسرا شو شروع ہو گیا تھا۔میں اور اختر عکسی بھی وہیں بیٹھے تھے۔نیا گیٹ کیپر بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ہمارے ساتھ اس کی بے تکلفی تھی۔میں نے پوچھا:

''کیا بات ہے بھیا کچھ زیادہ ہی بے چین نظر آرہے ہو؟''

وہ بڑی رازداری سے گردن میرے کاندھے کے قریب لا کر بولا ''دو ٹکٹ بچ گئے،کوئی بندہ نظر نہیں آرہا۔''

وہ یہ کرتا تھا کہ ہر شو میں چھ سات آدمیوں کو بغیر ٹکٹ کے بٹھا دیتا۔یعنی ان کے ٹکٹ گیٹ پر لے کر اپنے پاس ہی رکھ لیتا۔انہیں ٹکٹ کا آدھا حصہ کاٹ کر نہ دیتا اور کہتا:

''آپ بیٹھ جائیں کوئی بات نہیں۔''

اس کے بعد وہ یہ ٹکٹ دوسرے تماشائیوں کو دے کر ان سے پیسے وصول کر لیتا۔اس شو میں بھی اس نے دو آدمیوں کو ایسے ہی ہال میں بٹھا دیا تھا مگر اب اسے کوئی ایسا تماشائی نظر نہیں آرہا تھا جو فلم دیکھنے وہاں آگیا ہو۔ٹکٹ والی کھڑکی بھی خالی پڑی تھی۔اس کی بے چینی حق بجانب تھی۔پھر اچانک میری طرف متوجہ ہو کر بولا:

''آپ ایک منٹ کے لیے گیٹ پر کھڑے ہوں۔میں ابھی کہیں سے دو بندے پکڑ کر لاتا ہوں۔''

میں سیکنڈ کلاس کے گیٹ پر کھڑا ہو گیا۔گیٹ کیپر لابی کی سیڑھیاں اتر کر تیز تیز قدموں سے چلتا سڑک کی طرف نکل گیا۔پانچ منٹ بعد واپس آیا تو اس کے ساتھ دو دیہاتی قسم کے آدمی تھے۔

انہیں سینما ہال میں بٹھایا اور میرا شکریہ ادا کرنے لگا۔ میں نے پوچھا:

''کیا یہ آدمی فلم دیکھنے آ رہے تھے؟''

چاق وچوبند گیٹ کیپر بولا:

''نہیں بالکل نہیں۔ یہ تو گوجرانوالے واپس جا رہے تھے۔ میں نے فلم کی ایسی تعریف کی کہ راضی ہو گئے۔ میں نے ٹکٹ نکال کر دونوں کو دیے اور پیسے وصول کر لیے۔''

پلازا اور ریگل سینما کسی زمانے میں تھیٹر ہال ہوا کرتے تھے۔ ان کی کرسیوں پر مخمل چڑھا ہوا تھا۔ فیملی باکس کے آگے بھی مخمل کے پردے لٹکتے تھے۔ جس پہلے شخص کو یہ سینما الاٹ ہوا اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ باکس اور گیلری میں مخمل کے جو پردے لٹکتے تھے وہ اتار کر گھر لے گیا۔ کرسیوں پر جو مخمل چڑھا تھا وہ لوگ اتار کر لے گئے۔ ہوتا یہ تھا کہ لوگ فلم دیکھنے آ کر بیٹھتے اور جب ہال میں فلم چل رہی ہوتی تو بیٹھے بیٹھے بلیڈ سے کرسی کا مخمل ٹکڑا کاٹ کر چھپا لیتے اور ساتھ ہی لے جاتے۔ آہستہ آہستہ ان دونوں سینما گھروں کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ آج ان سینما گھروں کی حالت دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ یہ وہی سینما گھر ہیں جن کی نشستوں پر مخمل چڑھی تھی اور دیواروں پر اطالوی قیدی مصوروں نے رنگدار لینڈ اسکیپ پینٹ کیے ہوئے تھے۔

اب میں لاہور میں چلنے والے تھیٹروں کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ مال روڈ پر آرٹ کونسل کی بلڈنگ ہوا کرتی تھی۔ بڑا کشادہ گول باغ تھا جس کے کنارے کنارے چیڑھ کے درخت کھڑے تھے۔ ایک گیٹ اندر جانے کا اور ایک گیٹ باہر نکلنے کا تھا۔ داخلے کے گیٹ کے پہلو میں لاہور کے بعض مصوروں نے ایک کاٹج بنائی ہوئی تھی جسے ''ہٹ'' کہا جاتا تھا۔ یہاں مصور تصویریں بھی بناتے تھے، سنگ تراشی بھی کرتے تھے اور اپنی تصویروں کی نمائش بھی کرتے تھے۔ آرٹ کونسل کا چھوٹا سا ہال تھا جس کے اندر ڈرامے اسٹیج کیے جاتے۔ اس زمانے میں اسٹیج ڈراموں کا ایک معیار ہوتا تھا۔ آج کی طرح محض جگ بازی نہیں ہوتی تھی۔ لوگ بڑے شوق سے فیملی کے ساتھ تھیٹر دیکھنے آیا کرتے تھے۔ یہاں صرف پیسے کمانے کے لیے نہیں بلکہ آرٹ کی ترقی اور ڈرامے کے فن کی نشوونما کے لیے ڈرامے اسٹیج ہوتے تھے۔

دنیا کے مشہور ڈرامے ترجمہ بھی کیے جاتے۔ ہال میں زیادہ آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش

تھی۔لوگ کئی کئی دن پہلے سے بکنگ کروا لیتے تھے۔ٹکٹ معمولی ہوتا تھا۔ہال کے پیچھے ایک بوسیدہ سیل زدہ کمرے میں ڈریسنگ روم تھا جس کے غسلخانے کی ٹونٹی میں سے ہمیشہ پانی ٹپکتا رہتا تھا۔ پھر اس عمارت کو گرا کر اس کی جگہ وہ جدید عمارت تعمیر کر دی گئی جو آج بھی موجود ہے۔اب آرٹ کونسل کی عمارت تو انتہائی ماڈرن سہولیات سے آراستہ ہے مگر تھیٹر کے ڈراموں کا معیار پست ہو گیا ہے۔ڈراموں میں صرف جگت بازی ہوتی ہے اور لوگوں کو کسی نہ کسی طریقے سے ہنسانے کی کوشش کی جاتی ہے۔یوں مکالموں میں فحاشی کا عنصر بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ایک آنہ تھیٹر کے ڈرامے اور ان میں کام کرنے والے ان جدید آرٹ کونسلوں میں کھیلے جانے والے ڈراموں سے زیادہ بامقصد اور سنجیدہ ہوا کرتے تھے۔ان میں اگرچہ مکالمے بے ربط اور فضول بھی ہوتے تھے لیکن ان میں اصلاح کا پہلو ضرور ہوتا تھا اور معمولی سہولیات اور نامکمل اسباب کے ساتھ کام کرنے والے اداکار اور ڈائریکٹر اپنے فن کے ساتھ زیادہ سنجیدہ اور بامقصد ہوتے تھے۔

لاہور میں آنہ تھیٹر زیادہ تر داتا صاحب کے عرس پر بھاٹی دروازے کے باہر آ کر لگا کرتے تھے۔عرس کے دنوں میں میلہ لگتا۔مختلف تھیٹر یہاں آتے اور اپنے اپنے خیمے لگا کر ڈرامے کرتے۔ یہ لوگ عام طور پر چاروں طرف قناتیں لگا دیتے۔اندر زمین کو کھود کر آگے کی طرف ڈھلائی بنا کر لوگوں کے بیٹھنے کے لیے دریاں بچھا دیتے۔سامنے تختوں کا اسٹیج زمین سے اونچا ہو جاتا۔یہاں عام طور پر لیلیٰ مجنوں، ہیر رانجھا، سسی پنوں اور سوہنی مہینوال کی عشقیہ لوک داستانوں کے ڈرامے کیے جاتے۔مکالموں کا انداز آغا حشر کے زمانے کا ہوتا۔مگر جگہ جگہ اداکار پنجابی میں اپنی طرف سے بھی مکالمے بول جاتے تھے۔ان تھیٹروں میں کبھی کبھی آغا حشر کے زمانے کے بعض کہنہ مشق اور تجربہ کار اسٹیج اداکار بھی نکل آتے تھے اور ان کی مکالموں کی ادائیگی سے لوگ بے حد لطف اندوز ہوتے۔بعض ایسے تھیٹر بھی آتے کہ جہاں عورتیں بھی کام کرتیں۔اکثر تھیٹروں میں لڑکے لڑکیوں کا پارٹ ادا کرتے۔اس زمانے کی فلموں کی ہیروئنوں کا لباس زیب تن کیا جاتا۔اسی زمانے کے ڈانس ہوتے۔ایسے تھیٹر بھی ہوتے تھے کہ جہاں آغا حشر کے ڈراموں کو اسٹیج کیا جاتا۔وہ بات پیدا ہونے کا سوال ہی نہیں تھا کہ جو آغا حشر کے زمانے میں تھیٹروں میں ہوتی تھی، لیکن پھر بھی یہ لوگ نامساعد حالات اور کم تر کاسٹ میں بھی پورے جذبے اور شوق سے کام لیتے اور لوگوں سے داد وصول کرتے۔ایسے تھیٹر بھی ہوتے تھے کہ جہاں صرف لوگوں کو ہنسایا جاتا تھا۔ہمارا اس میلے میں

تقریباً روز ہی پھیرا لگتا تھا۔ تھیٹروں کے تمبو قناتیں لگی ہوتیں۔ ریکارڈنگ بڑے زور شور سے ہو رہی ہوتی۔ تھیٹر کے باہر مچان پر ایک مسخرہ رنگ برنگ لباس پہنے اچھل کود کر رہا ہوتا۔ نیچے ایک آدمی ٹین کی صندوقچی لیے بیٹھا ٹکٹ دے رہا ہوتا۔ تھیٹر کے دروازے پر پردہ گرا ہوتا۔ اندر سے عورتوں کے کورس گانے کی آوازیں آ رہی ہوتیں۔ جب کافی لوگ باہر جمع ہو جاتے تو ایک آدمی پردے کو تھوڑی دیر کے لیے ہٹا دیتا۔ اندر گیس کی روشنیوں میں پاؤڈر سرخی تھوپی ہوئی عورتیں یا لڑکیوں کے لباس میں لڑکے مٹک مٹک کر ڈانس کرتے نظر آتے۔ جب لوگوں کا اشتیاق بڑھتا تو پردہ کھینچ دیا جاتا۔ لوگ دھڑا دھڑ ایک ایک آنے کا ٹکٹ لے کر اندر جانا شروع کر دیتے۔

ایک دفعہ میں نے اور سلیم شاہد نے دو آنے کے ٹکٹ خرید کر یہاں سسی پنوں کا ڈرامہ دیکھا تھا۔ اس کے کچھ منظر آج بھی مجھے یاد ہیں۔ پردہ اٹھتا ہے تو سامنے کرسی پر بادشاہ بیٹھا ہے۔ اس نے گتے کے سنہری ورق چڑھا تاج پہن رکھا ہے۔ لنڈے کی پتلون اور پاؤں میں ربڑ کا جوتا پہنا ہوا ہے۔ ہاتھ میں لکڑی کی تلوار ہے۔ وزیر پاس کھڑا ہوتا ہے۔ وزیر کہتا ہے:

وزیر:۔ بادشاہ سلامت کو مبارک ہو۔ آپ کے گھر لڑکی پیدا ہوئی ہے۔

بادشاہ:۔ بہت خوب۔ فوراً نجومی کو حاضر کرو۔

ایک طرف سے لمبے پھندے والی ٹوپی پہنے ایک نجومی ہاتھ میں پوتھی لیے داخل ہو کر آداب بجا لاتا ہے۔

بادشاہ:۔ شاہی نجومی! ہمیں بتا کہ اس لڑکی کا ستارہ کیا کہتا ہے؟

نجومی:۔ بادشاہ سلامت جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔

بادشاہ:۔ ہاں ہاں۔ بیان کر۔ سب ز دو زیاں بیان کر۔

نجومی:۔ بادشاہ سلامت! یہ لڑکی اپنے خاندان کے واسطے بدنامی کا ٹیکہ بنے گی۔

ہووے گا بھوت اس کے سر پر سوار عشق کا
کرے گی اس طرح یہ گرم بازار عشق کا
دنیا میں لوگ اس کے قصے بناوین گے
پہنے اس طرح یہ گلے میں ہار عشق کا

بادشاہ:۔ (غضب ناک ہو کر) بس بس! ایسی ناگن کو دودھ پلانے سے پہلے پہلے ہی دریا

کی لہروں کے سپرد کر دیا جائے۔ فوراً لکڑی کا صندوق تیار کیا جائے۔ اس میں اس ناگن کو ڈال کر دریا میں بہا دیا جائے۔

وزیر:۔ (سر جھکا کر) حضور کچھ اور سوچا جائے۔

بادشاہ:۔ (تلوار لہرا کر) ہمارا حکم اٹل ہے۔

وزیر:۔ ایسا ہی ہوگا۔

اتنے میں چائے کی دکان کا لڑکا اسٹیج کے آگے سے گزرتا ہے تو بادشاہ سلامت اسے کرسی پر بیٹھے بیٹھے دیکھ لیتا ہے اور ایک طرف منہ کر کے کہتا ہے:

''اوئے فیکے چاء دا کپ لے آ۔''

لڑکا وہیں سے آواز لگاتا ہے:

''بڑے بادشاہ بنے ہوئے ہو چاء نہیں ملے گی۔ استاد جی نے کہا ہے پہلے پرانا حساب صاف کرو۔''

بادشاہ نے اسے گالی دے کر کہا:

''کوئی گل نہیں۔ دیکھ لوں گا تم سب کو۔''

ہال میں بیٹھے ہوئے لوگ قہقہے لگا کر ہنستے ہیں اور پردہ گرتا ہے۔ پھر ایک منظر اسٹیج پر آتا ہے کہ پنوں کو کچھ لوگ چارپائی پر اٹھا کر لیے جا رہے ہیں۔ جب چارپائی اسٹیج کے درمیان آتی ہے تو پنوں اٹھ بیٹھتا ہے اور حیران پریشان ہو کر چاروں طرف دیکھتا ہے۔

پنوں:۔ ہیں میں کتھے تے میری سسی کتھے؟ ایہہ کیہہ گل تے ریت دے تھل؟ ٹھہرو...... چارپائی رکھ دو۔ تم لوگ کون ہو اور مجھے کہاں لیے جا رہے ہو؟

ایک آدمی:۔ شہزادہ پنوں ہمیں تمہارے باپ نے بھیجا ہے۔ ہم تمہیں کیچ مکران کی طرف لیے جا رہے ہیں۔

پنوں:۔ وہ کیوں

دوسرا آدمی: تمہاری جدائی میں بادشاہ سلامت بے چین تے بے قرار ہیں۔

پنوں:۔ (چارپائی سے چھلانگ لگا کر) نہیں نہیں۔ میں سسی کے بغیر کہیں نہیں جاؤں گا۔

تیسرا:۔ آدمی (تلوار نکال کر) شہزادہ پنوں! تمہیں اب سسی کو بھلانا پڑے گا اور ہمارے

ساتھ جانا پڑے گا۔

پنوں:۔(تلوار کھینچ کر) نہیں نہیں۔ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔میں اپنی سسی کو چھوڑ کر تمہارے ساتھ ہرگز نہیں جاؤں گا۔

چوتھا آدمی:۔چلو یار سانوں کیہہ۔اسیں اپنی جان کیوں گوائیے؟ چل کے بادشاہ کو کہہ دیتے ہیں کہ پنوں نہیں آتا۔

چاروں آدمی چارپائی اٹھا کر اسٹیج سے آؤٹ ہوتے ہیں۔وہاں اسٹیج پر ایک قبر بنی ہوئی ہے جس پر سبز غلاف چڑھا ہے۔پنوں لوگوں کی طرف منہ کر کے دونوں بازو کھول کر کہتا ہے:

پنوں:۔یا اللہ! یہ قبر کس کی ہے؟ چند روز پہلاں تو ایتھ کوئی مزار نہیں سی۔

راہ گیر:۔(ایک طرف سے نکل کر) اے نوجوان! ایہہ قبر اک ہجری دیا ہی ہوئی دلہن دی اے جہیڑی ایتھے پنوں پنوں پکار دی مرگئی ہے۔

پنوں:۔(سر پر ہاتھ مار کر) او خدا! میری سسی! میری پیاری سسی مرگئی؟ نہیں۔نہیں۔
ایہہ نہیں ہوسکا۔سسی میرے نال گل کر۔میں پنوں آں۔میں آگیا ہوں۔

عین اس وقت تماشائیوں میں سے ایک آواز بلند ہوتی ہے:

آواز:۔اوے ماماں۔تینوں تینبوں کنے بلایا اے؟

پنوں:۔سنی ان سنی کرتے ہوئے سسی! میں آگیا ہوں۔

وہی آواز:۔اوے ماماں! توں فیر آگیا ایں؟

پنوں:۔(تماشائیوں کی طرف دیکھ کر) بک بک نہ کر اوئے! (سسی کی قبر کی طرف منہ کر کے) پیاری سسی! میں آیا۔میں آیا۔الوداع! اے بے وفا دنیا تینوں پنوں دا آخری سلام!

اس کے ساتھ ہی پنوں دھڑام کر کے قبر پر گرتا ہے۔قبر کھل جاتی ہے اور پنوں قبر سمیت اسٹیج کے نیچے چلا جاتا ہے۔وہی راہ گیر جس نے پنوں کو سسی کی قبر کے بارے میں بتایا تھا لوگوں کی طرف منہ کر کے کہتا ہے:

راہ گیر:۔دیکھو! دیکھو! دنیانوں......

اس کی بات کاٹ کر تماشائیوں میں سے ایک آدمی آواز بلند کرتا ہے:

"اس کو پولیس کے حوالے کرو۔اسی نے پنوں کو مارا ہے۔"

دوسرے آدمی کی آواز بلند ہوتی ہے:

"دسی کو بھی اسی نے مارا ہے۔"

راہ گیر:۔ (لوگوں سے) بھائیو خاموشی سے میرے ڈائیلاگ سنو۔ کھیل خراب نہ کرو۔ (اداکاری کرتے ہوئے) دیکھو! دیکھو! اس دنیانوں ظاہری اکھ نال ویکھن والیو باطنی اکھ نال وی ویکھو۔ او جے عاشق معشوق بہشت وچ جھولا جھول رہے نے تے حوراں گی گاریاں نے۔

اس کے ساتھ ہی اسٹیج کی دونوں طرف سے چھ سات آدمی جنہوں نے زنانہ گھگھرے پہنے ہوئے ہیں چھن چھن کرتے نکلتے ہیں اور کورس گانے لگتے ہیں:

توں داتا توں داتا

سارے جگ دا توں داتا

اس کے ساتھ ہی لکڑی کی گیلی کے ساتھ لپٹا ہوا پردہ دھم سے نیچے آن گرتا ہے اور ایک "حور" اس کے نیچے آتی آتی بچتی ہے۔ ہمارے ریڈیو پاکستان کے ایک عمر رسیدہ سازندے نے مجھے بتایا تھا کہ جن دنوں میوزک ڈائریکٹر غلام حیدر کا چھوٹا بھائی چنی لڑکا سا ہوا کرتا تھا تو وہ بہت خوب صورت تھا اور ایک آنہ تھیٹریکل کمپنیوں میں لڑکی کا پارٹ کیا کرتا تھا۔ ایک بار بھاٹی دروازے کے باہر ایک تھیٹریکل کمپنی نے "لیلیٰ مجنوں" کھیل کا اعلان کیا۔ ڈھول اور گھنٹی والے نے شہر میں گھوم کر اس کی پبلسٹی بھی کی۔ ماسٹر چنی اس کھیل میں لیلیٰ کا پارٹ کر رہا تھا۔ اتفاق سے ان دنوں ماسٹر چنی کے سر میں پھنسیاں نکلی ہوئی تھیں جن کی وجہ سے اس نے اپنے سر کی ٹنڈ کروا رکھی تھی۔ چنانچہ ڈرامے میں وہ لیلیٰ کے پارٹ کے لیے مصنوعی زنانہ بالوں کی وگ لگاتا تھا۔ ڈرامے میں ایک سین آتا تھا کہ لیلیٰ اسٹیج سے کوئی پانچ فٹ اونچی گیلری میں کھڑی ہے۔ نیچے مجنوں اس کی طرف بازو پھیلا کر گانا گا رہا ہے۔ گانے کے بعد لیلیٰ گیلری سے چھلانگ لگاتی ہے۔ مجنوں اسے بازوؤں میں تھام لیتا ہے اور ایک نیا گیت گانا شروع کر دیتا ہے۔ دو تین دن تو یہ سین بڑی کامیابی سے گزر گیا اور لوگوں نے اسے بہت پسند کیا۔ ایک روز ایسا ہوا کہ جونہی لیلیٰ یعنی ماسٹر چنی نے گیلری میں سے نیچے چھلانگ لگائی۔ بدقسمتی سے ماسٹر چنی کی زنانہ وگ کی گت گیلری کے ایک کیل میں پھنس کر وہیں رہ گئی اور منڈے ہوئے سر یعنی ٹنڈ والی لیلیٰ مجنوں کے بازوؤں میں آ گئی۔ اس زمانے میں بھی اداکار کسی مناسب موقع پر اپنی طرف سے مکالمے بول دیا کرتے تھے۔ چنانچہ

مجنوں نے جب ٹنڈو والی لیلیٰ دیکھی تو لوگوں کی طرف دیکھ کر بولا:

"یا اللہ! یہ لیلیٰ ہے کہ حلوہ کدو؟"

جب لاہور میں سینما میں دکھائی جانے والی فلمیں زیادہ مقبول ہونے لگیں تو کچھ تھیٹر کمپنیوں نے سفری سینما بنا لیے۔ اپنے تمبو قناتیں، پرانا پروجیکٹر، ڈیزل سے چلنے والا جنریٹر اور ایک سفید پردہ لے کر وہ لاہور کے آس پاس کسی گاؤں میں چلے جاتے۔ کھیتوں میں کھمبے گاڑ کر تمبو قناتیں لگاتے۔ سامنے چھوٹا سا مٹی کا چبوترہ بنا کر اس کے سامنے سفید پردہ لٹکا دیتے۔ باہر ایک آدمی تخت پوش پر صندوقچی لے کر بیٹھ جاتا۔ وہ ہر کسی سے دو آنے یا چار آنے وصول کر کے اسے اندر داخل کرتا جاتا۔ کچھ لوگوں نے فسٹ کلاس اور سیکنڈ کلاس بھی بنا لی تھی۔ فسٹ کلاس میں چارپائیاں بچھی ہوتی تھیں اور سیکنڈ کلاس میں زمین پر صفیں بچھا دی جاتی تھیں۔

اسی قسم کے ایک سفری سینما میں جانے کا مجھے بھی ایک بار اتفاق ہو گیا۔ میں چار آنے کا ٹکٹ لے کر پنڈال کے فسٹ کلاس میں آیا تو دیکھا کہ چارپائیاں بچھی ہیں۔ ان پر کچھ تماشائی مزے سے لیٹے ہیں۔ کچھ بیٹھ کر باتیں کر رہے ہیں۔ ایک تماشائی اپنے سر کی مالش کروا رہا ہے۔ سیکنڈ کلاس کی صفوں پر لوگ بیٹھے حقے پی رہے تھے۔ میں بھی ایک چارپائی پر بیٹھ گیا۔ سامنے مٹی کے چبوترے کے اوپر بانس کے ڈانڈوں کے ساتھ پردہ سیمیں لٹکایا ہوا تھا۔ گیس روشن تھا۔ فلمی گانوں کی ریکارڈنگ شروع تھی۔ اس کی آواز کافی بلند تھی۔ لوگوں کا اشتیاق بڑھنے لگا۔ بلکہ ان کے صبر کا پیمانہ بھرنے لگا۔ ایک دیہاتی نے آواز لگائی:

"اوئے منڈوا شروع کرو۔ ہمیں کھیتوں میں پانی لگانے بھی جانا ہے۔"

فوراً سفری سینما والوں کا ایک دبلا پتلا آدمی لنڈے کی پتلون پہنے ہاتھ میں گھنٹی پکڑے اسٹیج پر نمودار ہوا۔ وہ اپنی پتلی گردن کو دائیں بائیں طوطے کی طرح ہلاتے ہوئے ٹلی بھی بجاتا چلا جا رہا تھا۔ لوگ اس کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر اس نے گھنٹی یا ٹلی کی لے کو نال کی سم پر لاتے ہوئے تین بار ٹلی کو چھنکایا اور بولا:

"بھائیو! منڈوا ابھی شروع ہو جائے گا۔ ہال کو بھر جانے دو۔"

اس کے ساتھ وہ ٹلی بجاتا جدھر سے آیا تھا ادھر کو چل دیا۔ کچھ دیر تک لوگوں نے اس کے کہنے پر صبر کر لیا، مگر جب زیادہ دیر ہونے لگی تو لوگ ایک بار پھر شور مچانے لگے۔ وہی ٹلی والا آدمی دوبارہ

نمودار ہوا۔ ٹلی کو زور زور سے بجاتے ہوئے اس نے تین بار ٹلی کو سر پر لاتے ہوئے چھنکایا اور بازو کھول کر بولا:

''بھائیو! منڈوا شروع ہونے لگا ہے۔ خبردار ہو جاؤ۔ ہاں منیجر صاحب کا آرڈر ہے کہ ہر آدمی اپنی گھنڈ اپنی جیبوں سے ہوشیار رہے۔ اگر کسی کی جیب کٹ گئی تو سینما والے ذمے دار نہیں ہوں گے۔ یہ لو۔ منڈوا شروع ہو رہا ہے۔ آج کی فلم پیڈرو بہادر کی فلم ہے جو اپنی لیڈی کو بچانے کے لیے پہاڑی پر سے دریا میں چھلانگ لگا دیتا ہے۔ بھائیں! ذرا غور سے دیکھنا کہ وہ کس طرح چھلانگ لگاتا ہے۔''

اس نے گیس کی طرف اشارہ کر کے اپنے آدمی سے کہا:

''شوکت اوئے۔ گیس کو بجھا دے پترا۔''

شوکت نے اسی وقت گیس کو گل کر دیا۔ پنڈال میں اندھیرا ہوتے ہی سامنے لٹکے ہوئے پردے پر پروجیکٹر کی روشنی پڑی۔ ستارے سے ابھرے۔ پھر انگریزی میں کچھ دھندلا دھندلا لکھا ہوا آیا اور اس کے ساتھ ہی گھوڑے دوڑنا شروع ہو گئے۔ ڈاکو ایک انگریز لیڈی کو اٹھا کر بھاگ رہے تھے۔ وہ شور مچا رہی تھی۔ پیچھے پیڈرو بہادر بھی گھوڑا بھگائے چلا آ رہا تھا۔ دونوں طرف سے پستولیں چل رہی تھیں۔ آگے دریا آ گیا۔ ڈاکوؤں میں سے کچھ مر گئے۔ جو باقی بچے انہوں نے لیڈی کو دریا میں پھینکا اور خود پہاڑی کی ڈھلان پر فرار ہو گئے۔ پیڈرو بہادر پہاڑی کی چوٹی پر آ گیا۔

عین اس وقت ٹلی والے آدمی کی آواز بلند ہوئی:

''بھائیو ذرا غور سے دیکھنا۔ پیڈرو بہادر دریا میں چھلانگ لگانے لگا ہے۔ آپ نے ایسی چھلانگ پہلے کبھی نہیں دیکھی ہو گی۔''

پیڈرو بہادر نے پہاڑی کی چوٹی پر پہنچتے ہی دونوں بازو کھول دیے اور پھر دریا میں کود گیا۔ ٹلی والے آدمی نے چلا کر تماشائیوں سے کہا:

''چپ کیوں ہو بھائیو؟ زور زور سے تالیاں بجاؤ، پیڈرو بہادر نے چھلانگ لگا دی ہے۔''

تماشائیوں نے زور زور سے تالیاں بجانی شروع کر دیں۔ پنڈال کے باہر اگلے شو کے ٹکٹ

لینے والے تماشائی بھی جمع تھے۔ پنڈال کے باہر تخت پوش پر بیٹھا ہوا سفری سینما ہاؤس کا آدمی اٹھ کھڑا ہوا اور بولا:

''سنو سنو اندر تالیاں بج رہی ہیں۔ اندر تالیاں کیوں بج رہی ہیں؟ بھائیو! پیڈرو بہادر نے پہاڑ کی چوٹی سے چھلانگ لگا دی ہے۔ اس نے کہاں چھلانگ لگائی ہے؟ یہ آپ کو ٹکٹ خریدنے کے بعد ہی معلوم ہوگا۔''

لوگ بے تابی سے دوسرے شو کا انتظار کرنے لگے۔

میں پنڈال میں چارپائی کے کونے پر بیٹھا پیڈرو بہادر کو اپنی لیڈی کو دریا کی تیز و تند موجوں سے نکالتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اچانک فلم بند ہوگئی۔ اندھیرا چھا گیا۔ لوگ شور مچانے لگے۔ کچھ دبی زبان میں گالیاں بھی دینے لگے۔ وہی ٹلی والا آدمی جلدی سے ٹلی بجاتا اسٹیج پر آیا اور بازو کھول کر بولا:

''بھائیو! گھبراؤ نہیں۔ کچھ نہیں ہوا۔ صرف فلم ٹوٹ گئی ہے آپریٹر اسے جوڑ رہا ہے۔ ابھی فلم دوبارہ شروع ہو جائے گی۔''

وہ واپس چلا گیا۔ دو منٹ بعد فلم دوبارہ شروع ہوگئی۔ پندرہ بیس منٹ بعد فلم پھر ٹوٹ گئی۔ لوگوں نے شور مچایا۔ شوکت نے گیس روشن کر دیا۔ ٹلی والے آدمی نے اسٹیج پر آ کر کہا:

''بھائیو! فلم نہیں ٹوٹی۔ انٹرول ہوا ہے۔ یعنی آدھی چھٹی ہوئی ہے۔''

اور وہ ٹلی بجاتا، ہنستا مسکراتا، گردن طوطے کی طرح ہلاتا اسٹیج کی مچان سے اتر گیا۔ میں بھی دوسرے دیہاتوں کے ساتھ پنڈال سے باہر آ گیا۔ مجھے باتھ روم جانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ وہاں کسی باتھ روم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پھر بھی میں نے شوکت گیس والے سے پوچھ ہی لیا۔ اس نے میری طرف گردن اٹھا کر دیکھا اور ہنہنا کر بولا:

''اوئے۔ شرم نہیں آتی؟ کدھر منہ اٹھائے چلے آ رہے ہو؟''

میں شرمسار ہو کر دوسری طرف چلا گیا۔

اتنے میں پنڈال کے باہر ٹلی والے کی کرخت آواز بلند ہوئی:

''بھراؤ۔ جلدی آ جاؤ۔ فلم دوبارہ شروع ہونے لگی ہے۔''

فلم دوبارہ شروع ہوگئی۔ خدا جانے کہاں کہاں سے مار دھاڑ والی انگریزی فلموں کے ٹوٹے

جوڑ کر ڈیڑھ گھنٹے کی یہ فلم تیار کی گئی تھی۔ کبھی کوئی سین آ جاتا۔ کبھی کوئی منظر سامنے آ جاتا۔ لیکن مار دھاڑ ہر سین میں موجود تھی۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد فلم پھر ٹوٹ گئی۔ لوگوں نے واویلا مچانا شروع کر دیا۔ وہی ٹلی والا آدمی ٹلی بجاتا اسٹیج پر آیا اور بولا:

"بھائیو تے بھراؤں فلم نہیں ٹوٹی۔ فلم ختم ہوگئی ہے۔ اب اپنے اپنے گھروں کو جاؤ اور دوسرے بھراؤں اور دوسرے بھائیوں کو اندر آنے دو۔"

تماشائی چادریں جھاڑتے ایک دوسرے کو مذاق کرتے اٹھے اور پنڈال سے باہر جانے لگے۔

بھاٹی دروازے کے باہر ہی ایک آنہ تھیٹریکل کمپنی میں ایک بار شیریں فرہاد کا کھیل لگا۔ میں بھی یہ کھیل دیکھنے گیا۔ اس ڈرامے کا آخری منظر مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ آخری سین میں ایسا ہوتا ہے کہ فرہاد پہاڑ کاٹ کر اس میں سے نہر نکالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ فرہاد نے بر جس پہن رکھی تھی اور پرانے بینڈ بجانے والوں کی وردی میں ملبوس تھا۔ وہ یونہی مٹی کی ایک ڈھیری پر کدال چلا رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ گا بھی رہا تھا:

ظالم اوکیں شیریں نی
تیرے شہر دے
ہاں ہاں ظالم لوکیں
شیریں نی تیرے شہر دے

اچانک شیریں کی نوکرانی آ کر کہتی ہے:

نوکرانی:۔ فرہاد! تیری شیریں مرگئی۔

فرہاد:۔ مگر تو تو زندہ ہے۔

نوکرانی:۔ لخ لعنت ہے تیرے فریاد تے۔ وے تمہاری معشوقہ شیریں مر گئی ہے۔

فرہاد:۔ (چیخ مار کر) ہائیں۔ میری شیریں مرگئی؟ آہ! اب فرہاد زندہ رہ کر کیا کرے گا؟ سلام! اے فلک کج رفتار میرا آخری سلام!

اتنا کہہ کر فرہاد کدال اپنے سر پر مارتا ہے اور اسٹیج پر گر کر مر جاتا ہے۔ نوکرانی فرہاد کی لاش کو

ہاتھ لگا کر کہتی ہے:

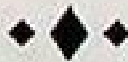
نوکرانی:۔ بے چارہ مر گیا۔ یہ میں نے کیا کر دیا۔ مگر مجھے تو بادشاہ سلامت نے کہا تھا۔

نوکرانی گانا گانے لگتی ہے۔ جس کا مفہوم یہ تھا کہ ان دونوں محبت کرنے والوں کی سچی داستان ہمیشہ زندہ رہے گی۔ اس دوران فرہاد اسٹیج پر اس جگہ مردہ پڑا رہتا ہے جہاں وہ گرا تھا۔ نوکرانی گانا ختم کر کے تماشائیوں کو سلام کرتی ہے اور آؤٹ ہو جاتی ہے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ جس جگہ فرہاد مر کر گرا تھا اور اسٹیج پر جہاں اس کی لاش پڑی تھی وہاں اس کے عین اوپر لکڑی کی وہ گیلی تھی جس کے ساتھ پردہ لگا ہوا تھا اور جسے پردہ گرنے کے ساتھ ہی کھل کر نیچے دھڑام سے گرنا تھا۔ فرہاد کی لاش نے کانی آنکھ سے جب دیکھا کہ مر کر گرنے میں تھوڑا حساب کتاب غلط ہو گیا ہے۔

اس کی لاش لکڑی کی گیلی کے عین نیچے آ گئی ہے اور اگر اس حالت میں پردہ گرا تو گیلی اس کے اوپر آ کر گرے گی اور وہ سچ مچ مر جائے گا تو لوگوں نے ایک بڑا دلچسپ منظر دیکھا۔ پردہ گرنے سے چند سیکنڈ پہلے لوگوں نے محسوس کیا کہ فرہاد کی لاش میں جان پڑ گئی ہے اور اس نے آہستہ آہستہ کھسکنا شروع کیا ہے۔ فرہاد کی لاش کھسک کر جلدی سے پرے ہٹ گئی اور پردہ بلکہ پردے کی گیلی یا شہتیر اسٹیج پر دھڑام سے آن گرا۔

لوگوں نے زور زور سے تالیاں بجاتے ہوئے مطالبہ کیا کہ انہیں فرہاد کی لاش کے زندہ ہو کر کھسکنے کا سین دوبارہ دکھایا جائے۔ کمپنی والے مجبور ہو گئے۔ چنانچہ پردہ ایک بار پھر اٹھا دیا گیا اور فرہاد کدال سر پر مار کر دوبارہ گرا۔ وہ لاش کی طرح بے حس و حرکت ہو گیا اور پھر پردہ گرنے سے دو سیکنڈ پہلے فرہاد کی لاش اسٹیج پر کھسکتی ہوئی پردے کے شہتیر سے دور چلی گئی۔ لوگ دیر تک تالیاں بجاتے رہے۔ یہ سین تو اس کھیل کی جان بن گیا۔ لوگ صرف یہی منظر دیکھنے کے لیے دھڑا دھڑ آنے لگے۔ یہاں تک کہ تھیٹر والوں نے باہر لکھ کر لگا دیا:

''حضرات! آئیے۔ آئیے۔ اپنے دوستوں کو بھی ساتھ لائیے اور فرہاد کی لاش کو قدرت خداوندی سے دوبارہ زندہ ہوتے دیکھیے۔''



لاہور کی ادبی محفلیں ...... قیام پاکستان سے پہلے

قیام پاکستان سے پہلے بھی لاہور ادبی سیاسی اور ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے۔ ادبی اور ثقافتی محاذ پر نیاز مندان لاہور نے تو بڑے معرکے مارے تھے۔ یہ غالباً ۱۹۳۲ء کے اوائل کی باتیں ہیں۔ جب مجھے ان باتوں کا شعور نہیں تھا۔ لیکن بعد میں میں نے ان ادبی اور ثقافتی تحریکوں اور لاہور کی ادبی سرگرمیوں کا ذکر بڑی دلچسپی سے پڑھا اور اسی کے حوالے سے میں قیام پاکستان سے پہلے کے لاہور کے ادیبوں صحافیوں اور شاعروں کی بابت لکھوں گا۔ اس زمانے کی ادبی سرگرمیوں کا ذکر باقاعدہ تفصیل اور قاعدے کے ساتھ ہمیں کہیں بھی نہیں ملتا۔ بس کسی مضمون یا کتاب میں اس دور کی جھلکیاں نظر آجاتی ہیں۔ میں ان جھلکیوں کو اس باب میں جمع کرنے کی کوشش کروں گا۔

یہ وہ لاہور تھا جب یہاں اختر شیرانی کی رومانی نظموں کا چرچہ تھا۔ عرب ہوٹل کی ادبی محفلیں اپنے جوبن پر تھیں اور کافی ہاؤس اور انڈیا ئی ہاؤس ہندو مسلم ادیبوں اور صحافیوں سے بھرا رہتا تھا۔ میں یہ شروع میں ہی بتا دینا چاہتا ہوں کہ قیام پاکستان سے پہلے کے انڈیائی ہاؤس (حال پاک ٹی ہاؤس) اور انڈیا کافی ہاؤس میں کبھی نہیں گیا تھا اور انڈیائی ہاؤس کو کبھی دیکھنے کا اتفاق بھی نہیں ہوا تھا۔ اتنا یاد ہے کہ میں شاید ایک بار انڈیا کافی ہاؤس کے سامنے سے گزرا تھا۔ یہ بھی خواب کی طرح یاد ہے مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو ان ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے ہیں اور جنہوں نے بعد میں ان دونوں کی یادوں کو قلمبند بھی کیا۔ ان میں گوپال متل بھی شامل ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب ''لاہور کا جو ذکر کیا'' قیام پاکستان کے بعد انڈیا میں جا کر لکھی تھی جو لاہور میں بھی چھپی۔ اس کتاب میں انہوں نے لاہور کی قیام پاکستان سے پہلے کی ادبی سرگرمیوں اور ادیبوں، صحافیوں اور شاعروں کے بارے میں کافی کچھ لکھا ہے۔

قیام پاکستان سے پہلے مجھے اتنا یاد ہے کہ نسبت روڈ کے آخر میں چیمبرلین کے قریب ایک گلی میں ملاپ اخبار کا دفتر ہوا کرتا تھا۔ یہ میرے لڑکپن کا زمانہ تھا اور چونکہ میں کتابیں رسالے پڑھا کرتا تھا اس لیے اخباروں رسالوں سے مجھے بڑی دلچسپی ہوتی تھی۔ مجھے یاد نہیں کہ میں کس

کے ساتھ اخبار ''ملاپ'' کے دفتر میں گیا تھا۔ وہاں میں نے کھلتے ہوئے گندمی رنگ کے ایک عمر رسیدہ ہندو کو دیکھا تھا جو کرسی پر بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ اسی نسبت روڈ پر دیال سنگھ کالج لائبریری کے سامنے ایک ساگر ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ اس ہوٹل کے ایک کمرے میں ہفت روزہ ''پارس'' کا چھوٹا سا دفتر ہوتا تھا۔ اس کا ایڈیٹر ایک دبلا پتلا مدبرانہ چہرے والا ایک ہندو ہوتا تھا۔ ہوسکتا ہے اس ہفت روزے کا نام ''ساگر'' ہو۔ اب مجھے ٹھیک سے یاد نہیں رہا۔ یہاں میں اپنے دوست رام پال کے ساتھ کبھی کبھی آتا تھا۔ کیونکہ رسالے کا ایڈیٹر رام پال کا دوست تھا۔ اس ہندو لڑکے کی شکل مجھے پوری طرح یاد ہے۔ وہ بڑے عمدہ قسم کے انگریزی سوٹ میں ملبوس ہوتا۔ شاید اس کا نام یا اس کا تخلص چندن تھا۔ چھوٹی چھوٹی کالی مونچھیں تھیں اور عینک کے شیشوں کے پیچھے آنکھیں شرارتی انداز میں مسکراتی رہتی تھیں۔ رام پال ریلوے ہیڈ کوارٹرز میں ملازم تھا۔ گول مٹول، درمیانہ قد، باہر کو نکلا ہوا پیٹ، پتلون کو ہر وقت اوپر چڑھاتا رہتا تھا۔ سگریٹ مٹھی میں لے کر زور سے کش لگا کر پیتا۔ لاابالی اور بے نیاز سا تھا۔ کھانے پینے اور کپڑوں وغیرہ کی کبھی پروا نہ کرتا تھا۔ جہاں جو مل جاتا کھا لیا کرتا۔ چائے بار بار پیتا تھا۔ اسے صرف پڑھنے کا شوق تھا۔ وہ بھی انگریزی ادب تنقید اور وہ ساری شاعری جو انگریزی میں ترجمہ ہو چکی تھی۔ میری اس کی واقفیت ریلوے کی گراؤنڈ میں ہی ہوئی تھی۔ میں دفتر کے گھٹن پیدا کرنے والے ماحول سے گھبرا کر گھاس پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ رام پال بھی شاید دفتری ماحول سے اکتا کر وہاں آ گیا تھا۔ یوں ہماری دوستی ہو گئی۔ رامپال کی بغل میں موٹی سی انگریزی کی کتاب تھی۔ میں نے پوچھا:

''یہ کونسی کتاب ہے؟''

رامپال نے سگریٹ کا لمبا کش لیا اور کھانستے ہوئے کتاب میری طرف بڑھائی اور بولا:

''روماں رولاں کی ژاں کرستوف ہے۔ فرانسیسی انگریزی میں ترجمہ ہوا ہے اس کا۔ بڑی کمال کی کتاب ہے۔''

اس زمانے میں میں انگریزی اتنی آسانی اور روانی سے نہیں پڑھ سکتا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد میں نے یہ موٹی کتاب شروع سے آخر تک پڑھی اور کئی بار پڑھی۔ روماں رولاں سے بھی متعارف ہوا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بڑی خوشبودار اور دل گداز کتاب تھی۔ اصل میں یہ روماں رولاں کی آپ بیتی ہے۔ یہ کتاب بھی مجھے ایک عجیب اتفاق سے مل گئی تھی اور اس کے لیے

میں اعجاز بٹالوی کا آج بھی شکر گزار ہوں اور اسے آج بھی مجھ سے شکایت ہے کہ میں نے اس کی کتاب اسے واپس نہیں کی۔ میں اس کتاب کی تلاش میں تھا۔ کہیں سے نہیں مل رہی تھی۔ پنجاب پبلک لائبریری میں یہ کتاب موجود تھی اور وہیں میں نے اسے بیٹھ کر جستہ جستہ پڑھا تھا۔ میں نے لائبریری سے اس کتاب کو چرانے کے واسطے بڑے منصوبے بنائے مگر میں اس میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ اتفاق سے ایک روز میں اعجاز بٹالوی کے ٹرنر روڈ والے دفتر میں بیٹھا تھا کہ اس نے دراز میں سے ایک موٹی کتاب نکال کر میری طرف بڑھائی اور کہا:

''یہ کتاب پڑھی ہے تم نے؟''

میں نے کتاب کو دیکھا تو بڑا خوش ہوا۔ یہ وہی کتاب تھی جس کی مجھے ایک مدت سے تلاش تھی۔ یعنی ''یاں کرستوف''۔ میں نے اعجاز سے کہا:

''یہ مجھے پڑھنے کے لیے دے دو۔''

میں نے اسی وقت دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ اعجاز بٹالوی چاہے مجھ پر مقدمہ دائر کر دے میں اب اسے یہ کتاب واپس نہیں کروں گا۔ اس کتاب پر اعجاز بٹالوی کے بڑے بھائی اور نامور افسانہ نویس تحریک پاکستان کے کارکن اور دانش ور عاشق حسین بٹالوی کے دستخط موجود تھے۔ اعجاز بٹالوی بڑا یاروں کا یار ہے اور بڑا پیارا انسان ہے۔ کہنے لگا:

''اے حمید کتاب لے جاؤ مگر پیارے ایک بات ہے۔ پڑھ کر یہ واپس ضرور کر دینا۔ کیونکہ یہ کتاب میرے بڑے بھائی کی میرے پاس امانت ہے۔''

میں نے بڑے اعتماد سے جھوٹ بولتے ہوئے کہا:

''کیوں نہیں، واپس کروں گا۔ پڑھنے کے فوراً بعد تمہاری امانت تمہیں لوٹا دوں گا۔''

وہ کتاب آج بھی، اس وقت بھی میری کتابوں کے شیلف میں پڑی ہے اور میں اسے کبھی کبھی کھول کر جہاں سے دل چاہے پڑھ لیتا ہوں۔ اعجاز بٹالوی نے کئی بار کتاب واپس مانگی۔ میں نے اسے صاف صاف کہہ دیا کہ اعجاز بٹالوی! یہ کتاب میں کبھی واپس نہیں کروں گا۔ چاہے تم کچھ بھی کر لو۔ اب اعجاز نے تقاضا کرنا بھی چھوڑ دیا ہے۔

میں قیام پاکستان سے پہلے ان ادیبوں صحافیوں کی بات کر رہا تھا جن سے مجھے ملنے کا اتفاق

ہوا۔ رامپال بھی ان ادیبوں میں شامل تھا۔ یہ اتنا معروف ادیب نہ تھا مگر اسی نے اس زمانے کے ماہوار ادبی رسالے ''شاہکار'' میں ایک ایسا سلسلہ شروع کر دیا جس نے اسے مشہور کر دیا۔ رامپال کا انگریزی ادب کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ کوئی نہ کوئی انگریزی کی کتاب ہر وقت اس کی بغل میں ہوتی تھی۔ دیوندر ستیارتھی کو بھی میں اسی کے ساتھ ملا۔ لاہور ہوٹل کی عمارت میں ایک پارسی لانڈری ہوا کرتی تھی۔ اس کے پہلو میں انگریزی کتابوں کی ایک دکان تھی۔ یہاں پرانی انگریزی کتابیں سستے داموں فروخت ہوتی تھیں۔ ایک بار میں اور رامپال اس دکان میں پرانی کتابیں دیکھ رہے تھے کہ ایک لمبی ڈاڑھی والا آدمی بھی وہاں آ گیا۔ رامپال نے میرا تعارف کرایا۔ وہ دیوندر ستیارتھی تھا۔ ادب کے طالب علم ہونے کی حیثیت سے میں نے دیوندر ستیارتھی کے افسانے اور سفرنامے کافی پڑھے تھے اور میں اس کا مداح بھی تھا۔ میں نے او ہنری کے افسانوں کی کتاب پسند کی تو دیوندر ستیارتھی نے وہ کتاب دیکھ کر کہا:

''یہ تو میں لوں گا۔''

میں نے وہ کتاب اسے دے دی۔ یہ بات مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ رامپال کے ساتھ میں ایک دو بار سنگم پبلشرز کی دکان پر بھی گیا تھا۔ یہ دکان نسبت روڈ کے شروع میں ساگر ہوٹل کے سامنے اور دیال سنگھ لائبریری کے بالکل ساتھ والی گلی کے نکڑ پر واقع تھی۔ یہاں میں نے پہلی اور آخری بار اردو کے مشہور افسانہ نویس راجندر سنگھ بیدی کو دیکھا تھا۔ شاید اسی دکان کا نام بعد میں جنتا جنتا پبلشرز ہو گیا تھا۔

رامپال ریلوے ہیڈ کوارٹرز کی دوسری منزل میں بیٹھا تھا۔ وہ کلرک تھا۔ اس کے ڈیسک میں بھی انگریزی کی دو ایک ضخیم کتابیں ضرور نظر آ جاتی تھیں۔ وہ اردو کی کتابیں اور رسالے بھی باقاعدہ پڑھتا تھا۔ ایک دن مجھے کہنے لگا:

''اردو کے بڑے نامی گرامی ادیبوں اور شاعروں نے انگریزی کے ادیبوں پر ہاتھ صاف کیا ہے۔ میں ان کا بھانڈا پھوڑ رہا ہوں۔''

چنانچہ اس نے رسالہ ''شاہکار'' میں ایک سلسلہ شروع کر دیا جس کا عنوان اس نے رکھا:

''کہ بکف چراغ دارد۔''

اس کالم میں رام پال نے سب سے پہلے ن م راشد کی شاعری کی کتاب ''ماورا'' کے بارے

میں انکشاف کیا۔ ماورا کا دیباچہ کرشن چندر نے لکھا تھا۔ رامپال نے اس دیباچے میں سے چھ سات ٹکڑے نکال کر رسالے کی ایک طرف لکھے اور اس کے سامنے اس انگریزی کتاب کے وہ ٹکڑے ٹائپ کروا کر لکھوا دیے جس میں سے کرشن چندر نے نقل اور ترجمہ کیے تھے۔ ثبوت سامنے موجود تھا۔ رامپال نے انگریزی کتاب کا نام اور صفحوں کے نمبر بھی دے دیے تھے۔ اس کے بعد اس نے سعادت حسن منٹو کی کتاب منٹو کے افسانے کی طرف رخ کیا۔ اس کتاب کا دیباچہ منٹو نے خود لکھا ہے۔ اصل میں ایک انگریز پادری تھا جس نے کسی زمانے میں افسانوں کی ایک کتاب لکھی تھی۔ اس کا دیباچہ بھی اس انگریز پادری نے خود لکھا تھا۔ وہ دیباچے میں لکھتا ہے کہ ایک روز میں نے خودکشی کا ارادہ کیا اور دریا کے پل پر پہنچ گیا۔ میں پل سے چھلانگ لگانے ہی لگا تھا کہ اچانک سامنے ایک آدمی نمودار ہوا۔ اس نے مجھے روکا اور کہا:

''تم خودکشی کیوں کرنا چاہتے ہو؟''

پادری نے کہا کہ میں دنیا سے تنگ آ گیا ہوں۔ میں بہت زیادہ حساس ہوں اور لوگوں کو مصیبتوں میں مبتلا نہیں دیکھ سکتا۔ اس آدمی نے کہا، تم میرے پاس کیوں نہیں آ جاتے۔ مجھ سے دوستی کرلو۔ تمہارا سارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ پادری نے پوچھا، ''تم کون ہو؟'' اس آدمی نے جواب دیا۔ میں افسانہ ہوں۔ پادری لکھتا ہے کہ میں نے خودکشی کا ارادہ ترک کر دیا اور افسانے لکھنے شروع کر دیے۔

بالکل یہی واقعہ سعادت حسن منٹو نے اپنی کتاب منٹو کے افسانے کے دیباچے میں لکھا تھا۔ رامپال چونکہ ہر قسم کی انگریزی کتابیں پڑھتا رہتا تھا۔ پادری کے افسانوں کی کتاب بھی اس کی نظروں سے گزری۔ چنانچہ اس نے اپنے کالم میں ایک طرف منٹو کے دیباچے کے ٹکڑے اور سامنے پادری کے دیباچے کے انگریزی کے ٹکڑے چھاپ دیے۔ اس کے بعد اس نے شاعروں کی نظموں کی چوری پکڑنا شروع کر دی۔ ایک شور سا مچ گیا اور یہ کالم بند کروا دیا گیا۔

ایک بار رام پال میرے ساتھ امرتسر بھی آیا۔ یہاں ڈاکٹر سیف الدین کچلو کے مکان پر ادبی نشست ہوا کرتی تھی۔ اس کا اہتمام کچلو کا بیٹا محمود کیا کرتا تھا جو ہمارا دوست تھا۔ یہاں رام پال نے اپنی اردو کی نظم ''بدھ کے روبرو'' پڑھی تھی جو بڑی طویل اور بڑی بور نظم تھی۔ رام پال کا مکان سنت نگر میں تھا۔ ایک بار میں اس کے مکان پر گیا تھا۔ اس کے کمرے میں امرتا شیر گل کی

دو تصویریں لگی تھیں۔ امرتا شیرگل کے بارے میں رام پال نے ہی سب سے پہلے مجھے بتایا تھا کہ اس کا باپ سکھ تھا اور ماں فرانسیسی تھی۔ پاکستان بنا تو رام پال انڈیا چلا گیا۔ اس کے بعد ایک بار جالندھر میں یوم اقبال کے ایک مشاعرے میں اس سے ملاقات ہوئی تھی۔

یہ میری اس سے آخری ملاقات تھی۔

قیام پاکستان سے پہلے کے لاہور میں جو ادبی اور صحافتی ماحول تھا اس کے بارے میں گوپال متل اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ ''..............میں لاہور آگیا۔ ان دنوں اخبار پارس کی بہت شہرت تھی۔ حفیظ جالندھری سے مجھے بڑی توقع تھی چنانچہ انہوں نے میری بڑی مدد کی اور اخبار پارس میں مجھے نوکری دلوا دی۔ اس اخبار کی شہرت اس وجہ سے بھی تھی کہ اسے نیاز مندان لاہور کی قلمی معاونت حاصل تھی۔ جس میں محمد دین، پنڈت ہرچند اختر، حفیظ جالندھری، صوفی تبسم اور پطرس بخاری ایسے ادیب اور شاعر شامل تھے۔ لاہور ہی سے ایک اخبار ''بھارت ماتا'' نکلتا تھا جس کے ایڈیٹر نے بعد میں فلمی ہفتہ وار ''چترا'' نکالا اور جسے بہت شہرت ملی......لاہور کے ادبی حلقوں سے میرا ربط ضبط بڑھ رہا تھا۔ احسان دانش نے میرا تعارف مولانا تاجور نجیب آبادی سے کرایا۔ غالباً تیسری یا چوتھی ملاقات میں مولانا نے مجھے مشورہ دیا کہ میں ان کے ادبی جریدے ''شاہکار'' کی ادارت سنبھال لوں۔ یہ پیش کش میں نے شکریے کے ساتھ قبول کر لی۔ ''شاہکار'' میں میری تنخواہ تیس روپے تھی لیکن دفتر میں میرے لیے باقاعدہ حاضری ضروری نہیں تھی۔ میری ذمے داری صرف اتنی تھی کہ پرچہ مرتب کر کے اسے بروقت شائع کر دوں۔ ''شاہکار'' کے بیشتر مضمون نگار ایسے تھے جن پر نظر ثانی کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ خانہ پری کے لیے ہر وقت امام الدین رام نگری کے مضمون موجود رہتے تھے جو آٹھ آنے فی صفحہ کے حساب سے چھپتے تھے۔ ان کے علاوہ آسی رام نگری کے مضامین بھی اسی حساب سے چھپتے تھے۔ ان دونوں حضرات کے بھیجے ہوئے بیشتر مضامین ہندی کے رسالوں سے ترجمہ کیے ہوئے ہوتے تھے۔ ان کے مضامین اکثر فرضی ناموں سے چھپتے تھے۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ مولانا تاجور نے کسی کو نوازنا چاہا تو مضمون اس کے نام سے شائع کر دیا۔ ادارتی نوٹ مختصرات کے عنوان سے مولانا خود تحریر کیا کرتے تھے۔ لیکن مجھے ہدایت تھی کہ اگر بروقت مجھے یہ نہ ملیں تو میں خود ہی لکھ لیا کروں۔

مجھے ملازم رکھتے وقت مولانا نے یہ وعدہ بھی فرمایا تھا کہ تنخواہ کے علاوہ مجھے منافع میں بھی ۲۵

فی صد کا شریک سمجھا جائے گا لیکن جتنے دن میں وہاں رہا رسالے کے مالک کے قول کے مطابق رسالہ خسارے میں ہی رہا۔ تنخواہ کی کمی کے مسئلے کا حل بھی جلد ہی نکل آیا۔ شاہکار کے دفتر کے قریب ہی ایک مکان میں ''جگت لکشمی'' کا سائن بورڈ نظر آیا۔ یہ ایک ہفت روزہ فلمی جریدہ تھا جسے کرن دیوان جو آگے چل کر فلمی ہیرو بنے، نکال رہے تھے۔

کرن دیوان سے ملاقات ہوئی تو پتہ چلا کہ انہیں کسی ایسے آدمی کی ضرورت ہے جو ان کے اخبار کے لیے ایڈیٹوریل وغیرہ لکھ دیا کرے۔ میں نے تیس روپے ماہوار پر یہ ذمے داری قبول کر لی۔

''جگت لکشمی'' باقاعدہ نہیں نکلتا تھا اور کرن دیوان اکثر مالی مشکلات میں مبتلا رہتے تھے۔ مجھے تنخواہ بھی باقاعدگی سے نہیں ملتی تھی۔ اوسطاً بیس روپے ماہوار ہی پڑتے تھے۔ لیکن دفتر کو کرن دیوان نے خوب سجا رکھا تھا۔ میں اپنا زیادہ وقت وہیں گزارتا تھا۔ ''شاہکار'' کا کام بھی وہیں کرتا تھا۔ ملنے والے بھی مجھے اسی دفتر میں آ کر ملتے تھے۔ مولانا تاجور کا سلوک میرے ساتھ انتہائی مشفقانہ تھا۔ انہوں نے قارئین ''شاہکار'' سے میرا تعارف بہت اچھے لفظوں میں کرایا اور میری شاعری کی دل کھول کر تعریف کی۔ صرف یہی نہیں بلکہ ایک بار انہوں نے میرے ایک شعر:

مجھے زندگی کی دعا دینے والے
ہنسی آ رہی ہے تیری سادگی پر

پر ایک اچھا مضمون بھی لکھ دیا۔ میرا یہ شعر زبان زد خاص و عام ہے اور میرا خیال ہے کہ اس کی مقبولیت میں مولانا کی تحریر کو بڑا دخل ہے۔ ادارتی معاملات میں مولانا نے مجھے پوری آزادی دے رکھی تھی۔ میرا نام پرچے پر مدیر معاون کی حیثیت سے چھپتا تھا۔ لیکن مضمون نگاروں کو خطوط میں اپنے ہی نام سے لکھتا تھا اور مضمون پسند یا ناپسند کرنے کا بھی مجھے پورا اختیار تھا۔ ایک دو بار مولانا تاجور نے بڑی کشادہ دلی کا مظاہرہ کیا۔ امام الدین رام نگری نے ایک مضمون میں اردو لکھنے والے ہندوؤں کی اس روش پر اعتراض کیا کہ وہ اپنی تحریروں میں ہندی اور سنسکرت کے لفظوں کا بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں تو انہوں نے کہا کہ درپردہ اردو میں فارسی اور عربی کے الفاظ استعمال کرنے کا حق ہے تو ہندوؤں کو سنسکرت کے الفاظ استعمال کرنے کا حق کیوں نہیں ہے؟ یہ نوٹ شائع ہوا تو امام الدین رام نگری نے مولانا کو کئی احتجاجی خطوط لکھے۔ مولانا نے انہیں یہی

جواب دیا کہ ایڈیٹر گوپال متل ہے یا نہیں۔ آپ نے جو کچھ لکھنا ہے۔ اسی کو لکھیے۔

مولانا تاجور کا دل علاقائی تعصب سے بالکل پاک تھا۔ پنجاب میں اردو کے فروغ میں ان کا بھی بڑا نمایاں حصہ ہے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ مولانا نے اپنے ایک ادارتی نوٹ میں اردو کے پنجابی اہل قلم کے متعلق...... کچھ سخت باتیں لکھ دیں۔ یہ نوٹ مجھے ملا تو میں نے احتجاج کیا کہ جس پرچے کا مدیر معاون پنجابی ہو اس پرچے میں یہ تحریر شائع نہیں ہونی چاہیے۔ مولانا کا فوراً جواب ملا:

> ''آپ پرچے کے ایڈیٹر ہیں اور میں آپ کا مضمون نگار، آپ کو میری تحریر مسترد کرنے کا بھی حق ہے اور اس میں ترمیم کا بھی۔''

جب بھی کوئی اہم ادیب مولانا کو ملنے آتا وہ مجھے بلا لیتے۔ میرے ادبی ذوق کی نشوونما میں مولانا تاجور کا بہت ہاتھ رہا ہے اور میں ہمیشہ ان کا شکر گزار رہوں گا۔ مولانا بڑے دھڑلے کے آدمی تھے اور ظاہر ہے کہ ایسا آدمی دوستوں کے ساتھ دشمن بھی بناتا ہے اور دشمن دوستوں کے مقابلے میں زیادہ بااصول اور سرگرم ہوتے ہیں۔ ان کے سب سے بڑے حریف حفیظ جالندھری تھے اور دونوں میں ہمیشہ چپقلش رہی۔ لاہور کے تقریباً سبھی ادیب اور شاعر ان میں سے کسی ایک کے دوست اور دوسرے کے دشمن تھے۔ میں ان چند ایک لوگوں میں سے تھا جن کے ان دونوں کے ساتھ دوستانہ مراسم تھے۔ یاد پڑتا ہے کہ جب مولانا تاجور نے مجھے شاہکار میں ملازم رکھا تو حفیظ جالندھری نے مجھ سے پوچھا تھا:

''تم وہاں بیٹھ کر میری برائی کرتے ہو گے؟''

جواب میں میں نے کہا تھا:

''کیا کبھی میں نے تمہارے ساتھ تاجور کی برائی کی ہے؟''

میرے اس جواب نے حفیظ کو مطمئن کر دیا تھا۔

''شاہکار'' سے میری وابستگی میرے لیے اس اعتبار سے بڑی اہم تھی کہ اب ادبی دنیا کے ساتھ میرا باقاعدہ تعلق قائم ہو گیا تھا۔ میں نے ایک معمول بنا لیا تھا کہ بے طلب اپنا کلام کہیں نہیں بھیجتا تھا۔ کرشن چندر نے میرا تعارف ''ادب لطیف'' لاہور کے مالکوں چودھری نذیر احمد اور چودھری برکت علی سے کرایا تو ان کی طرف سے کلام کی فرمائش ہوئی۔ میری پہلی نظم ''ادب لطیف''

کے سالنامے میں چھپی۔ ایک غزل کرشن چندر ادبی دنیا کے لیے دے آئے جسے میراجی نے نمایاں طور پر شائع کیا۔ میراجی نے ادارتی نوٹ میں میری غزل کا ذکر بھی کیا۔ ایک غزل راجندر سنگھ بیدی نے مجھ سے لے کر ''ساقی'' کو بھجوادی۔ چودھری نذیر احمد کے ساتھ تو کرشن چندر، کنہیالال کپور اور راجندر سنگھ بیدی کی وجہ سے باقاعدہ ملاقاتیں ہونے لگیں اور شاہکار کے علاوہ ادب لطیف میں بھی میرا کلام چھپنے لگا۔ اس زمانے میں ایسا بھی ہوتا تھا کہ کسی افسانے کو انگریزی یا کسی دوسری زبان سے ترجمہ کر کے اس میں اپنی طرف سے کچھ شامل کر کے افسانہ نگار اسے طبع زاد لکھ کر اپنے نام سے شائع کر دیتے تھے۔ قاضی عبدالغفار اس سلسلے میں خصوصیت سے بدنام تھے۔ باقی افسانہ نگار بھی دوسرے غیر ملکی افسانہ نگاروں کی متاع فکر کو اپنا مال سمجھنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے تھے۔ موپاساں ان کا ہدف خاص تھا۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ کرشن چندر نے موپاساں کے ایک افسانے کی بڑی تعریف کی تھی۔ اس کا پلاٹ اس قسم کا تھا کہ مہاجرین کا ایک قافلہ فرانس کی سرحد پار کرنا چاہتا ہے، مگر سرحد کا فرانسیسی گارڈ قافلے والوں سے سرحد پار کرنے کی قیمت کے طور پر کسی عورت کا نذرانہ طلب کرتا ہے۔ اس قافلے میں ایک طوائف بھی شامل تھی۔ اس طوائف نے باقی ساری عورتوں کی عزت بچاتے ہوئے اپنے آپ کو پیش کر دیا۔ قافلہ سرحد پار کر گیا۔ سرحد پار کرتے ہی ان لوگوں نے اس طوائف کو بے شرم اور بے حیا کہنا شروع کر دیا۔ کرشن چندر کئی روز تک اس افسانے کا ذکر کرتا رہا۔ پھر بات آئی گئی ہوگئی۔ لیکن ایک دن کرشن چندر نے مجھے اپنا تازہ افسانہ سنایا جس کا عنوان غالباً ''پنڈارے'' تھا۔ اس میں اور موپاساں کے افسانے میں نمایاں مشابہت تھی۔

دیوندر ستیارتھی اس سلسلے میں بے قصور ہی مارا گیا۔ اس کی یہ پرانی عادت ہے کہ وہ اپنے دوستوں کی بات چیت میں اپنے افسانے کا پلاٹ ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہے اور افسانے کی تشکیل کے معاملے میں بھی جہاں کہیں سے ممکن ہو فائدہ اٹھانے سے گریز نہیں کرتا۔ دیوندر ستیارتھی کی اس عادت کے پیش نظر، کنہیالال کپور، ہنس راج، رہبر اور پرکاش پنڈت نے اس کے خلاف ایک سازش کی جس نے دیوندر ستیارتھی کو بری طرح رسوا کیا۔

ایک دن صبح صبح ستیارتھی کنہیالال کپور کے گھر پہنچا۔ کپور نے چائے وغیرہ سے اس کی تواضع کی اور چائے نوشی کے دوران اپنی سوچی سمجھی سازش کے تحت برسبیل تذکرہ اسے کہا کہ رات

میرے دماغ میں ایک پلاٹ آیا ہے۔ اگر میں افسانہ نگار ہوتا تو اس کا ضرور افسانہ لکھتا۔ دیوندر ستیارتھی نے فوراً پوچھا کہ پلاٹ کونسا ہے۔ مجھے بتاؤ۔ کنہیالال کپور نے کہا:

''پلاٹ کچھ ایسا ہے کہ ایک کوچوان کا نوجوان لڑکا فوت ہو جاتا ہے۔ کوچوان اس غم کو ہلکا کرنے کے لیے کسی ہمدرد کی تلاش میں ہے جو اسے نہیں ملتا۔ آخر میں وہ اپنے گھوڑے کو اپنے بیٹے کی موت کی خبر سنا کر رونے لگتا ہے۔''

دیوندر ستیارتھی یہ سن کر پھڑک اٹھا اور افسانہ لکھنے پر آمادہ ہو گیا۔ وہاں سے اٹھ کر دیوندر ستیارتھی سیدھا پرکاش پنڈت کے پاس آیا۔ پرکاش پنڈت نے اس کی خوب آؤ بھگت کی اور سرسری طور پر پوچھا کیا کوئی نیا افسانہ لکھ رہے ہو؟ ستیارتھی نے پلاٹ کر ذکر کیا تو سازش کے مطابق پرکاش پنڈت نے کہا:

''بھئی واہ یہ تو کمال کا پلاٹ ہے ستیارتھی تم اس پر کمال کا افسانہ لکھو گے۔''

دیوندر ستیارتھی نے افسانہ لکھ کر مجلس ارباب علم میں سنایا جہاں اس کی بری طرح گت بنی۔ دیوندر ستیارتھی نے افسانہ ختم ہی کیا تھا کہ چاروں طرف سے اس پر چوری کا الزام لگنے لگا۔ کیونکہ حقیقت یہ تھی کہ یہ پلاٹ روسی افسانہ نگار چیخوف کے ایک افسانے کا تھا۔ ستیارتھی نے قدرتی طور پر پرزور احتجاج کیا۔ لیکن اعتراض کرنے والوں نے ثابت کر دیا کہ جس افسانے کو اس نے اپنا کہہ کر سنایا ہے وہ اصل میں چیخوف کی تصنیف ہے۔ ستیارتھی سمجھ گیا کہ اس کے دوستوں نے اس کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ وہ چور نہ سہی مگر چوری کا مال برآمد تو اسی کے گھر سے ہو گیا تھا۔

دیوندر ستیارتھی نے ہم پر باری باری اپنا غصہ اتارا۔ ستیارتھی اور دوسرے افسانہ نگاروں میں چپقلش ہوتی رہتی تھی۔ سعادت حسن منٹو اور اُپندر ناتھ اشک نے ستیارتھی کے خلاف افسانے لکھے۔ دیوندر ستیارتھی نے ان کے خلاف افسانے لکھے۔ ستیارتھی کے خلاف لطیفے گھڑنے میں لاہور کے اس زمانے کے سبھی ادیب بڑی محنت سے کام لیتے تھے۔ ایک بار جب ستیارتھی نے اپنی لمبی ڈاڑھی منڈوا دی تو یہ مشہور کر دیا گیا کہ اس نے ڈاڑھی خود نہیں مونڈی بلکہ اس کی فرادیت سے نالاں کسی شخص نے زبردستی مونڈ ڈالی ہے۔ ایک ادیب نے تو اس پر افسانہ بھی لکھ دیا۔

عرب ہوٹل اس زمانے کے لاہور ادیبوں، شاعروں کا مرکزی مقام تھا۔ وہاں چراغ حسن حسرت میر محفل ہوتے تھے۔ وہاں اختر شیرانی، عبداللہ ملک، عبدالحمید بھٹی، باری علیگ اور

دوسرے کئی ادیب آ کر بیٹھا کرتے تھے۔ اس زمانے میں مادی اعتبار سے کامیاب شاعر حفیظ جالندھری تھے۔ وہ ''شاہنامہ'' لکھ کر معززین کی صف میں شامل ہو گئے تھے اور اپنی کوٹھی بھی بنوالی تھی۔ مگر اپنی اس کامیابی پر انہیں غرور کرتے کبھی نہیں دیکھا۔ دوستوں سے دوستوں ہی کی طرح ملتے تھے اور اکثر ضلع جگت پر بھی اتر آتے تھے۔ شعر وہ بدستور محنت سے کہتے تھے۔ خوش گلو بھی تھے۔ خوش گلو احسان دانش بھی تھے۔ بے حد محنتی تھے اور فقیرانہ وضع رکھتے تھے۔ کافی دنوں تک وہ محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتے رہے اور خود کو مزدور شاعر لکھتے تھے۔ خوش گلوئی کے سوا باقی تمام باتوں میں وہ حفیظ جالندھری کی ضد تھے۔ احسان دانش اگرچہ حفیظ کے کامیاب حریف نہ بن سکے داد و ستائش ان کے کام ضرور آئی۔ انہوں نے زندگی کی ابتدا واقعی مزدوری اور چوکیداری سے کی تھی۔ علم جتنا بھی انہوں نے حاصل کیا اپنی محنت سے حاصل کیا۔ چوکیداری کے زمانے میں کئی کتابیں انہوں نے چاند کی روشنی میں پڑھیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ افلاس نے ان کی فطرت میں کجی پیدا نہیں کی۔ وہ مردم آزار نہیں بنے۔ دوستوں کے دوست تھے اور اپنا حقیقی قد بھی پہچانتے تھے۔ پیسہ بھی انہوں نے محنت ہی سے پیدا کیا۔ کتابیں لکھیں۔ کتب فروشی بھی کی۔ لیکن کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ وہ اپنے ابتدائی افلاس پر نادم نہیں تھے۔ لیکن افلاس کو خوبی بھی نہیں سمجھتے تھے۔ ایک بار ترقی پسندی پر بحث ہو رہی تھی تو انہوں نے بے تکلفی سے کہہ دیا کہ میرے نزدیک ترقی کا مفہوم یہ ہے کہ میں بوریے پر پیدا ہوا تھا۔ قالین پر دم توڑوں گا۔

اختر شیرانی کا اتار شروع ہو چکا تھا۔ وہ اپنے دور کے مقبول ترین شاعر تھے اور لاہور کے ادبی حلقوں کے شہزادے تھے۔ ایک امیر اور انتہائی ذی وقار باپ کے بیٹے تھے۔ ادب اور شاعری ان کے لیے پیشہ نہیں مشغلہ تھے۔ ان کی شاعری کے رومانی ماحول، ان کی مے نوشی اور آوارہ مزاجی نے انہیں دنیائے شعر و ادب کا رومانی شہزادہ بنا دیا تھا۔ رومانی شہزادہ بننا آسان ہے لیکن بنے رہنا اتنا آسان نہیں ہے۔ لوگ رومانی شہزادوں سے ہمہ وقت فوق الفطرت کارناموں کی امید رکھتے ہیں اور کسی گوشت پوست کے انسان کے لیے ممکن نہیں۔ اپنے والد حافظ محمود شیرانی سے ان کا قریب قریب قطع تعلق ہو چکا تھا۔ جو لوگ دوسروں کو پانی کی طرح کھلاتا پلاتا تھا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ فاقہ مست ہو گیا۔ اس وجہ سے لوگ اس سے کترانے لگے۔ لیکن جو لوگ اختر شیرانی پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ شراب کے لیے دوسروں سے پیسے مانگتے تھے وہ غالباً ذاتی تجربے کی

بجائے سنی سنائی باتیں بیان کرتے ہیں۔اختر شیرانی نے شرافت نفس کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا تھا۔روپے پیسے کو ہمیشہ حقارت سے دیکھتے رہے۔کسی کے آگے دست سوال بڑھانا ان کے بس میں ہی نہیں تھا۔میں اپنا ذاتی تجربہ بیان کرتا ہوں۔

ایک بار دوپہر کے وقت میں اپنے گھر میں لیٹا تھا کہ کرشن چندر نے آکر کہا، ''نیچے اختر شیرانی تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔''

میں نیچے آیا تو دیکھا اختر شیرانی تانگے میں بیٹھے ہوئے تھے۔کہنے لگے۔''آؤ چلیں۔'' میں نے کہا، ''اوپر جا کر کپڑے بدل آؤں؟'' کہنے لگے۔''نہیں ایسے ہی چلو'' میں ان کی بات کو کم ہی ٹالتا تھا۔تانگے میں بیٹھ گیا۔جب تانگہ آدھے گھنٹے کے قریب چلتا رہا تو میں نے کہا، ''آخر کہاں جانا ہے۔تانگہ رکواتے کیوں نہیں؟'' اختر شیرانی نے کہا، ''پیسے نہیں ہیں۔'' میں نے کہا، ''اختر صاحب! جب میں نے اوپر جا کر کپڑے بدلنے کی بات کی تھی تو مطلب یہی تھا کہ کچھ پیسے لے لوں۔آپ کے انکار سے میں یہی سمجھا کہ ضرورت نہیں۔'' اس وقت تانگہ انارکلی سے گزر رہا تھا۔وہاں میرے ایک عزیز کی دکان تھی۔میں نے اس سے پندرہ روپے ادھار لیے۔تھوڑے ہی فاصلے پر اخبار ''ملاپ'' کا دفتر تھا۔اچانک اختر کی نظر زبیر پر پڑ گئی۔زبیر انہیں اپنے دفتر میں لے گئے اور جب وہ واپس آئے تو ان کی جیب میں دس روپے کا نوٹ تھا۔لیکن شام تک یہ دس روپے خرچ ہو چکے تھے۔جو بھی ملا اختر شیرانی نے اس کی دعوت کر ڈالی۔

اختر بلانوش تھے، لیکن طبعاً انتہائی شریف انسان تھے۔میں نے ان کی زبان سے کسی خاتون کے بارے میں نازیبا کلمہ کبھی نہیں سنا اور ان کی عشق کی داستانیں بھی اکثر قیاس آرائیاں ہیں۔سلمیٰ عذرا، ریحانہ ایک شاعر کے ذہنی ہیولے تھے۔بہت ممکن ہے کہ ان کا پرتو اختر نے کہیں دیکھ لیا ہو، لیکن یہ ہیولے پوری طرح مادی اعتبار سے متشکل کبھی نہیں ہوئے۔اختر شیرانی کو تصوف کی شاعری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، لیکن محبت کی جسمانیت کے بھی وہ قائل نہیں تھے۔ان کی شاعری سے محبت کا جو پہلو ابھرتا ہے وہ اس کی الوہیت کا ہے جس کا سب سے بڑا ثبوت وہ نظم ہے جو انہوں نے ''ایک شاعرہ کی شادی'' پر لکھی۔اس نظم میں شکایت یہ نہیں ہے کہ وہ اختر کی بجائے کسی اور کی ہوگئی بلکہ انہیں غم اس بات کا ہے کہ شاعری ایسا پاک جذبہ جسمانی محبت میں آلودہ ہوگیا۔میں نے اختر شیرانی کو اچھی بری ہر جگہ دیکھا ہے۔طوائف کے کوٹھے پر بھی میں نے انہیں کبھی

ضرورت سے زیادہ بے تکلف ہوتے کبھی نہیں دیکھا۔ اگر بہت زیادہ پیے ہوتے تو طوائف کا ہاتھ اپنے سینے پر لگا کر رونے لگتے۔ ایسے موقعوں پر یہ مصرع ان کے ورد زبان ہوتا تھا:

کیسے خانہ خراب ہیں ہم لوگ

اختر شیرانی کے بعد بلانوشی اور لاابالی پن کی روایت کے نئے وارث عدم تھے۔ اختر شیرانی کی طرح وہ بھی چلتی پھرتی بوتل تھے۔ طبیعت ان کی انتہائی موزوں تھی۔ بلا کے زود گو تھے اور نہایت عمدہ شعر انتہائی بے تکلفی سے کہہ جاتے تھے۔ شراب سے انہیں بہت تعلق تھا۔ ہر وقت پیتے تھے۔ بے تحاشا پیتے تھے، لیکن شراب ان پر بالعموم کوئی ناگوار اثر نہیں ڈالتی تھی۔ گالی گلوچ کبھی نہیں کرتے تھے۔ بس شعر سناتے اور خوش مزاج ہو جاتے تھے۔ ان کے بہترین اشعار بھی شراب ہی کے موضوع پر ہیں:

چل اے غم دوراں در میخانہ ہے نزدیک
آرام سے بیٹھیں گے، ذرا بات کریں گے

....

ظلمتوں سے نہ ڈر کہ رستے میں
روشنی ہے شراب خانے کی

....

میں مے کدے کی راہ سے ہو کر نکل گیا
ورنہ سفر حیات کا کافی طویل تھا

میں (گوپال متل) شاعروں کے ساتھ بالعموم شراب نہیں پیتا تھا۔ اختر شیرانی کے ساتھ تو ایک دو بار شریک جام ہوا بھی۔ لیکن قریبی دوستی اور انتہائی موانست کے باوجود عدم کے ساتھ مے نوشی میں شرکت میں نے کبھی نہیں کی تھی۔ شراب دیکھتے ہی ان پر ایک وارفتگی سی طاری ہو جاتی تھی اور وہ ہر احتیاط کو بالائے طاق رکھ دیتے تھے۔ میری (گوپال متل) اپنی زندگی جس نہج پر چل رہی تھی اس میں تھوڑا بہت رکھ رکھاؤ ضرور تھا اور کھل کھیلنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ اپنے اور ان کے درمیان ایک محدود سا فاصلہ میں نے ہمیشہ باقی رکھا۔ انہوں نے بھی اس علم کے باوجود کہ میں زاہد خشک نہیں ہوں۔ مجھے اپنے ساتھ شریک مے ہونے کے لیے کبھی مجبور نہیں کیا۔ ایک مرتبہ عدم

شراب کے لیے مضطرب تھے اور حصول کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ میری جیب میں بھی پیسے نہیں تھے۔ لیکن میرے (گوپال متل) گھر پر شراب کی نصف بوتل موجود تھی۔ میں عدم کو یہ کہہ کر اپنے ساتھ لے گیا کہ میرے گھر پر مہمان آئے ہوئے ہیں اس لیے میں شراب لے کر دروازے میں سے باہر نہیں نکل سکتا۔ کھڑکی سے نیچے گرا دوں گا۔ اگر تم کیچ کرنے میں کامیاب ہو گئے تو تمہاری، ورنہ زمین کی، یہ حادثہ پیش آئے تو شور مت مچانا اور چپ چاپ محلے میں سے چلے جانا۔ عدم خلوص کے ساتھ وعدہ کر کے میرے ساتھ ہو گئے۔ لیکن کھڑکی میں سے جیسے ہی میرا ہاتھ باہر نکلتا ہوا نظر آیا۔ وہ بے قابو ہو گئے اور زور سے چلائے:

"متل صاحب۔ ذرا احتیاط سے۔ بوتل ٹوٹ گئی تو میرا دل ٹوٹ جائے گا۔"

ان کی یہ پکار گھر والوں نے سن لی۔ پردہ فاش ہو چکا تھا۔ اب احتیاط غیر ضروری تھی۔ میں نے کہا:

"میں آپ کے لیے بوتل لے کر نیچے آ رہا ہوں۔"

شراب وہ ہر ماحول میں پی لیتے تھے اور صحبت ناجنس بھی ان پر گراں نہیں گزرتی تھی۔ غالباً اپنی داخلی کیفیات میں وہ اتنے مگن رہتے کہ بیرونی دنیا ان کے لیے کوئی حقیقت نہیں رکھتی تھی۔ ایک مرتبہ عدم مجھے ایک مزار کی طرف لے گئے۔ یہاں ایک تنگ و تاریک حجرہ تھا۔ اختر شیرانی پہلے سے وہاں موجود تھے۔ ان کے علاوہ وہاں کچھ عجیب سے آدمی جمع تھے جو شکل و صورت سے فقیر لگتے تھے۔ ایک آدمی ہارمونیم پر گا رہا تھا۔ میں کچھ دیر بعد وہاں سے کھسک آیا۔ بعد میں ان کے ایک دوست نے مجھے بتایا کہ عدم اور اختر شیرانی اس حجرہ تاریک میں اکثر جاتے تھے۔

ان دونوں کے مزاج میں کچھ ایسی سرشاری کی کیفیت تھی کہ جوز ہر کو تریاق بنا دیتی تھی۔ مے کا گھونٹ حلق سے اترتے ہی شاید وہ حجرہ تاریک ان کے لیے روشن ہو جاتا تھا اور چشم تصور میں وہ حافظ و خیام کو غزل خواں دیکھتے تھے۔ اختر شیرانی کے لیے تو بعد میں باہر کی دنیا بالکل ہی بے حقیقت ہو گئی تھی اور ان کے ذہنی ہیولوں نے ان کے لیے ٹھوس مادی شکلیں اختیار کر لی تھیں جن سے وہ خواب میں ہی نہیں عالم بیداری میں بھی ہم کلام رہتے تھے۔ ان دنوں اختر کی رہائش لاہور کی ایک گندی بستی کے شکستہ سے کمرے میں تھی۔ میں کبھی کبھی ان سے ملنے چلا جاتا تھا۔ مجھ سے

پوچھتے:

"کیا تمہیں کوئی آواز نہیں آرہی؟"

پھر کہتے "رات اس نے مجھے پوری غزل لکھوادی۔ وہ بولتی جارہی تھی اور میں لکھتا جاتا تھا۔"

اسے خلل حواس کا نام ہی دیا جاسکتا تھا۔ لیکن یہ خارجی ماحول پر داخلیت کی فتح بھی تو تھی۔

لاہور کے اس زمانے کے (یعنی قیام پاکستان سے پہلے) کے شاعروں اور ادیبوں کی طرح اردو کے صحافی بھی کج کلاہی اور قلندری کو زندگی کی معراج سمجھتے تھے۔ طے شدہ پالیسی کی قید سے تو اس زمانے کے اردو کے تقریباً سبھی اخبار آزاد تھے۔ لیکن ہندو اخبار کاروباری ضابطوں کے پابند ضرور تھے۔ مسلمان اخبار کاروباری ضابطوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔

اخبار زمیندار کے چیف ایڈیٹر مولانا ظفر علی خاں کے زور قلم کے دوست اور دشمن سبھی مداح تھے۔ انہیں نظم اور نثر دونوں پر کامل دست گاہ تھی۔ اور معرکہ آرائیوں میں ادیبوں اور صحافیوں کا متحدہ محاذ بھی ان کے مقابلے میں ناکام رہتا تھا۔ غلام رسول مہر اور عبد المجید سالک نے جب "زمیندار" سے الگ ہو کر اپنا نیا اخبار "انقلاب" نکالا تو ان دونوں اخباروں میں معرکہ آرائی شروع ہوگئی۔ جہاں اخبار "انقلاب" کی طرف سے دونوں تجربہ کار مدیروں کے علاوہ لاہوری ادیبوں کا مشہور طائفہ نیاز مندان لاہور بھی تیر اندازی میں مصروف تھا وہاں "زمیندار" کی طرف سے جوابی کارروائی تنہا مولانا ظفر علی خان ہی کرتے تھے۔ لیکن دیکھنے والے دیکھ رہے تھے کہ اس معرکہ آرائی میں پلڑا اکیلے ظفر علی خان ہی کا بھاری تھا۔ انقلاب کی ساری پتنگوں سے لڑے گا تو یہ صرف تعلّی نہیں تھی۔ مولانا ظفر علی خان کا اکیلا تکل صرف صحافتی حریفوں کی پتنگوں سے ہی نہیں لڑا بلکہ سیاست کے میدان میں بھی اس نے سب کے پاؤں اکھاڑ دیے۔ پنجاب ہی نہیں ہندوستان بھر میں کوئی ایسی سیاسی پارٹی یا شخصیت نہیں تھی جو ان کے وار سے بچی ہو۔ جو لوگ مولانا کی تیغ قلم کے قتیل تھے وہ بھی ان کی داد دیتے تھے۔ مولانا نے گاندھی کو بھی نہیں بخشا اور انہیں ہندو لیڈر ساورکر کی صف میں لا کھڑا کیا:

دنیا میں بلائیں دو ہی تو ہیں ایک ساورکر اک گاندھی ہے
اک ظلم کا چلتا جھکڑ ہے، اک مکر کی چلتی آندھی ہے

سالک کے دوست اور اردو کے مشہور ادیب امتیاز علی تاج ان دنوں ایک فلمی ادارہ قائم

کرنے کی کوشش میں تھے۔ مولانا ظفر علی خان کی طبیعت نے جوش مارا اور فلمی ادارے کی مخالفت میں ایک نظم لکھ ڈالی جس کا ایک شعر یاد رہ گیا ہے:

نئی تہذیب نے انڈے دیے لاہور میں آ کر
اور اس کے نقرئی بچوں کی چوں چوں بن گئی ٹا کی

افسانہ نگار کرشن چندر مجھ پر بہت مہربان تھا۔ وہ خود سلیقے کی زندگی بسر کرتا تھا اور چاہتا تھا کہ میں (گوپال متل) بھی سلیقے کی زندگی بسر کروں۔ اپنے لباس کے بارے میں وہ کافی محتاط تھا اور مراسم قائم کرنے اور انہیں نباہنے کے انداز و آداب بھی اسے آتے تھے۔ مجھ سے اکثر کہا کرتا تھا:

''کامیابی کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ اچھا لباس اور رہنے کی معقول جگہ۔ جہاں دوستوں کی خاطر مدارات کی جا سکے۔''

ان دنوں کرشن چندر کے ہیرو ملک راج آنند تھے جن کی کتابیں یورپ میں چھپ چکی تھیں۔ ایک بار وہ لاہور آئے تو میں، کرشن چندر اور نریندر ناتھ سیٹھ ان سے ملنے سومناتھ چپ کی کوٹھی پر گئے۔

ملاقات کا وقت کرشن چندر نے طے کیا تھا۔ لیکن جب وہاں پہنچے تو کوٹھی پر کوئی بھی نہیں تھا۔ ہم تینوں انتظار کرتے رہے۔ وہ لوگ کافی دیر بعد آئے، اس دوران میں نے اور نریندر ناتھ نے بھی کئی بار کرشن سے کہا کہ ہمیں مزید ذلت برداشت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر کرشن چندر وہیں بیٹھے رہے۔

کنہیا لال کپور، کرشن چندر کا اکثر مذاق اڑایا کرتا تھا کہ یہ کمیونسٹ ہونے کا مدعی ہے مگر جر کریم استعمال کرتا ہے اس پر ''بورژوا'' لکھا ہوگا۔ مزاح نگار کنہیا لال کپور کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ ان دنوں وہ لاہور کے ڈی اے وی کالج میں انگریزی کا پروفیسر تھا اور اپنی تنخواہ کے علاوہ کچھ روپیہ وہ کتابوں کی گائیڈ لکھ کر بھی کما لیتا تھا۔

ترقی پسند ادب کا ان دنوں بڑا شہرہ تھا۔ لیکن اس کا واضح مفہوم بیشتر ادیبوں کے ذہن میں نہیں تھا۔ اوپندر ناتھ اشک کے نزدیک ترقی پسندی کا مطلب یہ تھا کہ وہ کامیاب ترین افسانہ نگار بن جائیں۔ کرشن چندر اور اوپندر ناتھ اشک کی آمد اس بات کا اعلان تھا کہ اب ادب کے میدان میں قلندری کا دور ختم ہوا اور دنیا داری، مطلب پرستی اور مادی ترقی کا دور شروع ہو رہا ہے۔ قلندر

ادیب شاعروں کے برعکس، جولا ابالی تھے اور ادبی کام کو نقصان کا کاروبار سمجھ کر کرتے تھے، یہ دونوں یعنی کرشن چندر اور اوپندر ناتھ اشک حصول کامیابی کے واضح پروگرام کے تحت شروع کرتے تھے اور ہر قدم ناپ تول کر اٹھاتے تھے۔ کرشن چندر اس معاملے میں زیادہ زیرک تھا۔ وہ ہر جریدے کے مالک کی ناز برداری کرتا۔ جب اس کی کوئی تحریر چھپتی تو اپنے دوستوں سے اس کی تعریف میں خط لکھواتا۔ حالانکہ وہ ایک اچھا افسانہ نگار تھا اور اسے ان جیسے بہانوں کی ضرورت نہیں تھی مگر وہ ایسا کرتا تھا۔

حلقہ نیاز مندان لاہور کے اراکین کرشن چندر کی دوستی کا خصوصی ہدف تھے۔ وہ ''ادبی دنیا'' کے ایڈیٹر کے ہاں بھی روزانہ حاضری دیتا تھا۔ ''شاہکار'' میں اس نے مجھے ایک افسانہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ میں اس پر ایک تعریفی نوٹ لکھ دوں اور میں نے اس کا یہ مطالبہ بخوشی پورا کر دیا تھا۔ حالانکہ ان دنوں کرشن چندر افسانے بھی بہت ہی اچھے لکھتے تھے۔ فارمولا افسانے انہوں نے بعد میں لکھنا شروع کیے۔

شاعر میرا جی کا یہ عالم تھا کہ:

نرالی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں
یہ عاشق کون سی بستی کے یارب رہنے والے ہیں

ایک تو میرا جی نے اپنا حلیہ مجنونانہ بنا رکھا تھا۔ اس پر نظمیں وہ ایسی لکھتے تھے کہ جو شاید ہی چند ایک کی سمجھ میں آتی تھیں۔ رسالے کے کسی بھی ایڈیٹر کو اپنی نظم بھیجتے ہوئے وہ خط لکھتے تو اس پر ضرور لکھ دیتے کہ ''یہ خط ہے۔ نظم نہیں ہے۔'' حیرانی کی بات ہے کہ جس شخص کی نظم اتنی پر پیچ ہوتی تھی۔ اس کی نثر اتنی ہی سادہ تھی۔ ''ادبی دنیا'' لاہور میں جس کے وہ مدیر تھے انہوں نے مختلف یورپی ادیبوں اور شاعروں پر جو مضامین لکھے انہیں معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے۔ ان مضامین سے میرا جی کے ذہنی بلوغت اور وسعت معلومات کا بھی پتہ چلتا تھا۔ ان کے گرد اچھا لکھنے والے شاعروں کا ایک باقاعدہ حلقہ پیدا ہو گیا تھا۔ جو نظم میں ان کی تقلید کرتے تھے۔ ان ہی نوجوانوں نے میرا جی کی راہ نمائی میں لاہور میں حلقہ ارباب ذوق کی بنیاد رکھی۔ ان دنوں یہ انجمن ترقی پسند مصنفین کو اپنا حریف نہیں سمجھتی تھی اور ترقی پسند ادیب بھی ان کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔

میں (گوپال متل) میراجی کی شاعری کا مداح تھا۔ ان کی تحریروں کو بڑے شوق سے پڑھتا تھا۔ اور جو لوگ ان کی نظموں کو مہمل بتاتے تھے ان سے بحث بھی کرتا تھا۔ لیکن ذاتی سطح پر میرا ان کے ساتھ تعلق رسمی سی علیک سلیک سے کبھی آگے نہیں بڑھا تھا۔ گریز میری طرف ہی سے تھا۔ ان کی شاعری کا مداح ہونے کے باوجود ان کی حرکات کو برداشت کرنے کی تاب مجھ میں نہیں تھی۔ ان کے متعلق تو لوگوں نے عجیب وغریب قصے مشہور کر رکھے تھے جنہیں سن کر یہ گمان گزرتا تھا کہ وہ فاتر العقل ہی نہیں ایک خطرناک آدمی بھی ہیں۔ ان قصوں کی صحت یا عدم صحت کے بارے میں، میں نے کبھی چھان بین نہیں کی تھی۔ کیونکہ قیاس یہی کہتا تھا کہ جس شخص کی ڈاڑھی اتنی میلی رہتی ہو، جو گرمیوں کے دنوں میں بھی اوورکوٹ پہنتا ہو اور کرسی پر اکڑوں بیٹھا ہو، وہ جو بھی کر گزرے کم ہے۔ یہ بات میری سمجھ نہ اس وقت آئی تھی نہ اب آتی ہے کہ شاعر کے داخلی انتشار کا مظاہرہ اس کے خارجی اطوار میں کیوں ضروری ہے۔

جو نوجوان شاعری میں میراجی کی تقلید کرنے کی کوشش کر رہے تھے یا ان کے مداح خصوصی تھے، وہ بھی ہیئت کذائی کے معاملے میں ان کی پیروی کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ قیوم نظر سرکاری ملازم تھے اور یوسف ظفر میاں بشیر احمد کے ''ہمایوں'' میں نائب مدیر تھے۔ یہ دونوں ہی معقول صورت آدمی تھے۔ اور ان کے طور طریقے بھی عام آدمیوں سے مختلف نہیں تھے۔ میراجی کے ایک شاگرد مبارک احمد سے پاکستان بننے سے چند ہی ماہ قبل ملاقات ہوئی تھی۔ وہ اطوار میں بھی میراجی سے تھوڑی بہت مشابہت رکھتے تھے۔ میں نے ''ادب لطیف'' کی ادارت سنبھالی ہی تھی کہ وہ اپنی نظم لے کر میرے پاس پہنچے۔ میں نے نظم دیکھ کر سرسری سے لہجے میں کہا، ''چھپ جائے گی۔'' لیکن مبارک احمد کے چہرے پر بے یقینی کے آثار تھے جیسے وہ سمجھتے ہوں کہ میں انہیں ٹرخا رہا ہوں۔ میں نے وہ نظم شائع ہی نہیں کی بلکہ شمارے کی ابتدا اسی نظم سے کی۔ نظم دیکھ کر مبارک احمد پھر آئے۔ میں سمجھا شکریہ ادا کرنے آئے ہیں۔ مگر یہ بات نہیں تھی۔ ان کے خیال میں، میں نے ان کی نظم سمجھے بغیر ہی شائع کر دی تھی۔ اگر سمجھ لیتا تو ہرگز شائع نہ کرتا۔ کیونکہ اپنے مفہوم کے لحاظ سے یہ بڑی ہی قابل اعتراض تھی۔ اسی نظم کو لے کر وہ میرے پیش روؤں کے پاس آئے تھے۔ سب نے اسے خطرناک اور ناقابل اشاعت کہہ کر واپس کر دیا تھا۔ ظاہر ہے اگر میں نے اسے شائع کر دیا تھا تو اس میں میری بے سمجھی ہی کو دخل ہو سکتا تھا۔ میں نے کہا:

"اس نظم کو تو میں سمجھ گیا ہوں لیکن غالباً اپنی نظم کا مفہوم پورے طور پر خود آپ بھی نہیں سمجھے اور میرے پیشروؤں نے بھی غالباً اسے مسترداس لیے کیا کہ آپ اس کا مفہوم انہیں قبل از وقت بتا دیتے ہوں گے۔"

میراجی ذہنی الجھنوں میں مبتلا تھے۔ اس کا ثبوت خود ان کی نظموں میں ملتا ہے اور اتنی اچھی شاعری ریاکارانہ نہیں ہو سکتی۔ لیکن اپنی ذہنی کیفیات کا اظہار وہ اپنے ظاہری اطوار میں بھی کرتے تھے تو بہت ممکن ہے کہ اس میں تھوڑا بہت ارادہ بھی شامل ہو۔ دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کرانے کے لیے لوگ کیا کچھ نہیں کرتے۔ یہ ممکن ہے کہ غیر ملکی فنکاروں کا انہوں نے طریقہ اپنایا ہو۔

دوسری عالمی جنگ شروع ہوئی تو لاہور کے ادیبوں اور شاعروں کے لیے روزگار کے دروازے کھل گئے۔ فیض احمد فیض، چراغ حسن حسرت اور دوسرے کئی ادیب فوج میں اعزازی آفیسر کے طور پر لے لیے گئے۔ آل انڈیا ریڈیو میں بھی بہت سے ادیبوں کو ملازمت مل چکی تھی۔ ان میں سعادت حسن منٹو، ن م راشد، کرشن چندر اور راجہ مہدی علی خان نمایاں تھے۔ حفیظ جالندھری ان سب میں پیش پیش تھے۔ اگرچہ باقاعدہ تعلیم کی کمی ان کی راہ میں رکاوٹ تھی مگر اپنی تگ و دو سے انہوں نے اس رکاوٹ کو دور کر دیا۔ انگریزی سرکار نے سانگ پبلسٹی کے نام سے شاعری اور موسیقی کے ذریعے جنگی پبلسٹی کا ایک محکمہ قائم کیا تو اس کے ڈائریکٹر حفیظ جالندھری بنا دیے گئے۔ انہوں نے اپنے نائب کے طور پر پنڈت ہری چند اختر کو رکھ لیا۔ محکمہ مشاعرے بھی کرواتا تھا اور گانے والیوں کے لیے شاعروں سے جنگ کی حمایت میں گیت لکھواتا تھا۔ اس تقرر سے پہلے اکثر و بیشتر شاعر حفیظ جالندھری کے سخت خلاف تھے جن میں ان کے مزاج کی خامی سے کہیں زیادہ ان کی غیر معمولی مالی کامیابی کو بھی دخل تھا۔ لیکن جیسے ہی وہ سانگ پبلسٹی کے ڈائریکٹر بنے، شاعروں کو ان کی ذات اور ان کے کلام میں ہر قسم کی خوبیاں نظر آنے لگیں۔ یہ بات حفیظ جالندھری کے حق میں جاتی ہے کہ انہوں نے کسی شاعر کے خلاف بغض یا عناد سے کام نہیں لیا اور شاعروں اور سانگ پبلسٹی کے ذریعے ان کو جتنا فائدہ پہنچا سکتے تھے پہنچایا۔ مجھ سے (گوپال متل) پہلے ہی کی طرح حفیظ گرمجوشی اور تپاک سے ملتے رہے۔ بلکہ انہیں یہ شکایت بھی تھی کہ اتنے قریبی تعلقات کے باوجود میں ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا رہا۔ ایک دن ترنگ میں آ کر کہنے لگے:

"متل! مجھ سے چوہے تک فائدہ اٹھا رہے ہیں تو کوئی فائدہ نہیں اٹھاتا۔"

میں نے کہا:

"میں چوہا نہیں ہوں۔"

اخبار نویسوں اور صحافیوں کو بھی دوسری جنگ عظیم سے فائدہ پہنچا۔ لوگوں کی جیب میں پیسہ آیا تو اخباروں کی اشاعت بڑھنے لگی اور اس کے ساتھ ہی اخبار نویسوں کی تنخواہیں بڑھ گئیں۔ لاہور کی بساط شعر و ادب کے نوواردوں میں ساحر لدھیانوی بھی تھے۔ میری ان کی ملاقات روزنامہ "نیشنل کانگریس" کی ملازمت کے دوران اتفاقاً ہو گئی تھی۔ لاہور سے مالیر کوٹلہ جاتے ہوئے میں کچھ دیر کے لیے لدھیانہ ٹھہر گیا تھا۔ شام کو کوئی مشاعرہ تھا۔ ان کے ساتھ میں بھی مشاعرے میں چلا گیا۔ ساحر لدھیانوی سے میری ملاقات وہیں ہوئی۔

ساحر مجھے اپنے گھر لے گئے اور بڑی تواضع کی۔ ساحر لدھیانوی کا گھر آزاد منش نوجوانوں کا اچھا خاصہ تکیہ تھا۔ ان میں کوئی آرٹسٹ تھا۔ کوئی لیڈر اور کوئی شاعر ادیب یا صرف شاعری کا پرستار۔ ساحر لدھیانوی کے گھر میں ان سب کی تواضع ہوتی تھی اور جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ مجھے یہ ماحول پسند آیا۔ چنانچہ جب یہ اصرار ہوا کہ میں رات کی بجائے اگلے دن مالیر کوٹلہ جاؤں تو میں ٹھہر گیا۔

ساحر لدھیانوی، گورنمنٹ کالج لدھیانہ میں طالب علم تھے جہاں مخلوط تعلیم تھی۔ کالج کا پرنسپل ایک انگریز تھا جو ہندوستان میں نیا نیا آیا تھا۔ اس لیے یہاں کے ماحول سے زیادہ واقف نہیں تھا۔ چاہتا تھا کہ مخلوط تعلیم صحیح معنوں میں مخلوط ہو۔ لڑکے اور لڑکیاں صرف ہم جماعت ہی نہ ہوں بلکہ آپس میں آزادانہ ایک دوسرے سے ملیں جلیں بھی۔ یہ فیصلہ کافی پیچیدگیوں کا باعث بنا۔ اکثر طالب علم قدامت پسند گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ کئی مشکلات سامنے آنے لگیں۔ حقیقی مخلوط تعلیم کا تجربہ ناکام ہو گیا۔ ساحر لدھیانوی بھی کالج چھوڑ کر لاہور کے دیال سنگھ کالج میں پہنچ گئے۔

کالج میں ساحر اسٹوڈنٹس یونین کا صدر بنا دیا گیا۔ ساحر کی دلچسپیاں تعلیم اور سیاست دونوں سے بس واجبی سی تھیں۔ نہ ان کی تعلیم کا سلسلہ زیادہ دن چلا اور نہ لیڈری کا۔ میرے ساتھ ان کے مراسم برابر قائم رہے۔ تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوا تو ساحر شعر و ادب کی طرف زیادہ متوجہ ہوئے۔ وہ مرنجاں مرنج اور خوش اطوار تھے اور مادی طور پر یہی نہیں کہ ضرورت مند نہیں تھے بلکہ

دوسروں پر تھوڑا بہت خرچ بھی کر سکتے تھے۔ اس لیے انہیں شعر و ادب کی محفلوں میں جلد ہی پذیرائی حاصل ہوگئی۔ ہر دل عزیزی حاصل کرنے کے لیے وہ ایثار بھی کافی کرتے تھے۔ خود بیسہ اخبار اسٹریٹ لاہور کے گھٹیا چائے خانوں میں چائے پیتے اور دوسروں کو مال روڈ کے ریستورانوں میں چائے پلاتے۔ ''ادب لطیف'' کے ایڈیٹروں کو تنخواہ برائے نام ہی ملتی تھی۔ اور ایک طرح سے عہدہ اعزازی ہی تھا۔ لیکن حصول شہرت کا ''ادب لطیف'' چونکہ ایک اچھا ذریعہ تھا۔ اس لیے ایڈیٹر ڈھونڈنے میں مالکوں کو کوئی خاص مشکل پیش نہیں آتی تھی۔ ساحر لدھیانوی کچھ نمایاں ہوئے تو یہ عہدہ انہیں سونپ دیا گیا۔ ساحر لدھیانوی کو جو تنخواہ ملتی تھی اس سے کہیں زیادہ وہ اپنے دوستوں کی تواضع پر صرف کر دیتے تھے۔ اپنی کتاب ''تلخیاں'' کا پہلا ایڈیشن انہوں نے اپنے سارے دوستوں میں تقسیم کر دیا۔

پنڈت ہری چند اختر جو سانگ پبلسٹی کے شعبے میں جالندھری کے نائب تھے۔ بڑے ذہین اور ذی علم آدمی تھے۔ اردو زبان اور اردو ادب کے متعلق ان کی بہت معلومات تھیں۔ میں انہیں اپنا استاد مانتا تھا۔ اپنی ادبی زندگی کے آغاز میں ایک دن میں حفیظ جالندھری اور پنڈت ہری چند اختر کے پاس بیٹھا تھا۔ موضوع گفتگو تھا کہ ادب کو ذریعہ معاش بنانا ہو تو صرف شاعری سے کام نہیں چلتا۔ ضروری ہے کہ نثر نگاری میں بھی کمال حاصل کیا جائے۔ نثر نویسی پر بات چلی تو ہری چند اختر نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا:

''نظم میں وزن کا لحاظ تو ایک ان پڑھ بھی رکھ سکتا ہے لیکن نثر میں وزن پیدا کرنا مشکل ہے۔''

میں نے ان کی اس بات کو گرہ میں باندھ لیا۔ میرا خیال ہے کہ اگر میں بری بھلی نثر لکھ لیتا ہوں تو اس میں ہری چند اختر کی راہنمائی کو بڑا دخل ہے۔ جتنے وہ ذہین تھے اتنے ہی بذلہ سنج بھی تھے۔ لاہور میں اس زمانے کی ادبی محفلوں میں ان کے لطیفے گونجتے رہتے تھے۔ لطیفہ گوئی میں عبدالمجید سالک کے بعد پنڈت جی کا کوئی مد مقابل نہ تھا۔ ایک صاحب پنڈت راج نرائن ارمان ہوتے تھے۔ وہ دلی کے تھے مگر لاہور کو انھوں نے اپنا مستقل وطن بنا لیا تھا۔ زبان دانی پر بہت نازاں تھے اور اس سے بھی زیادہ اس پر کہ وہ داغ کے شاگرد ہیں۔ بات بات پر کہتے تھے انہیں کیا گھمنڈ ہے؟ میں تو داغ کا شاگرد ہوں۔ گھمنڈ کا لفظ ان کی بڑی بڑی مونچھوں میں سے ہو کر گزرتا

تو سننے والوں کو ''گھمنڈا'' سنائی دیتا۔

حلقہ نیاز مندان لاہور سے ان کی ٹھنی تو حسب معمول پنڈت ہری چند اختر کو نیاز مندان لاہور کی طرف سے میدان میں اتارا گیا۔ ''پارس'' میں پنڈت جی نے دوزخی کے نام سے ایک نظم لکھی جس کا عنوان گھمنڈا تھا، جس کا ایک شعر تھا:

تو داغ کا استاد ہو یا داغ کا شاگرد
داغی ہیں مگر سب تیرے اشعار گھمنڈا

حفیظ جالندھری نے جنگ کی حمایت میں سانگ پبلسٹی کے لیے جو گیت لکھوائے ان میں سب سے بہترین گیت حفیظ ہی کا تھا:

یہ اڑوسن پڑوسن چاہے کچھ کہے
میں تو چھورے کو بھرتی کرا آئی رے

سانگ پبلسٹی کا ڈائریکٹر بننے کے بعد حفیظ جالندھری کے گرد مداحوں کا ہجوم جمع ہو گیا تھا۔ ایک دن میں ماڈل ٹاؤن میں ان کی کوٹھی میں بیٹھا تھا۔ انہوں نے اپنا تازہ گیت ''بس درشن درشن میرا'' ترنم سے پڑھنا شروع کیا۔ میں نے حفیظ کو مشاعروں میں بھی سنا ہے اور محدود اور مختصر نشستوں میں بھی۔ لیکن اس دن ان کی آواز میں کچھ اور ہی جادو تھا اور ان کا یہ گیت بھی ان کے بہترین گیتوں میں سے ہے۔ مجھ پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔

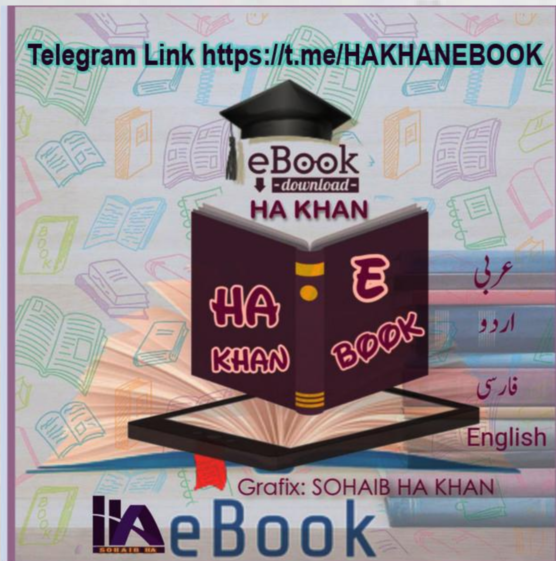
ترقی پسندوں نے دانشور کا لقب اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔ دانشوری کے دعوے سے ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کی انا کی تسکین اس طرح بھی ہوتی تھی کہ ان میں بیشتر کچھ زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تھے اور جدید علوم تک ان کی رسائی یا تو تھی ہی نہیں اور اگر تھی بھی تو برائے نام ہی تھی۔ ان نیم تعلیم یافتہ ادیبوں اور شاعروں کو جب ترقی پسندوں کے ہیڈ کوارٹر کی جانب سے دانشور کا لقب دیا گیا تو ان کی باچھیں کھل گئیں۔

عجیب بات ہے کہ علامہ اقبال نے جنہیں علوم قدیم و جدید پر واقعی عبور حاصل تھا، دانشوری کا دعویٰ کبھی نہیں کیا تھا اور دانشوری کے سب سے بڑی مدعی بنے بھی تو جوش ملیح آبادی کہ جن کی تعلیم بھی واجبی سی تھی۔ جن دنوں جوش ملیح آبادی شالیمار فلم کمپنی میں ملازم تھے ان دنوں عاشق حسین بٹالوی پونا گئے۔ اپنے قیام کے دوران وہ جوش ملیح آبادی سے ملے۔ واپسی پر عاشق حسین

بٹالوی مجھ سے جوش کی ملاقات کا حال بتاتے ہوئے کہتے ہیں:

''جوش صاحب مجھ سے پوچھتے تھے کہ نظریہ اضافیت کی تھیوری کیا ہے؟ میں نے کہا، جوش صاحب آپ اس انتہائی دقیق تھیوری کو معلوم کر کے کیا لیں گے؟ انہوں نے بے تکلفی سے کہا میں اسے نظم کرنا چاہتا ہوں۔''

عرب ہوٹل کے بعد ادیبوں کا دوسرا ٹھکانہ نگینہ بیکری بنا۔ آگے چل کر گوپال متل نے نگینہ بیکری میں بیٹھنے والے ادیبوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ قیام پاکستان کے قریب کے زمانے یعنی ۱۹۴۷ء کا زمانہ تھا۔ یہاں بیٹھنے والوں میں مولانا صلاح الدین احمد، باری علیگ، عبداللہ قریشی، ڈاکٹر سید عبداللہ اور عاشق حسین بٹالوی کے نام سب سے نمایاں تھے۔ نگینہ بیکری میں ان ادیبوں اور نقادوں کا ذکر میں گوپال متل صاحب ہی کے حوالے سے لاہور قدیم کے چائے خانوں اور ریستورانوں کے باب میں تفصیل سے کر چکا ہوں چنانچہ انہیں یہاں دہرانا نہیں چاہتا۔ آپ یہ سب کچھ اسی کتاب کے پچھلے باب میں پڑھ چکے ہیں۔ ان واقعات کو یہاں دوبارہ درج کرنے سے ایک مقصد یہ تھا کہ قیام پاکستان سے پہلے کے لاہور میں رہنے والے ادیبوں اور شاعروں کی باتیں ان کے واقعات اور دوسری باتیں ریکارڈ ہو جائیں اور یکجا ہو کر ایک کتاب میں مدون ہو جائیں۔ اس کے لیے میں گوپال متل صاحب کا ممنون احسان ہوں کہ انہوں نے اپنی کتاب میں ان یادگار محفلوں کا تفصیل سے اور پوری بے باکی سے تذکرہ کیا اور مجھے موقع دیا کہ میں انہیں اپنی کتاب میں ریکارڈ کرا لوں۔ کیوں کہ ان یادگار محفلوں کا ذکر اتنی تفصیل سے مجھے اور کسی تذکرے میں نہیں مل سکا اور میرا خیال ہے کہ کسی نے انہیں قلمبند بھی نہیں کیا۔



لاہور کی لائبریریاں اور کالج

پنجاب پبلک لائبریری

یہ لائبریری پاکستان کی سب سے بڑی لائبریری ہے اور یہاں قابل قدر عالمی سرمایہ جمع ہے۔ جس عمارت میں یہ لائبریری قائم ہے وہ کبھی بارہ دری نواب وزیر خان کہلاتی تھی۔ اس عمارت کی چار برجیاں تھیں اور نہایت خوب صورت اور منقش محرابیں تھیں۔ نواب وزیر خان جنہوں نے یہ عمارت بنوائی عہد شاہجہان کے امرا میں سے تھے۔ پنجاب پبلک لائبریری ۱۸۸۴ء میں قائم ہوئی۔ پہلے اس عمارت میں لائبریری کا قیام عارضی طور پر کیا گیا تھا لیکن پھر ایسا ہوا کہ یہی عمارت لائبریری کے طور پر مستقل ہوگئی۔ ۲۱ دسمبر ۱۸۸۵ء کو اس لائبریری کا پنجاب کے گورنر سر چارلس ایچی سن نے افتتاح کیا۔ جن احباب کے ذاتی کتب خانے تھے ان سے استدعا کی گئی کہ وہ اپنے عطیات لائبریری کو دیں۔ حکومت نے بھی کتابوں کا ایک بیش قیمت ذخیرہ خرید کر لائبریری میں رکھا۔ لاہور میں ایک کتب خانہ فقیر سید جلال الدین کا تھا۔ سید صاحب علم پرور اور صاحب ذوق بزرگ تھے۔ انہوں زرکثیر سے کتابوں کا ذخیرہ اپنے کتب خانے میں جمع کیا تھا۔ مرحوم نے وفات سے پہلے یہ سارا ذخیرہ پنجاب پبلک لائبریری کو عطیے کے طور پر دے دیا۔ اس ذخیرے میں عربی کی مطبوعہ اور نایاب کتب کے علاوہ بہت سے قلمی نسخے بھی تھے۔ اسی سال لکھنؤ کے مشہور کتب فروش منشی نولکشور نے اپنی طرف سے اردو فارسی کی ڈھائی ہزار کتابیں لائبریری کو عطیہ کے طور پر دیں۔ اس وقت یہ لائبریری تین عمارتوں میں پھیلی ہوئی ہے۔

پنجاب پبلک لائبریری میں کتابوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ چکی ہے۔ اس میں ہر سال اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ کتابوں اور رسالوں کی خرید پر ہر سال ہزاروں روپے خرچ کیے جاتے ہیں۔ کتابوں کا انتخاب مینجنگ کمیٹی کے سپرد ہے جو ماہرین کے مشورے سے کتابوں کا انتخاب کرتی ہے۔ تقریباً تمام علوم وفنون سے تعلق رکھنے والی کتابیں خریدی جاتی ہیں، سیاسیات، فلسفہ، ادب،

شاعری، دینیات، معاشیات اور تاریخ پر اس لائبریری میں بعض بیش قیمت اور تاریخی کتابیں موجود ہیں۔ پنجاب پبلک لائبریری سے اس وقت طلبا اور اساتذہ کے علاوہ عوام اور پرائیویٹ ریسرچ اسکالر بھی استفادہ کرتے ہیں۔ اس لائبریری میں سرکاری مطبوعات اور سرکاری رپورٹوں کا بھی بہترین ذخیرہ موجود ہے۔ حکومت پاکستان نے پنجاب پبلک لائبریری کو ان دستاویزات کے ملاحظے کے لیے مرکز مقرر کر رکھا ہے۔ اس لائبریری میں بچوں کے لیے اردو انگریزی کے علیحدہ سیکشن ہیں۔ بچوں کے لیے یہاں سبق آموز کہانیوں کے علاوہ مشاہیر اسلام، اسلامی تاریخ اور سائنس کے متعلق بھی ضروری معلومات کی ابتدائی کتابیں فراہم ہیں۔ خواتین کے لیے لائبریری میں مطالعے کا خاص انتظام ہے۔

پنجاب پبلک لائبریری میں عربی، فارسی اور اردو کے قلمی نسخوں کی تعداد تقریباً دو ہزار کے قریب پہنچ گئی ہے۔ ان کے علاوہ لائبریری میں سنسکرت، ہندی اور گورمکھی کی مطبوعہ کتابوں کے علاوہ قلمی نسخے بھی موجود ہیں۔ سردیوں میں لائبریری تقریباً سارا دن کھلی رہتی ہے۔ گرمیوں میں بھی نو گھنٹے کھلتی ہے۔ لائبریری کے ریڈنگ روم میں پاکستان میں چھپنے والے تقریباً سبھی اخبار آتے ہیں جن کا اصحاب بیٹھ کر مطالعہ کرتے ہیں۔ لائبریری کے ارباب بست و کشاد نے نابینا افراد کے مطالعے کے لیے بریل سسٹم کے مطابق تیار کردہ کتب بھی حاصل کی ہیں۔

دیال سنگھ کالج لائبریری

یہ لائبریری سردار دیال سنگھ مجیٹھیہ کا عطیہ ہے۔ سردار صاحب ایک بے لوث اور فیض رساں انسان تھے۔ انہوں نے اپنی جاگیر خدمت خلق کے لیے وقف کر دی تھی۔ دیال سنگھ ٹرسٹ قائم کیا گیا۔ دیال سنگھ پبلک لائبریری کی بنیاد رکھی گئی۔ اس لائبریری کی ابتدا ۱۹۰۸ء میں ایک ریڈنگ روم سے ہوئی۔ ۱۹۱۲ء میں اس ریڈنگ روم کو لائبریری میں تبدیل کر دیا گیا۔ ۱۹۲۰ء میں اس لائبریری کو بھارت بلڈنگ میں منتقل کیا گیا اور ۱۹۲۸ء میں یہ لائبریری اپنی موجودہ عمارت میں پہنچ گئی۔ قیام پاکستان سے پہلے اس لائبریری میں پچاس ہزار کے قریب تاریخی، علمی، ادبی اور مذہبی موضوعات پر کتابیں موجود تھیں۔ قیام پاکستان کے بعد اس لائبریری کی کتب میں اضافہ ہوتا گیا۔

قیام پاکستان کے وقت غیر مسلم ٹرسٹیوں کے بھارت چلے جانے سے یہ لائبریری کچھ مدت

کے لیے بند ہوگئی تھی۔ بعد میں نئی ٹرسٹ کمیٹی کی تشکیل ہوئی۔ مسٹر جسٹس محمد شریف اس کے صدر مقرر ہوئے۔ اس کا باقاعدہ افتتاح کیا گیا۔ تب سے لے کر آج تک یہ لائبریری باقاعدہ تشنگان علم کی پیاس بجھا رہی ہے۔ علم دوست طبقے میں کتابوں کی مانگ مسلسل بڑھ رہی ہے۔

میونسپل لائبریری شاہ محمد غوث

یہ لائبریری شہر کے وسط میں دہلی دروازے کے باہر واقع ہے۔ اس لائبریری کی عمارت میں کسی زمانے میں مولوی محمد حسین آزاد کی اپنی لائبریری ہوا کرتی تھی اور اخبار ''آبزرور'' بھی یہیں سے نکلتا تھا۔ یہ عمارت پہلے دو منزلہ تھی جو منہدم ہو چکی ہے۔ ایک منزلہ عمارت میں اب میونسپل لائبریری ہے۔ ۱۹۲۶ء میں میونسپل لائبریری کا آغاز ہوا۔ اس لائبریری میں بیس ہزار کے قریب کتابیں ہیں۔ ساٹھ کے قریب اخبارات و جرائد اس لائبریری میں آتے ہیں۔ لاہور کے شہری اس لائبریری سے استفادہ کرتے ہیں۔ اس لائبریری میں لیجر سسٹم رائج ہے۔ مستعار کتابیں رجسٹر اور کارڈ کے ذریعے جاری ہوتی ہیں۔ کتابیں بند الماری میں مضمون وار رکھی گئی ہیں۔ یہ لائبریری صبح شام دونوں وقت کھلتی ہے۔ اس لائبریری کے زیر انصرام تقریباً چالیس لائبریریاں اور دارالمطالعے شہر کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔

لاہور پبلک لائبریری علامہ اقبال روڈ

اس لائبریری اور ریڈنگ روم کا قیام ۱۹۵۰ء میں عمل میں آیا۔ اس لائبریری میں کتابوں کی تعداد دس ہزار کے قریب ہے۔ پچیس عدد رسائل اور اخبارات باقاعدہ یہاں آتے ہیں۔ لاہور کارپوریشن کی طرف سے اسے سالانہ گرانٹ ملتی ہے۔ کچھ چندہ ممبروں سے جمع ہوتا ہے۔ لائبریری میں اردو فارسی کے علاوہ انگریزی کی کتب بھی ہیں۔ ان کا کیٹلاگ کتابی صورت میں ہے۔ اوسطاً ڈیڑھ دو سو اشخاص روزانہ لائبریری میں آتے ہیں۔

جم خانہ کلب لائبریری

اس کا شمار بھی لاہور کی سب سے بڑی اور خوب صورت لائبریریوں میں ہوتا ہے۔ اس

لائبریری کو لاہور کے سب سے خوبصورت باغ باغ جناح کا حسین گردونواح میسر ہے جس کی وجہ سے لائبریری کے حسن میں اضافہ ہو گیا ہے۔ پہلے یہ جگہ جم خانہ کلب تھی۔ مگر اسے حکومت نے لائبریری میں تبدیل کر دیا ہے یہاں مائیکروویو اور فلم سسٹم بھی رائج ہے۔ جس سے قدیم اور نادر کتب کی فلمیں بنا کر انہیں محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ یہاں بوسیدہ کتابوں کی از سرنو تزئین و مرمت کا کام بھی انتہائی جدید آلات کے ذریعے کیا جاتا ہے۔

یہاں اردو فارسی اور انگریزی کتب کی ایک بھاری تعداد موجود ہے۔ بچوں کے لیے بھی علیحدہ شعبہ قائم کیا گیا ہے جہاں ان کے ذوق کے مطابق تاریخی، اسلامی اور سائنسی کتابوں کا انتظام کیا گیا ہے۔

پنجاب یونیورسٹی لائبریری

یہ لائبریری ۱۸۸۲ء میں قائم کی گئی تھی مگر صحیح معنوں میں اس کی تنظیم کا کام ۱۹۱۲ء میں شروع ہوا جب اس کو نئی عمارت میں منتقل کیا گیا۔ اس نئی عمارت کا سنگ بنیاد ۱۹۱۱ء کو رکھا گیا۔ ۱۹۱۲ء میں اس کا افتتاح ہوا۔ عمارت کی تکمیل ۱۹۱۷ء میں ہوئی۔ اس لائبریری کو اسی زمانے میں پریزیڈنسی کالج کلکتہ کے انگریزی کے پروفیسر مسٹر پرسویل نے اپنی چھ ہزار پانچ سو کتابوں کا ذخیرہ بطور عطیہ دیا۔ یہ ذخیرہ تب سے علیحدہ سیکشن کی صورت میں لائبریری میں قائم ہے۔ لائبریری میں فلسفہ، ادب، اسلامیات اور تاریخ پر قابل قدر کتابیں ہیں۔ ۱۹۱۳ء میں آغا محمد ابراہیم نے اپنے جلیل القدر باپ مولانا محمد حسین آزاد کی ساڑھے پندرہ سو کتابوں اور تقریباً چار سو مخطوطات کا مجموعہ لائبریری کو نذر کر دیا۔ یہ ذخیرہ زیادہ تر عربی اور فارسی کتابوں پر مشتمل ہے۔ ۱۹۲۹ء میں پیرزادہ محمد حسین نے ۸۰۹ کتابیں اور ۱۶۵ قلمی نسخے لائبری کو عطیتاً دیے۔ قیام پاکستان کے بعد یونیورسٹی لائبریری کی کتب میں مزید اضافہ ہوتا گیا۔ پروفیسر محمود شیرانی، پروفیسر ایم جی سنگ، حکیم عبدالمجید عتیقی، میاں احمد شفیع اور مولوی محبوب عالم نے بھی کافی تعداد میں اپنی بیش بہا کتب اس لائبریری کو عطیتاً دیں۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے انگلش سیکشن میں جملہ علوم وفنون کی کتابیں شامل ہیں۔ اردو فارسی کتابوں کی تعداد بھی کافی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق یہ تعداد دو لاکھ سے تجاوز کر چکی ہے۔ کوئی سولہ ہزار کتابیں سنسکرت ہندی اور پنجابی میں ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی کے مختلف تدریسی

شعبوں کی سیمینار لائبریریاں موجود ہیں۔ یہ شعبے اپنی طرف سے بھی کتابیں ان سیمینار لائبریریوں کے لیے خریدتے ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں عربی، فارسی، اردو اور سنسکرت کے بیش بہا قلمی ذخائر موجود ہیں۔ یہ لائبریری اعلیٰ مطالعہ و تحقیق کے تقاضوں اور ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔ اس میں ریسرچ کے لیے بہتر سے بہتر مواد اور طلبا اور محققین کے لیے زیادہ سے زیادہ سہولتیں موجود ہیں۔ اس لائبریری کا انتظام یونیورسٹی کے سینٹ اور اور سنڈیکیٹ کے ہاتھ میں ہے۔

بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن لائبریری

بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن نے ۱۹۵۸ء میں اس لائبریری کو قائم کیا۔ اس لائبریری کا انتظام ایک لائبریری کمیٹی کے سپرد ہے جو بڑی محنت اور توجہ سے لائبریری کے لیے کتب مہیا کرتی ہے۔ لائبریری میں اس وقت آٹھ نو ہزار کے قریب کتابیں موجود ہیں۔ تعلیم کے موضوع پر بھی ایک اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ لائبریری کے لیے بالعموم ثانوی تعلیم کے مفید مقصد کو سامنے رکھ کر کتابیں خریدی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ عام موضوعات پر بھی کتابوں کا ذخیرہ ہے۔ ریفرنس یعنی حوالہ جات کی کتابیں خصوصیت کے ساتھ مہیا کی جاتی ہیں۔

گورنمنٹ کالج لائبریری

اس لائبریری کو فضل حسین میموریل لائبریری کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ اس لائبریری کی نئی عمارت کا افتتاح ۱۹۳۹ء میں ہوا۔ یہ عمارت گورنمنٹ کالج لاہور کی تاریخی عمارت سے ملحق ہے اور تقریباً کالج کے نمونے پر ہی بنائی گئی ہے۔ اوپر کی منزل میں لائبریری ہے جس کے گرد ایک گیلری ہے۔ ایک کشادہ آراستہ ہال ہے جس میں ایک سو طالب علم بیٹھ کر مطالعہ کر سکتے ہیں۔ اس لائبریری کے تحت کالج کے چار شعبوں کی لائبریریاں بھی ہیں۔ گورنمنٹ کالج کی اس لائبریری میں کتابوں کی تعداد ہزاروں تک ہے۔ ان میں آرٹ اور سائنس کے موضوع پر کتابیں زیادہ ہیں۔ لائبریری کا انتظام کالج کے پرنسپل کے ہاتھ میں ہے۔ اساتذہ اس لائبریری سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں۔

فارمین کرسچین لائبریری

اس لائبریری کا نام یوئینگ میموریل لائبریری ہے۔ جب لاہور میں فارمین کرسچین کالج کی ابتدا ہوئی تو یہ لائبریری بھی اس کے ساتھ ہی قائم ہوگئی تھی۔ اس لائبریری میں انگریزی، فارسی، عربی اور اردو زبان کی ہزاروں کتابیں ہیں۔ کچھ کتابیں فرانسیسی، اطالوی، ہسپانوی، لاطینی اور یونانی اور جرمن زبانوں کی بھی ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ نایاب مخطوطے اور بعض نادر کتابوں کا ذخیرہ بھی موجود ہے۔ اس لائبریری میں انجیل کے بعض نادر نسخے بھی ہیں جو کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ یہاں عمومی موضوعات پر اچھا خاصا ذخیرہ کتابی شکل میں ہے۔ پوسٹ گریجویٹس طلبا کے لیے ایک ضمنی کتب خانہ یوئنگ ہال نیلا گنبد میں بھی موجود ہے۔ یہاں کتابیں بند اور کھلی الماریوں میں بھی ہیں۔ کافی سرمایہ ہر سال اس لائبریری کے واسطے نئی کتب کی خریداری پر خرچ ہوتا ہے۔ رسالے، اخبار اور جریدے بھی یہاں تازہ صورت میں دستیاب ہیں۔ کالج کے پرنسپل ہی اس لائبریری کے سربراہ ہیں۔

اسلامیہ کالج لائبریری سول لائنز

اس لائبریری کو ۱۸۹۲ء میں انجمن حمایت اسلام نے قائم کیا۔ ۱۹۵۸ء میں جب اس کالج کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ ریلوے روڈ اسلامیہ کالج میں ہائی سیکنڈری کلاس کی تعلیم کا انتظام ہے۔ بی اے اور ایم اے کی تعلیم سول لائنز میں دی جاتی ہے۔ متحدہ کالج میں ۵۰ ہزار کے قریب کتابیں تھیں اور رسائل و جرائد کی تعداد جو ہر سال منگوائے جاتے تھے سو کے قریب تھی۔ کالج کے دو حصوں میں بٹ جانے کے بعد سے اس لائبریری میں تیس ہزار کے قریب کتابیں موجود ہیں۔

اس لائبریری میں غیر ملکی رسائل بھی منگوائے جاتے ہیں۔ عربی فارسی کی بلند پایہ کتابوں کے ساتھ ساتھ تاریخ، انگریزی اور ادبیات فلسفہ اور نفسیات پر کتابوں کا بھی بیش بہا ذخیرہ موجود ہے۔ اس لائبریری میں کئی ایسی کتابیں ہیں جو اور کسی جگہ دستیاب نہیں چنانچہ ۱۹۰۰ء سے پہلے کی کتابیں یہاں ایشو نہیں کی جاتیں۔

ایم اے او کالج لائبریری

ایم اے او کالج کی بنیاد اصل میں امرتسر میں رکھی گئی تھی۔قیام پاکستان کے بعد یہ کالج لاہور میں نیا بنایا گیا۔ ایم اے او کالج کی لائبریری میں کم و بیش بیس ہزار کتابیں موجود ہیں۔ اس لائبریری میں انگریزی ادب اور اقتصادیات کی کتابوں کا بڑا قیمتی ذخیرہ ہے۔لائبریری سے طلبا اساتذہ اور انجمن اسلامیہ کے ممبران بھرپور استفادہ کرتے ہیں۔لائبریری کا انتظام ایک مینجنگ کمیٹی کے ماتحت ہے۔جس کے ارکان پرنسپل اور کالج کونسل کے ممبران ہیں۔

دیال سنگھ کالج لائبریری

اس لائبریری کی بنیاد ۱۹۱۰ء میں رکھی گئی تھی۔لائبریری کے اخراجات کا کفیل بھی دیال سنگھ ٹرسٹ ہی ہے۔یہ لائبریری کالج کے ساتھ ہی قائم کی گئی تھی۔اس وقت اس لائبریری میں کم و بیش پچاس ہزار کتابیں ہیں اور پچاس کے قریب رسائل خریدے جاتے ہیں۔یہ لائبریری نہ صرف طلبا کی ضرورت پورا کرتی ہے بلکہ اس میں بعض ایسی کتابیں بھی موجود ہیں جو کسی بھی ریسرچ اسکالر کے کام آسکتی ہیں۔اس طرح حوالہ جات کے لیے بھی یہاں سب طرح کی سہولتیں موجود ہیں۔ اس لائبریری کے انگریزی اور تاریخ کے شعبے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔لائبریری کا انتظام ایک لائبریری کمیٹی کے ذمے ہے۔اس کو بہتر بنانے کے لیے مزید کوششیں جاری ہیں۔

ایچی سن کالج لائبریری

ایچی سن کالج لاہور میں ۱۸۸۶ء میں قائم ہوا تھا۔تعلیم یہاں ایف اے اور ہائر سینئر کیمبرج تک دی جاتی ہے۔اس کالج کے ساتھ ایک لائبریری بھی ہے۔مگر یہ مختصر لائبریری ہے۔۱۹۵۳ء میں یہ لائبریری کالج کے نئے ونگ میں منتقل ہوئی تھی۔لیکن صحیح معنوں میں اس کی تنظیم جون ۱۹۵۹ء سے شروع ہوئی۔کتابوں کی تعداد یہاں بیس ہزار تک پہنچ گئی ہے اور اس میں اب روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔انگریزی کے علاوہ اس لائبریری میں اردو، عربی اور فارسی کتب کا بھی کافی ذخیرہ موجود ہے۔اس میں ادب، تاریخ اور اسلام پر بعض بڑی قیمتی کتابیں شامل ہیں۔لائبریری کا ایک

باقاعدہ بجٹ ہے۔ لائبریری کے انتظام کے لیے ایک کمیٹی ہے۔ دارالمطالعہ لائبریری کے بالکل قریب ہے جہاں رسالے اور اخبارات بروقت موجود رہتے ہیں۔

لاہور کالج فار وومین لائبریری

یہ کالج ۱۹۲۲ء میں قائم ہوا تھا۔ ساتھ ہی اس کی لائبریری بھی بنائی گئی۔ اس لائبریری میں ایک سروے کے مطابق بیس ہزار کے قریب کتابیں ہیں۔ کتابیں ہر موضوع پر ہیں۔ تاریخ، اسلام، سائنس، ادب آرٹ اور تاریخ پر کتابوں کی تعداد زیادہ ہے۔ طالبات اس لائبریری سے بھرپور استفادہ کرتی ہیں۔ اس لائبریری کا انتظام بھی کالج کی پرنسپل صاحبہ کے ہاتھ میں ہے۔

کنیرڈ کالج لائبریری

لاہور میں کنیرڈ کالج کا قیام ۱۹۱۳ء میں عمل میں آیا اور اس کے فوراً بعد لائبریری بھی تعمیر کر دی گئی تھی۔ اس لائبریری سے صرف کالج کی طالبات اور اساتذہ ہی استفادہ کر سکتی ہیں۔ ادب کے علاوہ بیشتر کتابیں ان علوم سے متعلق ہیں جو کالج میں پڑھائے جاتے ہیں، مثلاً فلسفہ، سیاسیات، معاشیات، ریاضی، جغرافیہ اور تاریخ وغیرہ۔ کتابیں اعشاری نظام کے تحت ترتیب دی گئی ہیں۔ یہ نظام کچھ عرصہ قبل ہی رائج کیا گیا ہے۔ لائبریری کی ترقی و توسیع کا کام ساتھ ساتھ جاری رہتا ہے۔ اس لائبریری کو ایشیا فاؤنڈیشن، برٹش کونسل اور کولمبو پلان کے تحت بھی کتابوں کے عطیات ملتے رہے ہیں۔ ان عطیات میں سائنس کی کتابوں کی کثیر تعداد شامل ہے۔ چنانچہ سائنس لائبریری کو مرکزی لائبریری سے الگ کر کے سائنس بلڈنگ میں منتقل کر دیا گیا۔ اس وقت کالج کے شعبہ سائنس میں کتابوں کا کافی ذخیرہ ہے۔ شعبہ انگریزی کے واسطے ایک الگ مختصر سی لائبریری ہے جس میں انگریزی زبان اور ادب پر کتابیں موجود ہیں۔ کالج میں طالبات کی ایک لائبریری کمیٹی ہے جس کا کام بجٹ کی تقسیم کے سلسلے میں لائبریری کی مدد کرنا ہے اور نئی کتابوں کی سفارشات دینا ہے۔

کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لائبریری

۱۸۶۰ء میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور میں قائم ہوا۔اس کالج کی لائبریری میں طبی موضوعات پر کتابوں کا عظیم الشان ذخیرہ موجود ہے۔جس کی مجموعی تعداد ایک لاکھ کے قریب ہے۔ قریباً دوسو کے قریب میڈیکل سے متعلق رسائل و جرائد یورپ اور امریکہ اور دوسرے ممالک سے منگوائے جاتے ہیں۔لائبریری کا انتظام ایک مینجنگ کمیٹی کے سپرد ہے۔جس کے ارکان زیادہ تر مختلف شعبہ جات کے سربراہ ہیں۔

فاطمہ جناح میڈیکل کالج لائبریری

۱۹۴۸ء میں قیام پاکستان کے بعد اس کالج کی بنیاد رکھی گئی اور اسی سال اسی کالج کی لائبریری کا قیام بھی عمل میں آیا۔یہ کالج صرف لڑکیوں کی میڈیکل تعلیم کے لیے مخصوص ہے۔اس کی لائبریری میں بھی نادر طبی کتابوں کا بیش بہا ذخیرہ موجود ہے۔ان میں طب کے ہر شعبے سے متعلق کتابیں ہیں۔دیگر ممالک میں سرجری اور طب کے دوسرے موضوعات پر ریسرچ کا جو بھی کام ہوتا ہے اس کے بارے میں جرائد و رسائل یہاں پہنچ جاتے ہیں۔اس اعتبار سے اسے ہم ایک مکمل مختصر میڈیکل لائبریری کہہ سکتے ہیں۔

نیشنل کالج آف آرٹس لائبریری

اس کالج کی بنیاد ۱۸۷۵ء میں رکھی گئی۔پہلے اس کا نام میو اسکول آف آرٹس تھا۔بعد میں اس کا نام نیشنل کالج آف آرٹس رکھ دیا گیا۔اس کالج میں عملی فنون لطیفہ اور دست کاریوں کی تعلیم دی جاتی ہے۔اب اس کالج میں مجسمہ سازی کے علاوہ عمارت سازی، ڈیزائننگ، مصوری اور کیلی گرافک آرٹس کی بھی تعلیم دی جاتی ہے۔کالج کی لائبریری میں ان فنون کے بارے میں کافی کتابیں موجود ہیں۔جن میں بعض بہت نایاب اور قیمتی کتب بھی ہیں۔لائبریری میں فارسی زبان کے بعض مخطوطات اور قدیم ایرانی مصوری کی کتابیں بھی ہیں۔فنون لطیفہ پر تقریباً تین چار درجن رسائل اور جرائد بھی خریدے جاتے ہیں۔

پنجاب اسمبلی لائبریری

یہ لائبریری ۱۹۲۲ء میں پنجاب لیجسلیٹو کونسل لائبریری کے نام سے عمل میں آئی تھی۔ ۱۹۳۷ء میں یہ کتب خانہ مجلس آئین ساز پنجاب کہلانے لگی۔ اس لائبریری میں زیادہ تر حوالہ جات، قانونی، دستور، معاشرت، ادب اور تاریخ سے متعلق کتابیں ہیں۔ یہ لائبریری حکومت کے ماتحت ہے۔

لاہور میوزیم لائبریری

اس لائبریری کی بنیاد ۱۹۶۴ء میں عجائب گھر کے ساتھ ہی رکھی گئی۔ اس میں تقریباً پچاس ہزار کتابیں موجود ہیں جو فنون لطیفہ، آثار قدیمہ سکہ سازی، کتبہ گری اور تاریخ کے موضوعات پر ہیں۔ اس میں فنون لطیفہ کے بارے میں بعض سرکاری رپورٹوں کے مکمل سیٹ موجود ہیں۔ اگرچہ اس لائبریری کی نوعیت سرکاری ہے مگر ایم اے تاریخ اور فنون لطیفہ کے طلبا و طالبات اور ریسرچ اسکالر بھی اس سے استفادہ کرتے ہیں۔

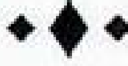
لائبریری ادارہ ثقافت اسلامیہ

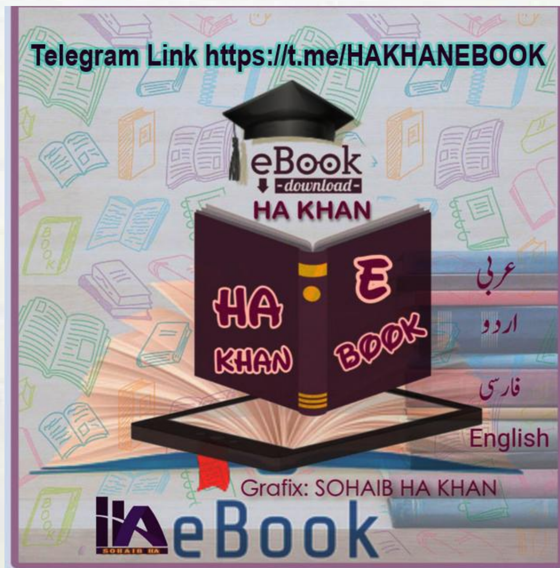
یہ ادارہ ۱۹۵۰ء میں قائم ہوا۔ اس کا مقصد دین اسلام کی روشنی میں حیات جدید کی تشکیل ہے۔ تصنیف و تالیف و ترجمے کا کام اس ادارے کے ذمے ہے۔ اب تک متعدد کتابیں اس ادارے نے شائع کی ہیں۔ اس ادارے کی لائبریری میں اردو، فارسی، عربی اور انگریزی زبانوں کی بڑی نادر اور کثیر تعداد میں کتابیں موجود ہیں۔ پچاس کے قریب یہاں رسائل آتے ہیں جو زیادہ تر مذہبی اور ثقافتی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ ریسرچ اسکالر بھی اس کتب خانے سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

لائبریری ادارہ مجلس ترقی ادب

یہ ادارہ بھی ۱۹۵۰ء میں قائم ہوا۔اس کا مقصد اردو زبان کے ذریعے اہل پاکستان کو جدید فکری رجحانات سے روشناس کرانا ہے۔اس ادارے سے ملحق لائبریری میں سینکڑوں کتابیں ہیں۔عربی اور فارسی اور انگریزی زبانوں میں بھی قابل قدر کتابوں کا ذخیرہ یہاں موجود ہے۔

(بہ شکریہ جناب نورالٰہی صاحب)





لاہور کے کالج

گورنمنٹ کالج لاہور

پاکستان کا یہ تاریخی کالج ۱۸۷۶ء میں اپنی موجود عمارت میں منتقل ہوا تھا۔ اس عمارت پر اس زمانے میں تقریباً چالیس لاکھ روپے خرچ ہوئے تھے۔ پہلے اس کالج کا ہوسٹل مزنگ میں تھا۔ بعد میں طلبا کی سہولت کے لیے کالج کے ساتھ ایک نیا ہوسٹل تعمیر کر دیا گیا۔ جب طلبا کی تعداد بڑھ گئی تو کالج کے سامنے لوئر مال پر نیو ہوسٹل کے نام سے ایک نئی عمارت تعمیر کی گئی۔ گورنمنٹ کالج کو ایک تاریخی اور لاہور کے ثقافتی مرکز کی حیثیت بھی حاصل ہے۔ اس تعلیمی ادارے سے بعض ایسے نابغہ روزگار تعلیم حاصل کر چکے ہیں کہ جنہوں نے علم کے مختلف میدانوں میں بڑی شہرت حاصل کی اور پاکستان کا نام روشن کیا۔ اس کالج کی ایک ڈرامہ کلب بھی ہے جہاں کسی زمانے میں شیکسپیئر کے ڈرامے اسٹیج کیے جاتے تھے۔ ۱۹۰۲ء میں علامہ اقبال اس کالج میں انگریزی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۰۵ء میں علامہ اقبال ولایت چلے گئے تو ان کی جگہ نور الٰہی ایم اے کا تقرر ہوا۔ ۱۹۰۰ء میں اس کالج کی طرف سے ایک رسالہ ''راوی'' شائع ہونا شروع ہوا جو اب تک بڑی باقاعدگی سے شائع ہوتا ہے۔

قیام پاکستان سے قبل گورنمنٹ کالج کے پرنسپل سید احمد شاہ بخاری تھے اور بعد میں بخاری صاحب پاکستان کی طرف سے یو این او میں پاکستان کے مستقل مندوب کی حیثیت سے امریکہ چلے گئے۔ اس کالج میں بڑی نامور علمی شخصیات پڑھاتی رہی ہیں۔ بخاری صاحب جب کالج کے پرنسپل تھے تو کالج کی فضا میں ایک شگفتگی کا تاثر پایا جاتا تھا۔ کیونکہ وہ خود بہترین مزاح نگار تھے۔ ان کے بعد کرامت اور قاضی اسلم صاحب نے بھی یہاں طلبا اور طالبات کو بہترین تعلیم سے نوازا اور پروفیسر سراج کے انگریزی شاعری پر لیکچر تو آج بھی ان کے شاگردوں کو بہت یاد آتے ہیں۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم بھی اسی کالج میں پڑھاتے تھے۔ گورنمنٹ کالج کی ادبی مجلس کے اجلاس ہفتہ

وار ہوتے ہیں جن میں ادبی مقالے اور ادب پارے پڑھے جاتے ہیں۔ کالج کی یونین کی سرگرمیاں بھی انتخابات کے دنوں میں اپنے عروج پر ہوتی ہیں۔

اسپورٹس میں بھی اس کالج نے بڑا نام پیدا کیا اور بوٹنگ اور باکسنگ میں پاکستان کا نام روشن کیا۔

اورینٹل کالج لاہور

اس کالج کی بنیاد ۱۸۷۲ء میں پڑی۔ اس کالج کا مقصد قوم کو علوم شرقی سے روشناس کرانا تھا۔ مولانا محمد حسین آزاد اور خواجہ الطاف حسین حالی اس کالج سے وابستہ تھے۔ ان لائق شخصیات نے اورینٹل کالج کو ترقی کی راہوں پر گامزن کیا۔ شروع شروع میں اس کالج میں طب اور آیورویدک کی کلاسیں بھی ہوا کرتی تھیں۔ قیام پاکستان کے بعد یہاں اردو ایم اے، ادیب فاضل، ادیب عالم، منشی فاضل اور بعد میں ایم اے پنجابی کی کلاسیں بھی شروع ہو گئیں۔ ڈاکٹر برکت علی قریشی قیام پاکستان کے بعد اس کالج کے پہلے پرنسپل بنے۔ اس کے بعد ڈاکٹر سید عبداللہ کا بطور پرنسپل تقرر ہوا۔ اس کالج کا اسٹاف لائق اور قابل قدر اساتذہ پر مشتمل ہے۔

سینٹرل ٹریننگ کالج لاہور

۱۸۸۰ء میں اس کالج کا قیام عمل میں آیا۔ اس کالج کے پیش نظر اسکول کی تعلیم کا معیار اور ٹریننگ کو بہتر سے بہتر بنانا ہے۔ اب اس کالج میں ایم ایڈ کی کلاسیں بھی شامل ہیں اور دیگر تدریسی علوم کی بھی تعلیم اور ٹریننگ دی جاتی ہے۔ اس کالج کے پہلے پرنسپل پروفیسر ڈک تھے جو گورنمنٹ کالج میں انگریزی کے پروفیسر ہوا کرتے تھے۔ ۱۹۴۸ء میں قیام پاکستان کے بعد اس کالج نے مزید ترقی کرنی شروع کی اور اس میں ہسٹری آف ایجوکیشن کا نصاب بھی شامل کر دیا گیا۔ ہر مضمون کی کتب اردو میں شائع ہونا شروع ہو گئیں۔ قیام پاکستان کے بعد بی ٹی اور سی ٹی کے طلبا کو بالترتیب ۵۰ اور ۳۰ روپے ماہوار وظیفہ ملنے لگا تھا۔

فورمین کرسچین کالج لاہور

اس کالج کے بانی کا نام چارلس فورمین تھا جو کہ ایک مشنری تھا۔اس نے ہی چوک رنگ محل میں مشن اسکول بھی قائم کیا تھا۔اس کالج کو ایف سی کالج کہتے تھے۔اس کالج کی ابتدا ۱۸۸۶ء میں ہوئی۔عیسائی پادری اور اسی کالج کے بانی چارلس فورمین کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بڑے نیک دل انسان تھے۔لاہور شہر سے انہیں اس قدر محبت تھی کہ وہ شہر کے گلی کوچوں میں پھرتے اور جہاں کسی کو ضرورت ہوتی اس کی خدمت کرتے۔اس زمانے میں لاہور کے لوگ بھی اس درویش صفت عیسائی پادری سے بہت پیار کرتے تھے۔شروع شروع میں اس کالج میں مسلمان طلبا کی تعداد بہت کم تھی۔لیکن بعد میں مسلمان لڑکوں نے بھی اس کالج میں داخلہ لینا شروع کر دیا۔

ایف سی کالج کے پہلے پرنسپل چارلس فورمین ہی تھے۔ان کے بعد یہ عہدہ جیمز ایونگ نے سنبھالا۔وہ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہ چکے تھے۔ان کے دور میں کالج نے بڑی ترقی کی۔ڈاکٹر لوکاز ایف سی کالج میں ۱۹۴۶ء تک پرنسپل رہے۔انہوں نے کالج کی تزئین و آرائش کرائی اور ہوسٹل بھی بنوایا۔قیام پاکستان کے بعد اس کالج نے مزید ترقی کی۔کالج کی گراؤنڈ میں مسجد رضوان تعمیر کی گئی جہاں اساتذہ اور طلبا نماز پڑھتے ہیں۔

ایچی سن کالج لاہور

لاہور کے اس کالج میں امرا اور رؤسا کے لڑکے ہی تعلیم حاصل کیا کرتے تھے،لیکن پاکستان بن جانے کے بعد یہاں تعلیم حاصل کرنے پر کوئی پابندی نہیں رہی اور کسی بھی طبقے سے تعلق رکھنے والا طالب علم یہاں داخلہ لے سکتا ہے۔یہ ضرور ہے کہ یہاں کی فیس اور دیگر اخراجات دوسرے کالجوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں۔شروع میں یہاں لڑکوں کو مغربی تعلیم دی جاتی تھی۔انگریزوں نے یہ کالج سی ایس پی افسروں اور اپنے ماتحت اور انگریز کی پالیسی کے مطابق کام کرنے والوں کی افزائش کے لیے بنایا تھا۔لیکن قیام پاکستان کے بعد اب یہاں دینی تعلیم بھی دی جاتی ہے اور نوجوانوں کو ایسی ٹیکنیکل اور پیشہ وارانہ تعلیم دی جاتی ہے کہ وہ آگے چل کر مختلف شعبوں میں نمایاں کارکردگی دکھائیں اور پاکستان کی ترقی میں مدد و معاون ثابت ہوں۔اب اس کالج کا مقصد قوم کی خدمت ہے اور اس کے اساتذہ بھی اسی لگن کے ساتھ کام کرتے ہیں۔

کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج

اس کالج کو ایشیا کا سب سے بڑا میڈیکل کالج ہونے کا بھی فخر حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کالج میں دیگر ممالک خاص طور پر مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید کے ممالک سے بھی طلبا اور طالبات طبی تعلیم حاصل کرنے آتی ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد اس کالج کے پرنسپل کرنل الٰہی بخش تھے۔ وہ قائداعظم کے طبیب خاص بھی تھے۔ ڈاکٹر صدیقی نے اس کالج میں اناٹومی میوزیم تعمیر کیا۔ کرنل الٰہی بخش کے مختصر عہد میں میڈیکل کالج میں بہت سے نئے بلاک تعمیر کیے گئے اور کالج نے ہر میدان اور ہر شعبے میں ترقی کی۔ کرنل الٰہی بخش کی پرنسپلی کے زمانے میں واقعی کالج نے ترقی کے بہت منازل طے کیں۔ رتن باغ کے علاقے میں بھی مریضوں کے لیے ایک نیا بلاک بنایا گیا۔ اس وقت یہ کالج ملک وقوم کی بہت خدمت کر رہا ہے۔ اس کے مقابلے کا کوئی دوسرا کالج سارے ایشیا میں نہیں ہے۔ یہاں میڈیکل تعلیم کے لیے ہر قسم کی ماڈرن سہولتیں حاصل ہیں۔

اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور

۱۹۰۷ء میں انجمن حمایت اسلام نے لاہور میں اس کالج کی بنیاد رکھی۔ اسلامیہ کالج سول لائنز ریلوے روڈ والے اسلامیہ کالج کا ایک حصہ ہے۔ اس کالج کا سنگ بنیاد امیر حبیب اللہ نے رکھا تھا۔ اس کی تعمیر کا کام ۱۹۱۳ء میں مکمل ہوا۔ اس کے بعد ۱۹۴۰ء میں کالج کا ہوسٹل اور لائبریری بنائی گئی۔ کالج میں جمناسٹک کھیلوں کے لیے ایک الگ عمارت بنائی گئی۔ یہاں ایم اے تک پڑھائی ہوتی ہے۔

اسلامیہ کالج ریلوے روڈ

پاکستان کی سرزمین کا یہ پہلا اسلامی کالج ہے جس نے تحریک پاکستان میں نمایاں کردار ادا کیا اور جہاں کے اساتذہ اور طلبا نے تحریک پاکستان میں بڑی قربانیاں دیں۔ قائداعظم جب بھی لاہور تشریف لاتے تو اسلامیہ کالج ریلوے روڈ پر ضرور آتے اور طلبا سے ملتے اور ان سے خطاب کرتے۔ اس کالج میں سب سے پہلے اسلامی فنون اور دینی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس کالج کے

طلبا نے اسپورٹس کے میدان میں بھی بڑا نام پیدا کیا۔ کرکٹ کے کھیل میں تو خاص طور پر یہاں کے طلبا نے نمایاں کارنامے سرانجام دیے۔ امیروں کے لڑکے ایف سی کالج اور ایچی سن کالجوں کا رخ کرتے تھے جبکہ اسلامیہ کالج میں درمیانے طبقے اور سادہ پوش شرفا کے بچے داخلہ لیتے تھے اور یہ حقیقت ہے کہ اسی درمیانے طبقے کے طلبا نے ہی پاکستان کی تحریک کو کامیاب بنانے میں تاریخی کارنامے سرانجام دیے اور اسلامیہ کالج لاہور کا نام پاکستان کی تحریک میں نمایاں طور پر لکھا جائے گا۔ اس کالج میں جن جن سرکردہ اصحاب نے پڑھا ان کی فہرست بڑی طویل ہے۔ اس کالج کے اولڈ بوائز دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔

دیال سنگھ کالج لاہور

اس کالج کی بنیاد سردار دیال سنگھ کے ہاتھوں پڑی جو لاہور کے ایک مخیّر اور انسان دوست انسان تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ امیروں کے بچے تو ایف سی کالج اور ایچی سن کالج کی طرف جاتے ہیں تو انہوں نے غریبوں کے بچوں کی تعلیم کے لیے دیال سنگھ کالج تعمیر کروایا۔ سردار دیال سنگھ کے بارے میں ایک روایت یہ بھی مشہور ہے کہ وہ مسلمانوں سے بڑی محبت کرتے تھے۔ انہیں اسلامی تعلیمات سے بڑی دلچسپی تھی اور رات کو قرآن پاک کی تلاوت بھی کیا کرتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد پروفیسر سید عابد علی عابد اس کالج کے پرنسپل بنے۔ انہوں نے کالج کی ترقی و تعمیر کے لیے بڑا نمایاں کام کیا۔ مگر وہ ۱۹۵۴ء تک ہی پرنسپل رہے۔ ان کے بعد پروفیسر سعادت علی پرنسپل مقرر ہوئے۔ دیال سنگھ کالج سید عابد علی عابد کے زمانے میں ادیبوں شاعروں کی آماجگاہ بنا رہا۔ یہاں ہفتے میں ایک بار مشاعرہ ہوتا اور کالج کی طرف سے دعوت کا اہتمام بھی کیا جاتا تھا۔ اس دعوت میں اردو کے مشہور ادبا، شاعر اور نقاد حضرات شرکت کرتے تھے۔ اس کالج کا ایک اپنا میگزین بھی ہر ماہ باقاعدگی سے شائع ہوتا تھا۔

کنیرڈ کالج لاہور

خواتین کے اس کالج کی بنیاد ۱۹۱۲ء میں رکھی گئی۔ اصل میں یہ کالج بھی ریلوے کے کنیرڈ اسکول کا ایک حصہ ہے۔ سب سے پہلے امریکن مشنری مسز کنیرڈ نے ریلوے اسٹیشن کے قریب

کنیرڈ اسکول قائم کیا۔ اس کے بعد کنیرڈ کالج کی بنیاد رکھی گئی۔ کچھ عرصہ تک یہ کالج لیک روڈ پر بھی رہا۔ ۱۹۳۸ء میں یہ کالج اس مقام پر منتقل ہوا۔ جہاں یہ آج بھی قائم ہے۔ اس کالج کی پہلی پرنسپل خاتون مس جان میکڈانلڈ تھیں۔ اس خاتون نے ریٹائر ہونے کے بعد سول سیکرٹریٹ کے پاس اپنا ایک الگ اسکول کھول لیا تھا۔ جس کا نام میکڈانلڈ ہائی اسکول تھا۔ اس کے بعد مس منگت رائے کالج کی پرنسپل مقرر ہوئیں۔ مس منگت رائے بڑی پڑھی لکھی اور بااصول خاتون تھیں۔ ان کے زمانے میں اس کالج نے بڑی ترقی کی اور نام پیدا کیا۔ وہ نظم وضبط کا بے حد خیال رکھتی تھیں۔ مشہور سوشل ورکر بیگم فدا حسین اسی کالج کی تعلیم یافتہ تھیں جنہوں نے تحریک میں بھی نمایاں کام کیا تھا۔ اس کالج کے ہوسٹل بھی ہیں۔ ایک لائبریری ہے۔ اب سائنس ہوسٹل بھی بن گیا ہے۔ یہاں نرسنگ کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ کھیلوں کے میدان میں بھی اس کالج کی طالبات نے نمایاں کامیابیاں حاصل کیں۔

لاہور کالج برائے خواتین

اس کالج کا قیام بھی ۱۹۲۲ء میں عمل میں لایا گیا۔ شروع میں یہ محض ایک انٹرمیڈیٹ کالج تھا۔ بعد میں ڈگری کالج بنا اور قیام پاکستان کے ساتھ ہی یہاں ایم اے کی کلاسیں بھی شروع ہو گئیں۔ دیکھتے دیکھتے اس کالج کی طالبات میں اضافہ ہوتا گیا۔ کیونکہ مسلمانوں میں تعلیم کا رجحان بہت ہو گیا تھا۔ قیام پاکستان سے پہلے اسی کالج کی گراؤنڈ میں گرد اڑا کرتی تھی اور چاردیواری بھی ٹوٹی پھوٹی تھی۔ کمروں کی حالت بھی شکستہ تھی، لیکن قیام پاکستان کے بعد کمروں کی مرمت کی گئی۔ نئے بلاک تعمیر کیے گئے۔ گراؤنڈ کو درست کر کے وہاں پھولوں بھری کیاریاں لگائی گئیں۔ کھیل کے لیے الگ گراؤنڈ مختص کر دی گئی۔ چاردیواری کی از سر نو تعمیر کی گئی۔ نیا آہنی گیٹ لگوایا گیا۔ اس کالج میں اب طالبات کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی ہے۔ لاہور کالج برائے خواتین میں سائنس اور سائنسی تجربات کی جدید ترین سہولتیں حاصل ہیں۔ چنانچہ دوسرے کالج کی لڑکیاں اکثر پریکٹیکل کے لیے اسی کالج کی لیبارٹری سے استفادہ کرتی ہیں۔

طبیہ کالج لاہور

لاہور میں طب یونانی کی کلاسیں سب سے پہلے ۱۸۸۷ء میں لاہور کے اورینٹل کالج میں شروع ہوئی تھیں۔ کچھ عرصہ یہ کلاسیں میڈیکل کالج اور پھر اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں بھی جاری رہیں۔ تب سے لے کر اب تک طب یونانی کی تعلیم کا فریضہ انجمن حمایت اسلام ہی کے ذمے ہے۔ مگر اب اسے اسلامی کالج سے علیحدہ کر کے طبیہ کالج کی شکل دے دی گئی ہے۔ اس کالج میں ایک مکمل لیبارٹری بھی موجود ہے۔ یونانی شفاخانہ بھی قائم ہے۔ حکیم محمد حسین قرشی اس کالج کے پرنسپل رہ چکے ہیں۔ یہاں ایک میوزیم اور ایک دارالادویہ بھی ہے۔ یہاں انسانی جسم کی تشریح پر بھی لیکچر دیئے جاتے ہیں۔ کالج کا ایک اپنا بورڈنگ ہاؤس ہے۔ یہاں حکیم حاذق اور زبدۃ الحکماء کے کورس ہوتے ہیں۔ کالج کے دواخانے میں طلبا کو مرکب اور مفرد ادویات کی تیاری کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ کالج کا انتظام وانصرام کالج کی ایک کمیٹی کے سپرد ہے۔

ہیلی کالج آف کامرس لاہور

اس کالج میں معاشیات کی تعلیم دی جاتی ہے اور طلبا کو تجارت اور بینکنگ کے ابتدائی اصولوں سے روشناس کرایا جاتا ہے۔ حقیقت میں یہ کالج پنجاب یونیورسٹی کا ایک شعبہ ہے مگر اسے باقاعدہ کالج کی حیثیت حاصل ہے۔ کالج کے ساتھ ہی اس کا اپنا ہوسٹل ہے۔ اس کالج کا سارا انتظام پنجاب یونیورسٹی کے ارباب بست وکشاد کے پاس ہے۔ قیام پاکستان کے دوتین سال بعد تک یہاں صرف بی کام تک ہی تعلیم دی جاتی تھی، لیکن پھر یہاں ایم کام کی کلاسیں بھی شروع کر دی گئیں۔ اس کالج کی لائبریری بہت بڑی ہے اور ایک سروے کے مطابق اس لائبریری میں بینکنگ، معاشیات اور اقتصادیات کے بارے میں پچیس ہزار کے قریب کتابیں موجود ہیں۔ کالج کی طرف سے ایک رسالہ بھی شائع ہوتا ہے جس کا نام ''الاقتصاد'' ہے۔ یہ ہر چھ ماہ کے بعد چھپتا ہے۔

ایم اے او کالج لاہور

اس کالج کی بنیاد امرتسر میں رکھی گئی تھی، لیکن پاکستان قائم ہو جانے کے بعد یہ امرتسر سے ہجرت کر کے لاہور آ گیا۔ اس وقت یہ کالج سول سیکرٹریٹ سے چوبرجی جانے والی سڑک پر واقع ہے۔ امرتسر کی مجلس اسلامیہ نے امرتسر میں بھی مسلمانوں کی تعلیمی اور اخلاقی جدوجہد میں بھرپور کردار ادا کیا اور پاکستان میں بھی یہ انجمن اپنے کالج اور اسکول کے ذریعے مسلمانوں کی خدمت کر رہی ہے۔

جناب وحید الحسن ہاشمی، جن کے تحقیقی مضمون سے راقم الحروف نے یہ تمام معلومات حاصل کی ہیں لکھتے ہیں:

> ''سرسید احمد خان کے جس مشن کو حضرات اودھ نے سینے سے لگایا اسے پنجاب میں سب سے پہلے اہل امرتسر نے اپنا کر ۱۸۷۲ء میں ایک مجلس کی بنیاد رکھی۔ دو سال بعد ۱۸۷۴ء میں یہ درخت بار آور ہوا۔ خان بہادر آغا کلب عابد اسسٹنٹ کمشنر امرتسر اور خان بہادر منشی محمد مہدی خان سابق وزیراعظم ریاست بہاولپور نے اس انجمن کو سینچا۔ ۱۸۸۵ء میں اسی انجمن کے تحت امرتسر میں ایک ہائی اسکول کام کرنے لگا۔ یہی اسکول ایم اے او اسکول کہلایا اور ۱۹۳۳ء میں امرتسر میں ایم اے او کالج بن گیا۔''

تحریک پاکستان میں اس کالج کے طلبا نے بھرپور کردار ادا کیا۔ ۱۹۴۷ء میں جب پاکستان قائم ہوا تو ایم اے او کالج امرتسر سے ہجرت کر کے لاہور میں آ گیا۔ یہاں ایک عمارت میں اسے دوبارہ قائم کیا گیا اور پاکستان سے وفاداری اور اسلامی سیاست کا شعور پیدا کرنا اس کالج کا نصب العین قرار دیا گیا۔ کالج کا انتظام کالج کی ایک کونسل کے سپرد ہے۔

اسلامیہ کالج برائے خواتین

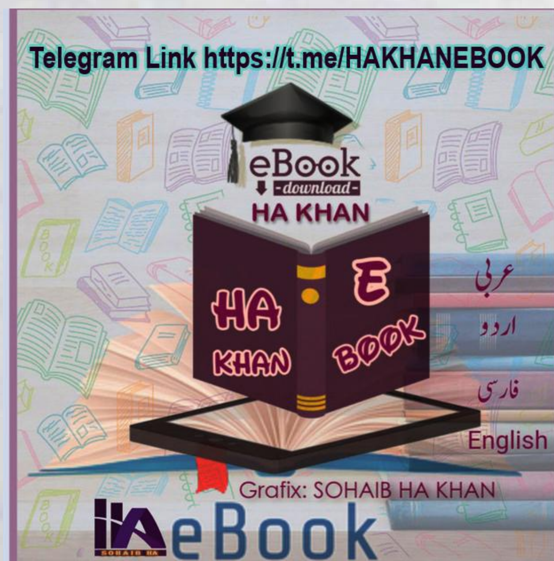
انجمن حمایت اسلام لاہور نے ۱۹۳۹ء میں کوپر روڈ پر اس کالج کی بنیاد ڈالی۔ اس کالج کے قیام کا مقصد مسلم خواتین کو اسلامی تعلیمات سے آراستہ کرنا ہے۔ شروع ہی سے اس کالج میں نظم و

ضبط اور پردے کا بہترین اور خاطر خواہ اہتمام کیا گیا ہے۔اس کالج نے ملت اسلامیہ کی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔وقت کے ساتھ ساتھ کالج میں تعمیر و اضافے کا کام بھی جاری رہا۔شجاع الدین ہال کی تعمیر عمل میں لائی گئی۔۱۹۶۰ء میں کالج کا ایک شاندار سائنس بلاک بنایا گیا۔حکومت کی طرف سے بھی اس کالج کو گرانٹ ملتی ہے۔کالج کی لائبریری میں جدید علوم سے متعلق کتابوں کا وافر ذخیرہ موجود ہے۔لیکن کالج کی عمارت خستہ ہو چکی ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ اس عمارت کی جگہ ایک نئی جدید طرز کی عمارت تعمیر کی جائے۔اس کالج کا معیار تعلیم شروع ہی سے تسلی بخش رہا ہے۔

تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ یہاں ادبی سرگرمیاں بھی جاری ہیں۔ہر برس ایک کل پاکستان مشاعرے کا اہتمام کیا جاتا رہا ہے جس میں ملک بھر کی شاعرات شرکت کرتی ہیں۔کالج کا اپنا ایک میگزین بھی ہے جس میں معیاری مضامین چھپتے ہیں۔

ان کے علاوہ لاہور میں اس وقت ہوم اینڈ اکنامکس کالج گلبرگ اور دوسرے بہت سے چھوٹے چھوٹے کالج اور تعلیمی ادارے سرگرم کار ہیں۔جہاں طلبا اور طالبات علوم وفنون کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔متذکرہ بالا لاہور کے اہم اور مشہور کالج اور تعلیمی ادارے تھے جن کا ذکر کیا گیا۔





لاہور کے اکھاڑے، ناشتے اور تکیے

لاہور میں بڑے نامی گرامی پہلوان ہو گزرے ہیں۔ یہاں کے نوجوانوں میں ہمیشہ سے ورزش کا شوق رہا۔ چنانچہ یہاں کے اکھاڑے بھی فن کشتی کی تاریخ میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ محترم سراج نظامی نے تحقیق و ریسرچ کے بعد جن اکھاڑوں کی فہرست مرتب کی تھی ہم اس کے شکریے کے ساتھ ان اکھاڑوں کا ذکر کرتے ہیں۔

اکھاڑہ خلیفہ بوٹا

اس اکھاڑے کو گھاٹی والا اکھاڑہ بھی کہتے ہیں۔ کالو والوں کے اکھاڑوں میں یہ سب سے بڑا اکھاڑہ ہے۔ یہ شاہی قلعے کے جنوب کی طرف بجلی گھر کے قریب واقع ہے۔ اس اکھاڑے نے برصغیر کے مشہور پہلوان پیدا کیے۔ مثلاً بوٹا پہلوان۔ آپ لاہور کے مشہور پہلوان تھے۔ عمدہ لباس پہنتے تھے۔ آپ نے ہندوستان کی کئی ریاستوں میں جا کر وہاں کے پہلوانوں کو پچھاڑا۔ آپ کو رستم ہند بھی کہا جاتا تھا۔ بڑے بڑے پہلوان آپ کی شہ زوری کا لوہا مانتے تھے۔ آپ کا انتقال لاہور میں ہوا اور قبرستان میانی صاحب میں دفن کیے گئے۔ جلیل مانکپوری نے بوٹا پہلوان کی وفات پر ایک دل گداز نظم رقم کی تھی جس کے آخری شعر میں پہلوان کی تاریخ وفات نکلتی ہے:

ان کے لکھنے سے کہی تاریخ میں نے اے جلیل
رستم ہند آہ بوٹا نامدار روزگار

چوہا پہلوان بوٹا پہلوان کے بھائی تھے اور کشتی کے فن میں ماہر تھے۔ آپ نے بھی بیشمار کشتیاں لڑیں اور نام پیدا کیا۔ مہنی پہلوان رینی والا۔ یہ جواں سال پہلوان اگر زیادہ دیر زندہ رہتا تو بڑا نام پیدا کرتا۔ آپ کا انتقال جوانی میں ہی ہو گیا تھا۔

گاموں پہلوان بالی والا۔ آپ بوٹا پہلوان کے شاگرد تھے۔ نہایت خوبصورت جسم کے مالک تھے اور داؤ پیچ میں جواب نہیں رکھتے تھے۔ آپ نے پنجاب اور ہندوستان کے مختلف شہروں

میں کشتیاں لڑیں اور نامی گرامی پہلوانوں کو پچھاڑا۔

گونگا پہلوان۔ یہ وہ پہلوان تھے جن پر پاکستان کو ہمیشہ ناز رہے گا۔ آپ گاموں پہلوان کے سب سے بڑے فرزند تھے۔ نام فیروز الدین تھا۔ بچپن میں تپ محرقہ کے باعث گونگے ہو گئے۔ اس لیے گونگا پہلوان کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ شہ زوری اور فن کشتی میں بڑے ماہر تھے۔ یوں تو آپ نے کئی کشتیاں لڑیں اور نامی گرامی پہلوانوں کو چت کیا مگر جو کشتی آپ نے امام بخش پہلوان رستم ہند سے لڑی وہ ہمیشہ یادر ہے گی۔ ایسا دنگل اور ایسا پنڈال کبھی آنکھوں سے نہیں گزرا۔ تقریباً ساری کی ساری منٹو پارک ہی پنڈال بن گئی تھی۔ ہم اس کشتی میں اکھاڑے کے بالکل قریب بیٹھے تھے اور پیچھے اس زمانے کے دو نامی گرامی پہلوان بیٹھے تھے یعنی کلو پہلوان امرتسری اور رحیم سلطانی والا۔ یہ دونوں پہلوان اکھاڑے میں اترنے والے پہلوان کے بارے میں باتیں کرتے اور رائے دیتے تھے۔ جب امام بخش اور گونگا پہلوان اکھاڑے میں اترے اور دونوں نے پنجوں میں پنجے ڈال کر کشتی لڑنی شروع کی تو رحیم سلطانی والا کہنے لگا:

''پہلوان۔ گونگا امام بخش کے رعب میں نہیں آ رہا ہے۔''

تھوڑی دیر بعد کلو پہلوان امرتسری نے اندازہ لگا لیا کہ امام بخش گونگے سے طاقت میں کم نہیں۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی۔

''یا اللہ! میرے تیتر کی خیر۔''

اشارہ امام بخش کی طرف تھا۔ اس کے بعد چشم زدن میں امام بخش اوپر تھے اور گونگا پہلوان ان کے نیچے تھا۔ لیکن دوسرے لمحے گونگا اٹھ کھڑا ہو گیا۔ دونوں پہلوان لڑتے ہوئے کھائی میں جا گرے۔ جب کوئی فیصلہ نہ ہو سکا تو فیصلہ گونگے کے حق میں دے دیا گیا۔ امام بخش اس فیصلے سے متفق نہ تھا۔ کشتی دوبارہ شروع ہوگئی اور گونگا پہلوان نے امام بخش کو گرا دیا۔ گونگا پہلوان بڑے نیک اور پرہیز گار تھے۔ آپ پٹیالہ سے دنگل دیکھنے لاہور آ رہے تھے کہ لاری کے حادثے میں ہلاک ہو گئے۔ ان نامی پہلوانوں کے علاوہ اس اکھاڑے نے اور بھی پہلوان پیدا کیے جن میں جانی ڈنگر، ساجا کبابی، کالا خراسیا، برکت ناگاں والا اور شیدا پہلوان بہت مشہور ہیں۔

اکھاڑا تکیہ تاجے شاہ

یہ اکھاڑہ چیمبر لین روڈ پر واقع ہے۔اس کے مشہور خلیفہ منہا خرادی اپنے فن کے بہت ماہر مانے جاتے ہیں۔اس اکھاڑے کے مشہور پہلوانوں میں نجے شاہ سب سے اچھے پہلوان ہیں۔ کشتی میں بڑے ماہر ہیں۔آج کل اس اکھاڑے کے خلیفہ بھی آپ ہی ہیں۔

اکھاڑہ چنن قصائی

یہ اکھاڑہ لنڈا بازار کے عقب لاہور سٹی کوتوالی میں واقع ہے۔ یہ اکھاڑہ بھی کالو والے اکھاڑوں میں ممتاز مقام رکھتا ہے۔اس اکھاڑے میں بڑے اچھے پہلوان زور کرتے ہیں۔

چنن پہلوان ۔ بڑے گرانڈیل پہلوان تھے اور داؤ پیچ کے بڑے ماہر مانے جاتے تھے۔ آپ نے پنجاب اور ہندوستان میں نامی پہلوانوں سے کشتی لڑی اور بیشتر کو پچھاڑا۔اس لیے آپ ستارہ ہند کہلائے۔ننھا جنگرو پہلوان ۔آپ نے کئی دنگلوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور اپنے قدر دانوں سے داد وصول کی۔حریف پر چیتے کی طرح حملہ کر کے داؤ پیچ دکھاتے ہیں۔مگر افسوس کہ فسادات کے دنوں میں آپ گرفتار ہو گئے اور آپ کو کالے پانی کی سزا ہوئی۔آپ کو انڈیمان بھیج دیا گیا۔جب واپس آئے تو طاقت جواب دے چکی تھی۔

جمال جنگرو پہلوان۔آپ ننھا پہلوان کے چھوٹے بھائی ہیں۔طویل القامت ہیں۔ بدن بھاری ہے۔داؤ پیچ خوب جانتے ہیں۔آپ نے بھی کئی قابل ذکر دنگلوں میں اپنے فن کا مظاہرکیا۔ لاہور والے ان کی کشتیوں کو شاید ہی فراموش کر سکیں جو جمال پہلوان اور بھماں پہلوان کے درمیان ہوئیں۔

اکھاڑہ استاد شش گر

یہ اکھاڑہ مستی دروازے لاہور کی تاریخی مسجد بیگم شاہی کے عقب میں واقع تھا۔آج کل وہاں موٹروں کی مرمت کی دکان بن گئی ہے۔

اکھاڑہ مصری شاہ

یہ اکھاڑہ مصری شاہ کے پل کے باہر میوہ منڈی کے پاس واقع ہے۔ ایک چھوٹا سا مزار بھی وہاں پر ہے۔ اس اکھاڑے کے مشہور پہلوانوں میں جلال الدین کوئلوں والا بہت نامی پہلوان گزرا ہے۔

اکھاڑہ ویام شالہ

یہ لاہور کا نیا اکھاڑہ ہے اور ٹکسالی دروازے کے باہر موہنی روڈ کے شروع میں واقع ہے۔ پہلے یہ لاہور کے ہندوؤں کا اکھاڑہ ہوتا تھا اور یہاں ان ہی کے دنگل ہوا کرتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد جب امرتسر کے مشہور گاما پہلوان والا لاہور آ گئے تو انہوں نے یہاں اکھاڑہ بنا لیا۔ اس اکھاڑہ میں پاکستان کے نامی گرامی پہلوان زور کرتے ہیں۔ ان میں مندرجہ ذیل عالمگیر شہرت کے مالک ہیں۔ بھولو پہلوان رستم ہند، رستم زماں گاماں پہلوان کے بھتیجے اور رستم ہند امام بخش پہلوان کے سب سے بڑے صاحبزادے ہیں۔ بڑے گرانڈیل جوان ہیں۔ ریاضت کا یہ عالم ہے کہ لنگوٹ کس کر جب اکھاڑے میں اترتے ہیں تو بیسیوں پہلوانوں کو زور کراتے ہیں۔ آپ پاکستان کے کئی پہلوانوں کو گرا چکے ہیں۔

اسلم عرف اچھا پہلوان

اچھا پہلوان۔ اکرم عرف اکی پہلوان۔ گوگا پہلوان۔ اعظم پہلوان۔ یہ چاروں پہلوان بھی امام بخش پہلوان رستم ہند کے صاحبزادے اور بھولو پہلوان کے چھوٹے بھائی ہیں۔ قدیم کشتی اور جدید فری اسٹائل کشتی کے فن میں بھی ماہر ہیں۔ کئی دنگلوں میں لڑ کر کامیابی حاصل کر چکے ہیں۔ پاکستان اور ہندوستان اور بیرون ملک کئی مشہور پہلوانوں کو چاروں شانے چت گرا چکے ہیں۔ پاکستان کو اس خاندان پر ناز ہے۔

اکھاڑہ بھورے شاہ

کبھی یہ اکھاڑہ بڑا نامی اکھاڑہ ہوا کرتا تھا اور تکیہ بھورے شاہ بیرون ٹکسالی دروازہ میں واقع تھا۔اس اکھاڑے نے بھی اچھے اچھے پہلوان پیدا کیے۔جن میں مندرجہ ذیل مشہور ہوئے۔

کریم بخش پہلوان پولی والا: اپنے وقت کے بڑے مشہور پہلوان تھے اور اچھے اچھے پہلوانوں کے ساتھ مقابلہ کر کے انہیں گرا چکے تھے۔آپ مہاراجہ جودھ پور کے درباری پہلوان تھے۔

یوسف پہلوان پناں والا۔ بڑے گرانڈیل پہلوان ہیں اور لاہور اور بیرون لاہور کئی مشہور پہلوانوں سے کشتی لڑ چکے ہیں۔آپ نے ہندوستان کی کئی ریاستوں کے دنگلوں میں بھی اپنی شجاعت کا مظاہرہ کیا اور داد وصول کی ہے۔آپ کریم بخش پہلوان کے شاگرد ہیں۔

لال پہلوان، استاد کریم بخش پہلوان کے شاگرد اور اس کے بڑے اچھے پٹھوں میں ہیں۔ داؤ پیچ اور لڑنت کے ماہر ہیں۔لاہور والے ان کی کشتیوں کو آج بھی یاد کرتے ہیں۔

عاشق پہلوان بوٹی والا۔ آپ سردار محمد پہلوان کے فرزند اور مشہور خلیفہ بوٹی مرحوم کے نواسے ہیں۔آپ نے بھی کئی دنگلوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔آپ پہلوان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب جراح بھی ہیں۔

اکھاڑہ تکیہ شیر علی

یہ اکھاڑہ بھی تکیہ شیر علی بیرون ٹکسالی دروازے واقع تھا اور اس میں تقریباً وہی جوان زور کیا کرتے تھے جو تکیہ بھورے شاہ میں زور کرتے تھے۔اب یہاں کوئی اکھاڑہ نہیں ہے۔

اکھاڑہ پیر مکی

راوی روڈ پر گوروں کے قبرستان کے پاس مشہور مصور عبدالرحمٰن چغتائی کا مکان ہے۔ یہ اکھاڑہ اس مکان کے عقب میں واقع ہے۔اس اکھاڑے نے بھی بعض بڑے اچھے پہلوان پیدا کیے۔ مثلاً علماں راج، رحیماں پہلوان، ننھا پہلوان، عاشق پہلوان دھوبی وغیرہ۔

اکھاڑہ تکیہ پیر از غیب

دربار داتا گنج بخش کے سرہانے کی طرف ایک تکیہ ہے جسے پیر از غیب تکیہ کہتے ہیں۔ اس تکیے میں کبھی یہ اکھاڑہ ہوا کرتا تھا۔ اس اکھاڑے میں کافی پہلوان ورزش کیا کرتے تھے۔ بالا جھیورا اسی اکھاڑے کا پہلوان تھا۔ اب قبریں بننے کی وجہ سے یہ اکھاڑہ یہاں سے ہٹ گیا ہے۔

اکھاڑہ خلیفہ بخشی

یہ بالکل نیا اکھاڑہ ہے اور لوہاری دروازے کے باہر مسکین سائیں کے تکیے میں واقع ہے۔ اس اکھاڑے کے بانی خلیفہ بخشی ہیں۔ خالو پہلوان آپ ہی کے شاگرد ہیں۔ جو بڑے بڑے دنگلوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کر کے شہرت حاصل کر چکے ہیں۔

اکھاڑہ جانی پہلوان

یہ اکھاڑہ جانی پہلوان پسر الٰہی بخش نے بادشاہی مسجد کے پاس بنایا تھا۔ اس میں جانی پہلوان، ساجا پہلوان وغیرہ ورزش کرتے تھے۔ جب بادشاہی مسجد کی مرمت شروع ہوئی اور باغات بنائے گئے تو اکھاڑے کو یہاں سے ہٹا دیا گیا۔

اکھاڑہ گھدو شاہ

اسے بھائیوں کا اکھاڑہ بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ اس کے خلیفوں میں حکیم بھائی گلاب سنگھ اور حکیم ماتھو سنگھ بڑے مشہور گزرے ہیں۔ یہ اکھاڑہ سرکلر روڈ پر لوہاری دروازے اور موری دروازے کے درمیان تکیہ گھدو شاہ میں واقع ہے۔ جس طرح کھائی والا اکھاڑہ کالو والوں کا سب سے بڑا اکھاڑہ ہے اسی طرح یہ اکھاڑہ کوٹ والوں کا سب سے ممتاز اکھاڑہ ہے۔ اس میں ہندوستان اور پاکستان کے مشہور پہلوان ورزش کرتے رہے ہیں جن میں مندرجہ ذیل بہت مشہور تھے۔

اپ لون پہلوان کے خاندان کے فرد تھے۔ دس پندرہ برس کی عمر میں آپ نے پہلی کشتی لڑی اور حریف کو پچھاڑ دیا۔ اس کے بعد مرتے دم تک دنیا کے کسی پہلوان نے آپ کو شکست نہیں دی۔

اور آپ کی پیٹھ زمین سے نہیں لگائی۔ جسم لوہے کی طرح سخت تھا اور طاقت اور شجاعت میں بے مثال تھا۔ ۱۹۱۱ء میں ایک غیر ملکی آپ کو آپ کے چھوٹے بھائی امام بخش کو اپنے ساتھ یورپ لے گیا۔ اٹلی اور فرانس میں کوئی پہلوان آپ کے سامنے نہ آیا۔ پھر لندن آ گئے۔ ان دنوں لندن میں دنیا بھر کے شہ زور پہلوان جمع تھے۔ مثلاً ترکی کا رستم محمود، امریکی پہلوان رولینڈ، اطالوی رستم جان لیمب، انگلستان کا رستم ہاک اسمتھ اور روسی دیوزبسکو۔ جب گاماں پہلوان نے چیلنج کیا تو ان پہلوانوں نے کہا کہ پہلے تم ہمارے چھوٹے پہلوانوں سے لڑو۔ رستم زماں گاما نے اعلان کر دیا کہ جو پہلوان مجھ سے پانچ منٹ تک کشتی لڑے گا۔ اس کو پانچ پاؤنڈ انعام ملے گا۔ چنانچہ گلاسگو، لورپول اور مانچسٹر میں چالیس کشتیاں ہوئیں مگر کوئی مائی کا لال رستم زماں گاما کو نہ پچھاڑ سکا۔ بعد میں آپ نے امریکن پہلوان رولینڈ سے کشتی لڑی اور چند منٹوں میں اسے گرا لیا۔ باقی پہلوان کنی کترا گئے۔ البتہ روسی پہلوان زبسکو مقابلے پر آ گیا۔ یہ بڑی تاریخی کشتی تھی۔

دو پہاڑ جیسے ایک دوسرے کو گرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ تین گھنٹے کشتی ہوئی۔ ایک گھنٹے تک دونوں شہ زور کھڑے کھڑے زور آزمائی کرتے رہے۔ پھر گاما نے زبسکو کو نیچے گرا کر دو گھنٹے تک خوب رگیدا۔ جب زبسکو نے کہا میں تھک گیا ہوں اور ایک ہفتے بعد لڑوں گا تو کشتی چھڑا دی گئی، لیکن وقت پر زبسکو نہ آیا اور گاما کو رستم زماں کا گرز اور طلائی پیٹی دے دی گئی۔ ان کشتیوں کو انگلستان میں لاکھوں انسانوں نے دیکھا اور گاما رستم زماں کی طاقت اور مہارت کی دھاک بیٹھ گئی۔ کئی سال بعد پٹیالے میں زبسکو پھر گاما سے نبرد آزما ہوا۔ گاما نے صرف دو منٹ میں اسے پچھاڑ دیا۔ اس فتح کی خوشی میں مہاراج پٹیالہ نے بہت سے قیدی رہا کر دیے اور بے شمار لوگوں کو کھانا کھلایا۔ گاما پہلوان ریاست پٹیالہ کے درباری پہلوان بن گئے اور قیام پاکستان تک اسی دربار سے وابستہ رہے۔ انہوں نے بے شمار کشتیاں لڑیں اور کئی پہلوانوں کو پچھاڑا۔ پاکستان بن جانے کے بعد آپ لاہور میں مقیم ہو گئے۔ یہاں انہیں ایک زہریلے سانپ نے کاٹ لیا مگر وہ اپنی غیر معمولی صحت کی وجہ سے سانپ کے زہر سے بچ گئے۔ آپ کا انتقال ۲۳ مئی ۱۹۶۰ء میں ہوا۔ آپ قبرستان پیر مکی میں دفن ہیں۔ وفات کے وقت آپ کی عمر اسی برس تھی۔

امام بخش پہلوان رستم ہند۔ آپ رستم زماں گاما پہلوان کے چھوٹے بھائی تھے۔ آپ بھی چھوٹی سی عمر میں کشتی لڑنے لگے تھے اور اپنے بھائی کے ساتھ یورپ کے دورے پر گئے تھے۔

لندن میں آپ نے اطالوی لیمب کو تین منٹ میں چت کر دیا تھا۔ آپ دیو ہیکل پہلوان تھے۔ چہرہ اتنا بارعب تھا کہ صرف دیکھنے سے ہی دوسرے پہلوان پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ آپ نے حسن بخش ملتانی، رحیم سلطانی والا کو گرایا۔ آپ نے پنجاب اور ہندوستانی ریاستوں کے تقریباً سبھی پہلوانوں سے مقابلہ کیا اور کمال فن کا مظاہرہ کیا۔ گونگا پہلوان سے تین مرتبہ کشتی لڑی۔ پہلی مرتبہ لاہور میں گر پڑے، لیکن دوسری اور تیسری دفعہ لاہور اور پٹیالے میں گونگا پہلوان کو پچھاڑ دیا۔ آپ بھی گاما پہلوان کی طرح قیام پاکستان تک ریاست پٹیالہ سے منسلک رہے۔ نہایت شریف اور مرنجاں مرنج انسان تھے۔ آپ میں ایک بہادر آدمی کی تمام خصوصیات موجود تھیں۔ بہادر آدمی بہادر حریف کی تعریف کرتا ہے۔ گونگا پہلوان آپ کا حریف تھا تین مرتبہ کشتی لڑ چکا تھا۔ ایک مرتبہ آپ کو گرا بھی چکا تھا۔ لیکن جب بھی کسی نے آپ سے گونگے کے متعلق پوچھا۔ آپ نے ہمیشہ اس کی شہ زوری کی تعریف کی۔ ایک مرتبہ ہم لاہور میں گونگے پہلوان اور بالہڑ پہلوان کی کشتی دیکھ رہے تھے۔ امام بخش پہلوان اور حمیدہ پہلوان ہمارے پیچھے بیٹھے تھے۔ کشتی شروع ہوئی تو امام بخش کے منہ سے بے اختیار نکلا:

''جیو میرے پہلوان جیو۔ ارے حمیدہ دیکھ گونگا پہلوان کیا کہہ رہا ہے۔''

اس سے آپ کے دل کی کشادگی کا پتہ چلتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بھولو، اچھا، اکی، گوگا اور اعظم جیسے دیو پیکر فرزند عطا کیے جنہوں نے اپنے خاندان کا نام روشن کیا۔

جیجا پہلوان گھسیٹے والا۔ یہ گاما پہلوان کے شاگرد تھے اور شیر کا دل رکھتے تھے اور یوں بھی بڑے حسین پہلوان تھے۔ بڑے دل گردے سے کشتی لڑتے تھے۔ دنوں میں آسمان شہرت پر جا پہنچے اور آپ نے غوثیہ پہلوان، کریم پہلوان اور کئی دوسرے بڑے پہلوانوں کو پچھاڑ دیا۔ آپ نے بھی کئی ریاستوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ افسوس کہ آپ عین عالم شباب میں داغ مفارقت دے گئے۔

اکھاڑہ بندر شاہ

یہ اکھاڑہ بندر شاہ کے تکیے میں تھا جو موچی دروازے کے باہر احاطہ نواب صاحب کے قریب تھا۔ آج وہاں مکان بن گیا ہے صرف ایک قبر باقی رہ گئی ہے۔ اس اکھاڑے میں بھی اچھے

اچھے پہلوان ورزش کیا کرتے تھے۔ جن میں سے چراغ عالی والا بہت مشہور گزرا ہے۔

اکھاڑہ خلیفہ حسینا

یہ اکھاڑہ دل محمد روڈ پر واقع تھا۔ اب وہاں ایک فونڈری بن گئی ہے۔ اس اکھاڑے نے بھی نامی گرامی پہلوان پیدا کیے۔ جن میں مندرجہ ذیل مشہور ہیں۔

خلیفہ معراج دین پہلوان۔ آپ پاکستان کے نامی پہلوان غلام محی الدین کے بڑے بھائی تھے۔ بدن کی تیاری کا یہ عالم تھا کہ ان کے متعلق آج تک مشہور ہے کہ چوتھے روز جانگیہ تبدیل کر دیا کرتے تھے۔ آپ چراغ پہلوان کے شاگرد تھے اور ریاست جونا گڑھ کے درباری پہلوان تھے۔ آپ نے کئی پہلوانوں کو پچھاڑا۔ اکبری دروازے کے باہر جہاں اب پولیس چوکی ہے یہاں ایک سرائے ہوا کرتی تھی۔ اسی سرائے میں آپ نے ایک دنگل میں اس عہد کے مشہور پہلوان گامو بالی والے کے ساتھ کشتی لڑی جس کو آپ نے دومنٹ میں چت کر لیا۔

خلیفہ غلام محی الدین۔ آپ نورے والے اکھاڑے کے بانی خلیفہ نورا مرحوم کے قرابت دار ہیں اور اس اکھاڑے کے سب سے بڑے خلیفہ ہیں۔ آج کل جبکہ کشتی کا فن دم توڑ رہا ہے آپ کا دم غنیمت ہے۔ آپ اس فن کے ماہر مانے جاتے ہیں اور لاہور کے تینوں اکھاڑوں کے پہلوان آپ کی خداداد قابلیت کے معترف ہیں۔ اچھے اچھے پہلوان آپ کے شاگرد ہیں۔ مشہور مرہٹہ پہلوان بابرو کولہا پوری بھی آپ ہی کا شاگرد تھا۔ آپ کے پاس تقریباً تمام بڑے پہلوانوں کی تصویریں اور ان کی کشتیوں کی یادداشتیں محفوظ ہیں۔ آپ کے پاس رمزی پہلوان کی صدری اور دیگر نوادرات بھی موجود ہیں۔

آپ اپنے زمانے کے شہ زور پہلوان تسلیم کیے جاتے ہیں۔ آپ مہاراجہ دتیہ۔ نواب جونا گڑھ اور مہاراجہ کولہا پور کے درباروں سے وابستہ رہے ہیں۔ آپ نے یورپ کی سیاحت بھی کی۔ لندن کی نمائش میں تینوں کشتیوں میں فتح پائی۔ فرانس بورڈو کے مقام پر ایک مشہور فرانسیسی پہلوان کو گرایا۔

چراغ پہلوان عالی والا۔ بہت نامور پہلوان تھے۔ مہاراجہ جودھ پور کے دربار سے وابستہ تھے۔ آپ نے کئی کشتیاں لڑیں جن کی وجہ سے بڑا نام کمایا۔ امرتسر کے مشہور غلام پہلوان سے آپ

کی کشتی ریاست جودھ پور میں ہوئی۔ اس زمانے میں چراغ پہلوان اپنی عمر کے آخری منزلوں میں تھے اور غلام پہلوان بھرپور جوان تھے۔ اس کے باوجود چراغ پہلوان بڑی چابکدستی سے لڑے اور کشتی برابر رہی۔

اکھاڑہ تکیہ نتھے شاہ

اسے گوندی والا اکھاڑہ بھی کہتے ہیں۔ بالکل نیا اکھاڑہ ہے۔ اسے فرید پینٹر پہلوان نے قائم کیا ہے۔ اس میں بڑے بڑے اچھے پہلوان ورزش کرتے ہیں اور کئی معرکے کے دنگلوں میں اپنے حریفوں کو پچھاڑ چکے ہیں۔ ان پہلوانوں میں شیر پنجاب کالا پہلوان، عاشق راج پہلوان، رشید انواں بازار والا بہت مشہور ہیں۔ کالا پہلوان نے اچھا گوجرانوالیہ، اکی پہلوان اور غلام محی الدین پہلوان کو چاروں شانے چت گرایا تھا۔

اکھاڑہ تکیہ کھوتیاں والا

یہ بھی بہت پرانا اکھاڑہ ہے اور بل روڈ پر واقع ہے۔ اس اکھاڑے میں بھی اچھے اچھے پہلوان زور کرتے ہیں جن میں سے گلو پہلوان صدیق پہلوان اور بانجی پہلوان بہت زیادہ مشہور ہیں۔

اکھاڑہ چوک برف خانہ

یہ اکھاڑہ ریلوے روڈ پر واقع ہے۔ اس میں بھی نامی گرامی پہلوان ورزش کرتے رہے ہیں جن میں یہ پہلوان زیادہ مشہور ہوئے۔

بدو پہلوان برہمن۔ آپ ہندوؤں کے بہت نامور پہلوان تھے۔ برہمن تھے مگر بڑے جیالے۔ گورا چٹا مضبوط جسم تھا۔ آپ نے بھی بڑے نامی پہلوانوں سے مقابلہ لڑا اور فتح پائی۔

مہا جابالاتی والا۔ اپنے زمانے کے بہترین پہلوانوں میں شمار ہوتے تھے اور شجاعت، لڑنت اور داؤ پیچ کے ماہر مانے جاتے تھے۔ آپ نے بھی اچھے اچھے حریفوں کو پچھاڑا تھا۔ کچھ عرصہ بعد آپ اکھاڑہ بنو پہلوان شاہ عالمی دروازے میں ورزش کرنے لگے تھے۔

اکھاڑہ گھبا سامیں رام گلی

یہ اکھاڑہ نورے والوں کا مشہور اکھاڑہ ہے۔ اس میں بھی نامی پہلوان ورزش کرتے رہے ہیں۔ پرانے پہلوانوں میں سلطان پہلوان شوخا مشہور ہیں۔ آج کل اس اکھاڑے میں ان کے پٹھے ورزش کرتے ہیں۔ ایک نام اسلم مہنی والا اور دوسرے کا نام افضل مہنی والا ہے۔

دونوں کشتی کے فن میں بڑے تاک ہیں اور خوب لڑتے ہیں۔ دونوں نے کئی دنگلوں میں اپنے فن کے کمال دکھائے ہیں۔

اکھاڑہ چنن کبابی مصری شاہ

مصری شاہ میں سفید مسجد کے پاس یہ اکھاڑہ واقع ہے۔ چنن پہلوان کبابی اس اکھاڑے کے مشہور و معروف پہلوان گزرے ہیں۔ جیجا گھسیٹے والا مرحوم بھی کچھ عرصے یہیں ورزش کیا کرتا تھا۔

اکھاڑہ بوٹامل

نورے والوں کا سب سے ممتاز اکھاڑہ ہے۔ یہ اکبری دروازے کے باہر واقع ہے۔ یہی وہ اکھاڑہ ہے جس کے شہ زور پہلوانوں نے کالو اور کوٹ والوں کے نامی گرامی پہلوانوں کے ساتھ مقابلے کیے ہیں اور نورے والوں کا نام روشن رکھا ہے۔ پنجاب کے اکثر پہلوان اس اکھاڑے میں ورزش کیا کرتے رہے ہیں۔ جن میں ذیل کے نام بڑے مشہور ہیں۔

کریم بخش پہلوان پیلڑے والا۔ آپ پیلڑے پہلوان کے فرزند تھے جسم اور ڈیل ڈول نہایت متناسب تھا۔ آپ تعلیم یافتہ پہلوان تھے۔ پہلوانی کے فن میں ماہر اور اس کی فنی باریکیوں سے خوب واقف تھے۔ نورے والوں کے اکثر پٹھے آپ ہی کے شاگرد ہیں۔ آپ نے پنجاب کے نامی گرامی پہلوانوں سے کشتیاں لڑیں۔ آپ نے چنن پہلوان قصائی، گاموں پہلوان بالی والا اور غلام پہلوان امرتسری کو پچھاڑا۔ ہندوستانی ریاستوں کے دنگلوں میں اپنے حریفوں کو گرا کر انعام و کرام حاصل کیا۔ پھر خود ہی اپنی مرضی سے کشتی لڑنا ترک کر دیا۔ خان بہادر میاں محمد تقی مرحوم بھی

آپ کے شاگردوں میں سے تھے۔ مرحوم خان بہادر پہلوانی کے بڑے دلدادہ تھے۔

پروفیسر رام مورتی جو خود بھی ایک اچھے پہلوان تھے۔ بھماں چوڑ یگر کی بڑی عزت کرتے تھے۔ آپ نے زندگی کا بیشتر حصہ لاہور سے باہر ریاستوں میں بسر کیا۔ اور نام پیدا کیا۔

بسا پہلوان

آپ بھی اس اکھاڑے کے نامی پہلوان ہیں۔ تن وتوش اور بہادری میں جواب نہیں رکھتے۔ عالم شباب میں بڑے قوی ہیکل پہلوان تھے۔ آپ نے پنجاب اور ریاستوں کے کئی پہلوانوں سے کشتی لڑی اور اپنے اکھاڑے کا نام بلند کیا ہے۔

غلام محمد قلعی گر اور بڈھا ساون والا

یہ دونوں پہلوان ان کے بڑے ہونہار شاگردوں میں سے تھے۔ بڈھا ساون والا نے چنن قصائی کو پچھاڑا تھا۔

اللہ بخش سائیں والا

بڑے نامی پہلوان تھے۔ پہلے گاما پہلوان کے شاگرد تھے۔ پھر کریم بخش پیلڑے کے شاگرد ہوئے۔ آپ نے پنجاب اور ریاستوں کے اچھے اچھے پٹھوں کو چاروں شانے چت گرایا۔ ابھی جوان ہی تھے کہ اس فن سے کنارہ کش ہو گئے۔ پھر سنا گیا کہ فقیر ہو گئے ہیں۔

بھماں پہلوان چوڑیگر

اس اکھاڑے کو اس بے مثال پہلوان پر جس قدر ناز ہو کم ہے۔ آپ نہایت مضبوط اور خوبصورت جسم رکھتے ہیں۔ پنجاب اور ریاستوں کے کئی نامی گرامی پہلوانوں سے کشتی لڑ کر انہیں چت کر چکے ہیں۔ اہل لاہور آپ کے بے حد قدردان ہیں۔ آج بھی ان مقابلوں کو یاد کرتے ہیں جو بھماں پہلوان اور جمال چنگڑ پہلوان کے درمیان ہوئے تھے۔ اکھاڑہ نتھے شاہ کے خلیفہ چنن کے انتقال کے بعد بھماں پہلوان کو ان کا جانشین مقرر کیا اور رسم دستار بندی بھی ہوئی۔

لالہ راج پری پیکر، آپ بھی اس اکھاڑے کے ممتاز پہلوان تھے۔ جسم کی خوبصورتی کی وجہ سے پری پیکر کہلوائے۔ داؤ پیچ میں مہارت حاصل تھی اور ملتانی داؤ تو خوب چلاتے تھے۔ حریف کو اس داؤ کی وجہ سے چشم زدن میں پچھاڑ دیتے تھے۔ عین عالم شباب میں کشتی لڑنا ترک کر دیا تھا۔

اکھاڑہ لالو سائیں

یہ اکھاڑہ مستی دروازہ اور کشمیری دروازہ کے درمیان تکیہ لالو سائیں میں واقع ہے۔ غوثیہ پہلوان اسی اکھاڑے میں ورزش کرتے رہے ہیں۔ آپ نے بھی پنجاب اور ریاستوں میں اپنے فن کا بڑا کامیاب مظاہرہ کیا اور انعام واکرام حاصل کیا۔

اکھاڑہ خلیفہ بخشی

شاہ عالمی دروازہ کے باہر لاریوں کے اڈے کے قریب واقع تھا۔ اب یہاں یہ اکھاڑہ نظر نہیں آتا۔ بنو پہلوان اس اکھاڑے کے مشہور پہلوان ہوئے ہیں۔

اکھاڑہ بالمیکیاں بیرون ٹکسالی

خلیفہ دتا، خلیفہ باڑی، چراغ مکھن والا اس اکھاڑے کے مشہور خلیفہ تھے۔ چراغ مکھن والا۔ لال پہلوان۔ کالو پہلوان۔ بکھا پہلوان۔ حیاتا پہلوان۔ چاغو پہلوان اس اکھاڑے کے پہلوان تھے۔ ان بالمیکی شہ زوروں نے اچھے اچھے پہلوانوں سے کشتی لڑی۔ مثلاً چراغ مکھن نے ٹونڈی سے، لال پہلوان نے کھیڑی پہلوان سے، کالو پہلوان نے ملکی پہلوان سے، بکھا پہلوان نے خلیفہ شہاب سے، حیاتا پہلوان نے نانک پہلوان امرتسری سے اور چاغو پہلوان نے آتو پہلوان سے کشتی لڑی تھی۔

اکھاڑہ بالمیکیاں بیرون بھاٹی دروازہ

اس اکھاڑے کے پہلے خلیفہ بودی تھے۔ پھر نجہ ہوئے۔ اس اکھاڑے کے جو نامی پہلوان ہوئے ان کے نام یہ ہیں: لبھا پہلوان، دتا پہلوان، دین پہلوان، پیرانڈتہ پہلوان۔

(مندرجہ بالا اکھاڑوں کی تفصیلات اور معلومات کے لیے میں خاص طور پر محترم سراج نظامی کا ممنون احسان ہوں۔)

اکھاڑوں کے علاوہ لاہور کے تکیوں کی بھی بڑی اہمیت رہی ہے۔ یہ تکیے آرام گاہیں بھی ہوتی تھیں جہاں تھکے ہارے مسافر دوپہر کو آ کر آرام کرتے۔ ہر تکیے میں ایک کنواں اور بڑ کا گھنا درخت ضرور ہوتا۔ کنویں کے ساتھ سقادے بھی ہوتے تھے۔ جہاں کنویں کے ٹھنڈے پانی سے غسل کیا جاتا تھا۔ پہلوان لوگ اور ورزش کے شوقین نوجوان اکھاڑے میں ورزش کرنے کے بعد انہی غسل خانوں میں یعنی سقادوں میں نہاتے ہیں۔ لوگ سر شام یا گرمیوں کی دوپہروں میں درخت کی چھاؤں تلے بیٹھ کر شطرنج اور چوسر وغیرہ بھی کھیلتے ہیں۔ لاہور میں بہت سے تکیے ہیں مگر ان میں بیشتر کا ذکر مندرجہ بالا اکھاڑوں کے ساتھ آ چکا ہے۔ اس لیے ان کا دوبارہ ذکر کرنا مناسب نہیں لگتا۔

لاہور کے لوگوں کی خوش خوراکی بھی بہت مشہور ہے۔ یہاں کے ناشتے، نہاری اور سری پائے بے مثال ہیں۔ اہل لاہور اور خاص طور پر اندرون لاہور میں بیشتر لوگ صبح کا ناشتہ سردیوں میں سری پائے اور گرمیوں میں حلوہ پوری اور لسی سے کرتے ہیں۔ دفتر یا ورکشاپ میں جانے کے لیے گھروں سے تیار ہو کر نکلتے ہیں اور دودھ دہی کی دکان پر آ کر حلوہ پوری کھاتے ہیں اور باہر کھڑے کھڑے لسی کا گلاس چڑھا کر دفتروں کو روانہ ہو جاتے ہیں۔ لاہور کی لسی اور سری پائے خاص خاص علاقے کے بڑی شہرت رکھتے ہیں۔ مثلاً موچی دروازے کی لسی اور حلوہ پوری کا پاکستان بھر میں کہیں جواب نہیں۔ گرمیوں میں یہاں ٹھنڈا فالودہ بھی ملتا ہے جو عام طور پر دوپہر ڈھلنے کے بعد پیا جاتا ہے۔

موچی دروازے میں شیدے حلوائی کی دکان لسی کے لیے بہت مشہور ہے اسے دہی لگانے میں کچھ ایسی مہارت حاصل ہے کہ اس پر پاؤ کا بٹہ رکھ دیں اوپر ہی رہے گا۔ دہی کا رنگ سبزی مائل ہوتا ہے اور اس کی لسی بہت گاڑھی بنتی ہے۔ شہر کے اندر ایک محلے میں کسی زمانے میں ایک بڑا طرح دار اور وضع دار حلوائی ہوا کرتا تھا۔ اس کی عادت تھی کی لسی ڈوبچی میں سے گلاس میں ڈال کر ہاتھ گاہک کی طرف بڑھاتے ہوئے منہ دوسرے گاہک کی طرف کر کے اس سے پوچھتا کہ کیا بناؤں آپ کے لیے۔ اس دوران اگر پہلے والے گاہک نے لسی کا گلاس نہیں پکڑا تو حلوائی لسی سے

بھرا ہوا گلاس ہاتھ سے چھوڑ دیتا تھا۔ گھروں سے چھوٹے بچے پیالیوں میں دونی ڈال کر دہی لینے آتے۔ اس کی دکان پر اتنا رش ہوتا تھا کہ طرح دار حلوائی کو پیالی میں سے دونی نکالنی یاد نہیں رہتی تھی اور دہی کے ساتھ دونی بھی گھر میں پہنچ جاتی تھی۔

ایک بار میرا ایک بڑا وہمی شاعر دوست میرے ساتھ اس حلوائی کے پاس لسی پینے آیا۔ اصل میں اسے میں لے آیا تھا۔ میں حلوائی کی طبیعت سے واقف تھا۔ میں نے اپنے شاعر دوست سے کہہ دیا تھا کہ دکاندار ایماندار ہے۔ اصل چیز بیچتا ہے۔ اس لیے کسی کے ناز نخرے برداشت نہیں کرتا۔ ہم دکان پر گئے۔ میں نے دکاندار سے لسی بنانے کے لیے کہا۔ وہ لسی بنا کر گلاس میں ڈالنے لگا تو میرے شاعر دوست نے کہہ دیا:

"پہلوان جی! ذرا اس گلاس کو دوبارہ دھولیں۔"

اس پر حلوائی صاحب کی طبیعت میں جلال آ گیا۔ فرمایا:

"لسی نہیں ہے۔ کسی دوسری دکان پر جائیں۔"

موچی دروازے کے حلوہ پوری کی خوشبو تو صبح کے وقت سارے علاقے میں پھیلی ہوتی ہے۔ یہاں کے نان بھی لاجواب ہوتے ہیں۔ نانوں کا خمیر خدا جانے کس فارمولے کے تحت تیار کیا جاتا ہے کہ تنور سے نکلے ہوئے نان کو چاہے لحاف کے اندر ایک گھنٹے تک رہنے دیں اس کی تر و تازگی اور خستگی میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ قیمے والا قتلمہ تو یہاں لوگ دور دور سے کھانے اور لے جانے کے لیے آتے ہیں۔

سری پائے بیڈن روڈ میر یاسین کے بہت مشہور ہیں۔ یاسین کا تعلق امرتسر سے ہے اور امرتسر کے لوگ ویسے بھی کھانے پینے کے بے حد شوقین ہوتے ہیں۔ لاہور والے اس معاملے میں امرتسریوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ یاسین جو سرے پائے تیار کرتا ہے۔ ان کی لذت اپنا جواب آپ ہی ہے۔ سری پائے گوالمنڈی میں بھی بڑے اچھے بنائے جاتے ہیں۔ یہ ناشتہ ہی اصل میں نہاری ہوتی ہے۔ لاہور میں دلی والی نہاری کا زیادہ رواج نہیں تھا۔ اس نہاری کو فروغ دلی سے آنے والوں نے دیا اور اس کا مرکز پرانی انارکلی ہے۔ امرتسریوں نے لاہور میں صبح کے ناشتے کے لیے ہریسے کا بھی تعارف کروایا۔ ہریسہ کشمیری ڈش ہے اور گوشت کو پیس کر بنایا جاتا ہے۔ اس میں ماش کی دال بھی شامل ہوتی ہے اور قسم قسم کے مسالے اور زعفران ڈالا جاتا ہے۔ لاہور میں اس وقت

نسبت روڈ پر ایک امرتسری کشمیری کی دکان ہی ہے جہاں آپ کو ناشتے کے وقت بہترین ہریسہ مل جائے گا۔ ہریسے کو وہیں گھی کا تڑکا لگا کر اوپر دو تین سیخ کباب رکھ دیے جاتے ہیں۔ اصل میں ہریسے کا بڑا رکھ رکھاؤ ہوا کرتا تھا۔ مگر اب تیز رفتاری کا دور ہے۔ لوگ کاروں میں آتے ہیں اور ڈشوں میں ہریسہ ڈلوا کر لے جاتے ہیں۔ قلچہ ہریسے کا جز ہے۔ قلچے بھی گوالمنڈی میں امرتسری ہی بہترین لگاتے ہیں۔ انہیں خوب معلوم ہے کہ گردا کیا ہوتا ہے۔ تافتانہ کیا ہوتا ہے اور قلچے اور گردے میں کیا فرق ہوتا ہے۔

چوک رنگ محل میں بہترین نہاری ملتی ہے۔ یہاں بڑے پائے بھی صبح کے وقت مل جاتے ہیں۔ لیکن اگر آپ بہترین ناشتہ کرنا چاہتے ہیں تو آپ یا بیڈن روڈ پر یاسین کی سری پائے کی دکان پر آئیں جہاں آپ کو لذیذ ترین سری پائیوں کے ساتھ حلوہ پوری بھی کمال کا ملے گا۔ حلوہ ایسا ہوگا کہ جیسے سونا کتر کتر کر تھال میں جمع کر دیا ہے یا پھر آپ گوالمنڈی میں آجائیں۔ یہ دونوں جگہیں امرتسری کشمیریوں کے گڑھ ہیں اور یہاں آپ کو ہریسہ بھی ملے گا۔ سری پائے بھی، لسی بھی اور حلوہ پوڑی بھی ملے گا۔ قلچے کے ساتھ سری پائے کھانے کے بعد آنکھوں میں خماری سی آجاتی ہے اور آدمی دوپہر تک بھرا بھرا رہتا ہے۔ یہاں آپ کو ناشتے کے وقت تل والے ایسے ایسے قلچے اور تافتانے ملیں گے کہ جنہیں دیکھ کر آدمی دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ ایک بار ہم گوالمنڈی کی ایک دکان پر سری پائے کا ناشتہ کر رہے تھے۔ یہ دکان ہمارے ایک امرتسری دوست کی تھی۔ اس نے دیگچے میں سری پائے نکال کر پلیٹ میں ڈالے اور ہماری طرف دیکھ کر کہنے لگا:

"خواجہ! بس پلیٹ میں انگریز میمیں ڈال دی ہیں۔"

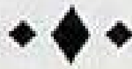
جو ایک بار لاہور کے ان علاقوں میں بیٹھ کر ناشتہ کر لیتا ہے پھر وہ کوئی دوسرا ناشتہ پسند نہیں کر سکتا۔ سری پائے ہیرامنڈی کے بھی بہترین ہوتے ہیں اور یہاں کے سری پائے کا ناشتہ کرنے باہر سے بھی لوگ آتے ہیں۔ لاہور والوں کی خوش خوراکی ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں لوگوں گرمیوں میں باغ سیر کرنے کے بھی بڑے شوقین ہیں۔ میلوں پر تو عام جاتے ہیں اور کھانا وغیرہ بھی میلے میں ہی جا کر پکاتے ہیں۔

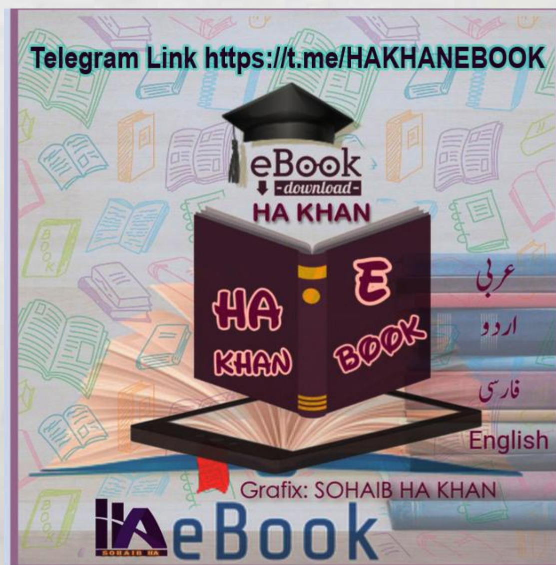
ایک بار لاہور کے کچھ دوستوں نے باغ سیر کا پروگرام بنایا۔ میں بھی ان میں شامل تھا۔ ہم نے باغ سیر کے لیے نہر کا ایک پرسکون علاقہ منتخب کیا اور وہاں ساز و سامان لے کر پہنچ گئے۔ ہمارا

پروگرام اس جگہ مرغ وغیرہ روسٹ کرنے کا تھا۔ ایک پکانے والے باورچی کو ساتھ لے لیا تھا۔ دو تین موسیقار دوست بھی ہمارے ساتھ ہی تھے۔ باورچی بھی بھاٹی دروازے کا تھا وہ مرغ روسٹ کرنے میں مصروف ہو گیا۔ صبح سے دوپہر تک ہم نہر میں نہاتے رہے۔ پھر درختوں کے نیچے دریوں پر بیٹھ گئے۔ ہارمونیم چھڑ گیا۔ ہمارے موسیقار دوستوں نے باری باری گاتے سنائے۔ مرغ روسٹ کی خوشبوئیں اڑنے لگی تھیں۔ روغنی نان ہم نے گوالمنڈی سے لگوا کر ساتھ رکھ لیے تھے۔ کھانا کھل گیا تو جیسے جان میں جان آ گئی۔ باورچی نے اتنا لذیذ مرغ روسٹ تیار کیا تھا کہ بس کمال ہی کر دیا تھا۔ ہم چھ سات دوست تھے مگر مرغ کچھ زیادہ ہی تیار ہو گئے۔ کھا پی کر باورچی کا حصہ دے کر، اس کے بال بچوں کا حصہ نکال کر بھی دس پندرہ روسٹ مرغ بچ گئے۔ ہم سوچنے لگے کہ ان کا کیا کریں؟ ہمارے موسیقار دوست نے کہا:

"انہیں امانت کے طور پر دو دن کے لیے زمین میں دفن کریں۔ انہیں کچھ نہیں ہوگا۔ پرسوں آ کر نکال لیں گے۔"

یہ تو خیر مذاق کی بات تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اہل لاہور کے ناشتے، کھانے اور دعوتوں کے کھانے تو ایسے ہوتے ہیں کہ جو ایک بار کھاتا ہے ساری زندگی نہیں بھولتا۔





لاہور کا چیلسی بھاٹی دروازہ

یہ زیادہ دنوں کی بات نہیں ہے۔

آج سے چند سال پہلے ریڈیو پاکستان لاہور، شاعروں، ادیبوں اور موسیقاروں کی تخلیقی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ کچھ ممتاز شاعر اور ادیب ریڈیو اسٹیشن پر بطور اسٹاف آرٹسٹ کام بھی کرتے تھے۔ محکمے کی جانب سے انہیں کچھ مدت کا کنٹریکٹ مل جاتا تھا جس کی تجدید ہوتی رہتی تھی۔ انہیں پکے سرکاری ملازموں والی سہولتیں میسر نہیں تھیں لیکن ان شاعروں ادیبوں کو اس قسم کی سہولتوں کی پرواہ کم ہی ہوتی تھی۔ ان میں، میں بھی شامل تھا۔ ہم لوگ صرف اسی بات پر بڑے خوش تھے کہ روز شاعر ادیب دوستوں سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ کینٹین میں بیٹھ کر اکٹھے چائے پیتے ہیں، باتیں کرتے ہیں، باغیچے میں کھلے ہوئے گلاب کے پھولوں کو قریب جا کر دیکھتے ہیں۔ ہمیں سب پتہ تھا کہ ریڈیو اسٹیشن کی کینٹین کے آگے جو بیری کا درخت ہے اس پر کب بیر لگتے ہیں، کب طوطے انہیں کتر کتر کر نیچے پھینکتے رہتے ہیں اور کب لال لال بیر پک جاتے ہیں۔ پاک ٹی ہاؤس میں غزل پڑھی جاتی تھی مگر ریڈیو اسٹیشن پر میوزک بھی تھا۔ یہاں غزل گائی بھی جاتی تھی۔ یہاں امانت علی خان کے ساتھ صرف باتیں ہی نہیں ہوتی تھیں بلکہ وہ ریڈیو اسٹیشن کے میوزک اسٹوڈیو میں پیانو کے ساتھ بیٹھ کر ''یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے'' غزل کی طرز بھی بناتا تھا۔ آرٹسٹوں، شاعروں اور ادیبوں کی وجہ سے ریڈیو اسٹیشن میں ایک ادبی فضا ہر وقت چھائی رہتی تھی۔ پھر ایسا ہوا کہ محکمے نے ادیبوں، شاعروں کو کنٹریکٹ دینے بند کر دیے جو شاعر ادیب بطور اسٹاف آرٹسٹ کام کرتے تھے۔ انہیں بھی جواب دے دیا گیا۔ میں پروڈیوسر بن کر مہنگائی الاؤنس، میڈیکل الاؤنس اور فائلوں اور ساتویں آٹھویں نویں گریڈوں کی باتیں کرنے والوں میں شامل ہو گیا۔ وہ میری باتیں نہیں سمجھتے تھے۔ ان کی باتیں میری سمجھ اور میرے مزاج سے باہر تھیں۔ مجھے یوں لگتا کہ میں کسی ویران جزیرے میں جلاوطن کر دیا گیا ہوں۔ اب میرا گزارا اپنے ادیب شاعر دوستوں کے ساتھ گزارے ہوئے حسین دنوں کی یادوں پر تھا۔ ستم ظریفی یہ ہوئی کہ سرکاری ملازم ہونے کی وجہ

سے میرے پاؤں میں کئی ایک زنجیر پڑ گئیں۔ ان میں سب سے زیادہ ناقابل برداشت زنجیر تبادلے کی تھی۔ یعنی بطور ریڈیو پروڈیوسر میرا کسی دوسرے شہر میں تبادلہ بھی ہو سکتا تھا۔ یہ ایسی ہی بات تھی کہ جیسے سنبل کے سرخ پھولوں والے درخت کو جڑ سے اکھاڑنے کی کوشش کی جائے۔ میں کھلے آزاد طوفانی سمندروں میں سفر کرنے والا سند باد جہازی چاندنی اور پھول دار بیلوں میں چھپی ہوئی گیلریوں کے نیچے چاندنی راتوں میں محبت کے گیت گانے والا مطرب تھا۔ آخر ایک دن میں نے یہ سب زنجیریں توڑ ڈالیں اور امریکہ بھاگ گیا۔ یہ ایک الگ کہانی ہے۔

آج میں صرف ان لوگوں کی باتیں آپ کو سنانا چاہتا ہوں جن کی باتوں میں سنہرے خوبصورت دنوں کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ جو یادوں کے دھندلے غبار اپنے ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ ریڈیو اسٹیشن لاہور میں آج بھی ایسے یادگار لوگ کبھی کبھی نظر آ جاتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر مجھے یوں لگتا ہے کہ یہ اپنے سائے ہیں جو اپنے وجود سے بچھڑ گئے ہیں۔ ان میں طاہر لاہوری بھی ہیں۔ جدی پشتی لاہور کے بھاٹی دروازے کے رہنے والے ہیں۔ ان کی لاہور کی یادیں میری یادوں سے بھی پرانی اور قیمتی ہیں۔ ایک مدت سے میری ان کی شناسائی ہے۔ لاہور کی قدیم وضع داری اور شرافت ان کی گفتگو لب و لہجے سے عیاں ہے۔ بڑے مشتاق نثر نگار ہیں۔ ہر قسم کا ریڈیو اسکرپٹ بڑی مہارت سے لکھ لیتے ہیں۔ پچھلے دنوں ان سے ریڈیو پر ملاقات ہوئی تو میں نے کہا طاہر صاحب آپ لاہور کے ایک تاریخی دروازے کی روشن روایات کے امین ہیں۔ کبھی بھاٹی دروازے کے بزرگوں، اپنے دوستوں اور ان لوگوں کی باتیں سنائیے جن کی وجہ سے حکیم احمد شجاع صاحب نے بھاٹی دروازے کو لاہور کا "چیلسی" لکھا تھا۔ میرے سوال پر طاہر لاہوری بڑے خوش ہوئے۔ آنکھیں روشن ہو گئیں۔ جیسے انہیں بہت کچھ یاد آ گیا ہو۔ ان کی دلچسپ گفتگو کا سلسلہ چل نکلا۔ کہنے لگے:

"..... حمید صاحب! لاہور دنیا کا ان خوش نصیب شہروں میں ہے جن پر علم و ادب، عقل و دانش، درس و تدریس ہنر مندی اور روحانی فیوض و برکات کے انوار کی بارش ہوتی رہتی ہے۔ لاہور شہر کی بستیوں، گلی کوچوں اور دروازوں میں بھاٹی اپنے کمال و جمال میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ اسے چیلسی کا نام دینے والے نے پورا انصاف کیا ہے۔ اس دروازے کی فصیل کے اندر علما، ادبا، شاعر، فنکار، موسیقار اور

دانش وروں کے پرچم لہرا رہے ہیں......"

میں نے اسی بھاٹی دروازہ کے اندر آنکھ کھولی۔ اس وقت گردوپیش کی فضا، ماحول محل وقوع آج کل سے بہت مختلف تھا۔ تحصیل بازار سے دروازہ بھاٹی گیٹ تک گلیاں، بازار، محلے، کوچے، مین بازار ایک دل کشا منظر پیش کرتے رہے ہیں۔ یہ علاقے آج بھی اسی شان کے ساتھ آباد ہیں۔ محلہ سمیاں، محلہ ستھاں، محلہ جلوٹیاں، میاں بھائیں، محلہ نیاریاں، محلہ پڑنگان، محلہ ذیلداراں، محلہ چومالہ، بازار حکیماں، اونچی مسجد، نور محلہ، محلہ جوگیاں، ٹھٹھی ملاحاں وغیرہ اپنے گلی کوچوں کے ساتھ مدتوں سے اپنی تمام رونقیں لیے اسی طرح آباد و شاد باد ہیں، مگر کہیں کہیں عمارتوں کے ناک نقشے کچھ بدل گئے ہیں۔ بھاٹی دروازے کے باہر کا حسن آبادی کی بے پناہ بھیڑ اور ٹریفک میں کھو گیا ہے۔ میرے بچپن کے زمانے میں بھاٹی دروازے کے باہر باغ میں پھولوں کی تروتازہ کیاریاں مہکا کرتی تھیں۔

بھاٹی دروازے کے باہر صرف ایک سینما ہاؤس تھا جسے میلا رام کا منڈوا کہتے تھے۔ چوک سے گزریں تو آگے حضرت علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ المعروف داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کا مقدس آستانہ ذکروفکر کی مدھم صداؤں میں دن رات روحانیت کی کرنیں بکھیرتا۔ دوسری جانب میلا رام کا کپڑے کا کارخانہ تھا۔ اس کارخانے کے ساتھ لال کوٹھی تھی جو کئی کنال پر پھیلی ہوئی تھی۔ اب وہاں کتب فروشوں کی دکانیں ہیں۔ کارخانے کی جگہ بڑے بڑے کاروباری مراکز بن گئے ہیں۔ لال کوٹھی کا کچھ حصہ سڑک میں شامل کر لیا گیا ہے۔ جہاں اب پائنٹ ہوٹل ہے وہاں لکڑی کوئلے کا ٹال ہوا کرتا تھا۔ اردگرد درخت، گھوڑوں کے اصطبل اور کچھ پرانی عمارتیں ہوا کرتی تھیں۔ بعد میں یہاں ونگٹن ٹاکیز اور پیراماؤنٹ ٹاکیز کے نام سے دو سینما بن گئے۔ بھاٹی دروازے کے باہر دونوں جانب سرکی اور ٹین کی چھتوں والی پرانی دکانیں ہوا کرتی تھیں۔ ان میں مٹی کے برتن بکتے تھے۔ پیراماؤنٹ سینما سے ذرا سے آگے بکرا منڈی تھی جہاں صبح و شام بھیڑیں فروخت ہوتی تھیں۔ دوسری طرف بھیجی شاہ کا تھیٹر ہوتا تھا جو سارا سال اس جگہ تھیٹر کے ڈرامے کرتا، صرف میلوں میں باہر جاتا اور پھر اسی جگہ آ کر خیمے لگا دیتا۔ سامنے ٹمٹموں اور لاہوری تانگوں کا اڈا تھا۔ یہاں سے ٹمٹمیں...... سانده، اچھرہ، نواں کوٹ اور دوسرے دیہاتوں کو جاتی تھیں۔ تانگے سرکلر روڈ پر ریلوے اسٹیشن اور دہلی دروازے کی طرف چلتے تھے۔ سلطان پورہ، چاہ میراں، کوٹ خواجہ سعید

اور دوسرے کئی چھوٹے موٹے دیہات تھے۔ شالیمار باغ کے میلہ چراغاں کی دھوم پورے برصغیر میں تھی۔ امرتسر جالندھر، لدھیانے اور دلی تک سے لوگ اس میلے میں شریک ہونے کے لیے آتے تھے۔ باغ، نہر اور باولیاں لاہور شہر کی فصیل کے گرداگرد بنی ہوئی تھیں۔ اس وقت لاہور کی آبادی ڈھائی لاکھ سے زیادہ نہ تھی۔ سڑکوں پر صرف تانگے چلتے تھے۔ موٹریں سارے شہر میں صرف چند لوگوں کے پاس تھیں جن کا اس طرف گزر کم ہوتا تھا۔ لوگ اپنی سائیکلوں کو دلہن کی طرح سجاتے، بھاٹی دروازے کا باغ بڑا کشادہ تھا۔ اس کے درمیان ایک نہر بہتی تھی۔ ہم اس نہر میں چھلانگیں لگاتے۔ عورتیں نہر پر کپڑے بھی دھوتیں تھیں۔ جب عورتوں کے نہر پر کپڑے دھونے کا وقت ہوتا تو لوگ اس طرف سے کم گزرا کرتے تھے۔ مرد چھوٹی سڑک سے آتے جاتے۔ باغ کے گنجان درخت، ان درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں، پھولوں سے لدے ہوئے پودے گزرنے والوں کے دماغوں کو مہکا دیا کرتے تھے۔ بچے صبح و شام باغ میں کھیلتے۔

بڑے بوڑھے صبح آٹھ نو بجے صفیں اور دریاں بچھا کر محفل آراستہ کر لیتے۔ پھر ایک پڑھا لکھا بزرگ ہاتھ میں گل بکاؤلی، ہیر رانجھا، یوسف زلیخا، سیف الملوک یا کوئی دوسری پنجابی کی منظوم کتاب لے کر بیٹھ جاتا اور قصہ سنانا شروع کر دیتا۔ کل جہاں سے کہانی چھوڑی ہوتی وہ وہیں سے شروع کرتا جہاں ہمالیہ دیونی نے شہزادے اور گل بکاؤلی کی ملاقات کرائی تھی۔ سامعین ہمہ تن گوش ہو کر کہانی سنتے۔ کہانی میں کوئی دردناک مقام آتا تو بڑے بوڑھوں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار کہانی سنائی جا رہی تھی۔ کہانی دردناک مقام پر سے گزر رہی تھی۔ بڑے بوڑھوں کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے کہ ایک پردیسی مسافر کا باغ میں سے گزر ہوا۔ وہ بے چارہ سو ڈیڑھ سو آدمیوں کو روتے دیکھ کر کچھ پریشان سا ہو گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر ایک بزرگ سے پوچھا:

''یہاں کیا ہوا ہے، یہ آپ سب لوگ کیوں رو رہے ہیں؟''

بزرگ نے پگڑی کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا:

''گل بکاولی کو جنوں نے زنجیروں میں جکڑ کر قید خانے میں ڈال دیا ہے!''

بھاٹی کے باغ میں جہاں یہ داستان سرائی کی محفل جمتی، اس کے سامنے بابے گھد وشاہ کا مزار تھا۔ یہاں گاماں پہلوان رستم زماں کا اکھاڑہ تھا جو اب بھی ہے۔ یہاں بڑے بڑے نامی

گرامی پہلوان زور کرتے۔ دوسرے باغ میں نوجوان کبڈی کھیلتے۔ صبح کے وقت نوجوان کسرت کرتے۔ نوجوانوں میں ورزش بلکہ کسرت کرنے کا شوق بہت زیادہ تھا۔ بھائی دروازے کے باہر باغات میں مولسری کے درختوں کی قطار تھی۔ اس وقت لوگ منہ اندھیرے اٹھنے کے عادی تھے۔ مسلمان دریا پر جا کر نہانے کے عادی تھے۔ صبح صبح گلی میں ایک صدا ہر روز سنائی دیتی۔ سب کا بھلا......سب کی خیر......سب کا بھلا......سب کی خیر۔ یہ صدا تقریباً گلی میں سے گزرتے ہر بزرگ کی زبان پر ہوتی تھی۔

میں نے بازار حکیماں کی گلی کا غذیاں میں ہوش سنبھالا۔ ایک دن ہمارے بازار میں بڑا شور بلند ہوا۔ میں بڑا چھوٹا تھا۔ گلی سے نکل کر بازار میں آیا تو دیکھا کہ پہلوانوں کا ایک جلوس گزر رہا ہے اس وقت میری عمر تین ساڑھے تین سال کی ہوگی۔ یہ امام بخش پہلوان کی دوسری کشتی تھی۔

امام بخش پہلوان نے گونگے پہلوان کو پچھاڑ دیا تھا۔ گونگا پہلوان شکل و صورت اور مردانہ وجاہت اور کسرتی بدن کے اعتبار سے بہت خوب صورت پہلوان تھا۔ اس زمانے میں وہ عام میں ایک ہیرو کی حیثیت رکھتا تھا۔

ابھی بجلی شہر کے اندر نہیں آئی تھی۔ گھروں میں شام کو لالٹین اور چراغ روشن ہوتے تھے۔ گلیوں میں میونسپل کمیٹی کے لیمپ جلتے تھے۔ کمیٹی کا عملہ ہر شام لیمپ میں تیل ڈال کر لیمپ جلاتا۔ کبھی کوئی لیمپ چوری نہیں ہوا تھا۔ کبھی کسی نے لیمپ کا کھمبا نہیں اکھاڑا تھا۔ بڑے بازاروں میں لکڑی کے بلند پول نصب ہوتے تھے۔ ان کے ساتھ ایک ہینڈل اور گراری لگی ہوتی۔ کمیٹی کا آدمی شام کو آتا۔ ہینڈل کو گھما کر گیس نیچے لے آتا۔ اس میں تیل ڈال کر اسے روشن کرتا اور گراری گھما کر اوپر کر دیتا۔ یہ گیس بازاروں میں رات رات بھر روشن رہتے۔ صبح صبح کمیٹی کا آدمی آ کر انہیں بجھا دیتا۔ محرم میں سبیلیں لگتیں، سبیلوں کی آرائش بڑی عقیدت اور محبت کے ساتھ کی جاتی۔ ہندو بھی سبیلیں لگاتے تھے۔ نذر نیاز کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا تھا۔ کجیاں ٹھوٹھیاں بچوں میں بانٹی جاتی تھیں۔ کجیوں میں میٹھا شربت ہوتا اور ٹھوٹھیوں میں کھیر یا میٹھے چاول ہوتے تھے۔

میلہ چراغاں کی کئی ہفتے پہلے سے تیاریاں شروع ہو جاتی تھیں۔ یہ میلہ قریباً ہفتہ بھر لگتا تھا۔ شالامار باغ کے اندر اور باہر دکانیں آتی تھیں۔ ان پر بے حد رش ہوتا تھا۔ لوگ اس موقع پر ایک دوسرے کو تحفے تحائف اور مٹھائیوں کے ٹوکرے بھیجتے۔ جب میں نے پہلی مرتبہ میلہ دیکھا تو مجھے

خرچ کرنے کے لیے دس آنے ملے تھے۔ میں نے میلے میں خوب مٹھائی کھائی، قتلمے کھائے، پان بھی کھایا اور تین آنے پھر بچ گئے تھے۔ شالامار باغ کے سامنے ایک حوض تھا جس میں فوارہ لگا تھا۔ میلے کے دنوں میں فوارہ چلا دیا جاتا۔ اس کا پانی سڑک کے نیچے سے بہہ کر باغ کے اندر آتا تھا۔

اس زمانے میں چیزیں خالص اور سستی ہوتی تھیں۔ کوڑیاں بھی سکے کے طور پر استعمال ہوتی تھیں۔ مزاروں پر کوڑیوں کے چڑھاوے چڑھتے تھے۔ داتا دربار کے باہر دکانوں پر اکثر کوڑیاں بکتی تھیں۔ پانچ کوڑیوں کا ایک گھنڈا ہوتا تھا۔ میں نے ہوش سنبھالا تو کوڑیوں میں لین دین ختم ہو چکا تھا۔ پھر دھڑی دھیلا شروع ہو گیا۔ ایک پیسے کے دو دھیلے، چار دمڑیاں اور تین پائیاں ہوتی تھیں۔ دو پیسے کا ایک ٹکہ ہوتا۔ دونی چونی اٹھنی اور روپیہ خالص چاندی کا ہوتا تھا۔ ان دنوں پونڈ بھی عام لوگوں کے پاس تھے۔ پونڈ خالص سونے کا ہوتا تھا۔ میری ہوش میں آٹا ایک روپے کا بائیس سیر سے پچیس سیر تک بکتا تھا۔ سونا تیرہ سترہ روپے تولہ تھا۔ اسی مناسبت سے باقی چیزوں کی قیمتیں بھی کم تھیں۔ بھاٹی دروازے سے ریلوے اسٹیشن تک تانگے کا کرایہ ایک پیسہ تھا تانگے پر تین سواریاں بٹھانے کی اجازت تھی۔ چوتھا کوچوان ہوتا تھا۔

بھاٹی دروازے میں بھی لاہور کے دوسرے علاقوں کی طرح نوجوانوں میں پہلوانی کا شوق بہت زیادہ تھا۔ اکثر کہا جاتا تھا کہ جس کو اکھاڑے کی مٹی نہیں لگی وہ بھاٹی دروازے کا ہی نہیں۔ یہاں رستم زماں کا اکھاڑہ بڑا مشہور تھا۔ صبح و شام پہلوانوں کو زور کرتے دیکھنے والوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ ان دنوں گاماں پہلوان، امام بخش پہلوان اور چھوٹے جوڑوں میں گاماں برادران کا بھانجا غلام محی الدین، چیچہ گھیٹے والا، پھجی ٹونی، حسینا دفتری، شفیع مشین والا، بالا جھیور اور بیسیوں چھوٹے موٹے پہلوان ہوتے تھے۔ دنگل ہر ہفتے ہوتے۔ بڑے جوڑوں کے دنگل منٹو پارک (حال اقبال پارک) میں منعقد ہوتے۔ کھیلوں میں کشتیوں کو اولیت حاصل تھی۔ کبڈی دوسرے نمبر پر تھی۔ اسی پارک میں گلی ڈنڈے کے میچ ہوتے۔ پتنگ بازی، مرغوں کی لڑائی، بیٹروں کی لڑائی، مینڈھوں کی ٹکریں، یکوں تانگوں کی دوڑیں ہوتی تھیں۔ پہلوان بڑے پاک باز، حیادار اور شریف النفس تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ پہلوان میں کامیابی صرف پاکبازی سے مل سکتی ہے۔ پہلوانوں میں اکثر یہ کہا جاتا تھا کہ دماغ میں برائی کا خیال رکھ کر پہلوان اگر اکھاڑے میں اترے تو اسے چوٹ لگ جاتی ہے۔

بھاٹی دروازہ علما ادیبوں اور شاعروں کا مرکز رہا ہے۔ اس سلسلے میں بازار حکیماں میں فقیر خانہ سے منفرد صاحب علم پیدا ہوتے رہے۔ محلّہ جوگیاں کے قریب میاں شہباز کی بیٹھک اہل علم و فن کی آماجگاہ تھی۔ ادبی، علمی اور شعری محفلیں اسی بیٹھک میں منعقد ہوتی تھیں۔ یہ میرے بچپن کا دور تھا۔ وہاں آنے جانے والوں کو دیکھتا ضرور تھا مگر ان کے علم و فضل سے بے خبر تھا۔ شمس العلما مفتی محمد عبداللہ ٹونکی محلہ سمیاں میں رہتے تھے۔ ان کی حویلی آج بھی موجود ہے۔

مفتی صاحب اورینٹل کالج لاہور کے شعبہ ادبیات عربی کے ہیڈ تھے۔ ان کے فتاویٰ کئی جلدوں میں صبع ہوئے۔ ہائیکورٹ کے جج اس زمانے میں فقہی مسائل میں ان سے مشورہ لیتے تھے۔ پھر وہ یہاں سے ریٹائر ہوکر کلکتہ یونیورسٹی میں چلے گئے۔ ادبی، علمی اور شعری محفلوں میں وہ اکثر شرکت کرتے تھے۔ یہ وہی دور تھا جب علامہ اقبالؒ، حکیم احمد شجاع، امتیاز علی تاج اور دیگر شاعر ادیب علم و ادب کی شمع کو روشن رکھے ہوئے تھے ان کی محفلیں اسی بازار حکیماں میں جمتی تھیں۔ حکیم احمد شجاع نے مفتی صاحب پر ایک جامع مضمون بھی لکھا۔ مفتی صاحب کے بیٹے مفتی انوار الحق ریاست بھوپال میں وزیر مالیات تھے۔ دیوان غالب کا نسخہ حمیدیہ انہوں نے ہی مرتب کیا تھا جو آج بھی والی بھوپال کے محل میں محفوظ ہے۔ معروف ادیب اور ڈرامہ نویس رحمٰن مذنب، مفتی صاحب کے خاندان سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ فقیر وحید الدین نے روزگار فقیر کے عنوان سے علامہ اقبال پر دو جلدیں اسی جگہ لکھیں۔ مشہور شاعر تنویر نقوی اسی فقیر خانہ فیملی سے منسلک تھے۔

بھاٹی دروازے کی امام بارگاہ مبارک بیگم ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ محترمہ مبارک بیگم صاحبہ سر مراتب علی کی اہلیہ تھیں اور ان کا تعلق بھی فقیر خانہ خاندان سے ہی تھا۔ مشہور افسانہ نگار آغا اشرف کا تعلق بھی اسی خاندان سے ہے۔

برصغیر کے مشہور افسانہ نگار دلاور حسین میرزا ادیب بھی بھاٹی دروازے ہی کے رہنے والے ہیں اس طرح ہر گلی، ہر بازار کی مسجد میں علما اور مشائخ بھی موجود تھے۔ اونچی مسجد کے معروف خطیب مولانا غلام مرشد نے اسی علاقے میں رشد و ہدایت کی شمع روشن کر رکھی تھی۔ مولانا ایک جید عالم دین تھے۔ بعد میں وہ شاہی مسجد کے خطیب بھی رہے مگر بھاٹی دروازے کے لوگوں میں دینی اور ملی جذبہ روشن رکھنے میں ان کی ذات گرامی کا بڑا حصہ ہے۔

جس دور میں میں نے ہوش سنبھالا وہ خاموش فلموں کا دور تھا۔ بھاٹی گیٹ میں زیادہ فلمیں

انگریزی کی لگتی تھیں جو مار دھاڑ سے بھرپور ہوتی تھیں۔ اکثر پچیس پارٹ کی طویل فلمیں ہوتی تھیں۔ ٹارزن، پیڈرو بہادر کے نام جنگلی فلموں کے حوالے سے معروف تھے۔ اردو فلموں میں حاتم طائی کو بڑی شہرت ملی۔ یہ اتنی لمبی فلم تھی کہ لوگ شام کو کھانا کھا کر سینما ہال میں داخل ہوتے تھے اور صبح اذان کی آواز پر سینما ہال سے باہر نکلتے تھے۔ ٹکٹ دو آنے ہوتا تھا۔ اکثر پردیسی رات گزارنے کے لیے سینما ہال میں آجاتے تھے اور رات کبھی سو کر کبھی فلم دیکھ کر گزار دیتے تھے۔ میاں رشید کاردار (اے آر کاردار) فلمی دنیا کی ایک نامور شخصیت تھے۔ وہ بھاٹی دروازے ہی کے رہنے والے تھے۔ لاہور میں فلم سازی کا آغاز انہوں نے ہی کیا۔ چند خاموش فلمیں بھی بنائیں۔ بولتی فلموں میں ''باغی سپاہی'' بڑی مشہور فلم تھی۔ اس فلم کے ہیرو گل حمید تھے۔ گل حمید اس دور کے مشہور اور خوب صورت ترین ہیرو تھے۔ انہوں نے کلکتہ اور بمبئی کی کئی فلموں میں کام کیا اور شہرت کمائی۔ گل حمید کی آخری فلم ''خیبر پاس'' تھی۔ یہ اتنا بہادر فلم ایکٹر تھا کہ فائٹ اور ایکشن نیچرل کرتا تھا۔ ایک مرتبہ شاہی قلعے کے نزدیک شوٹنگ ہو رہی تھی۔ گھوڑے کو سرپٹ دوڑا کر لانا تھا اور پھر گھوڑے سے چھلانگ لگائی تھی۔ گل حمید ماہر شہسوار بھی تھا۔ وہ گھوڑے کو دوڑاتا ہوا آیا اور دوڑتے ہوئے گھوڑے پر سے پکی سڑک پر چھلانگ لگا دی۔ وہاں موجود عورتوں کی چیخیں نکل گئیں۔ آدمیوں کے رنگ اڑ گئے مگر گل حمید مسکرا رہا تھا، لیکن سڑک پر پھسلنے سے اس کے گھٹنے زخمی ہو گئے تھے۔ گل حمید پر اس زمانے کی مشہور ہیروئن مس کوپر عاشق تھی۔ گل حمید گلے کی بیماری میں مبتلا ہو کر پشاور کے قریب اپنے گاؤں پر چلا گیا۔ مس کوپر کو اس کی جدائی کا بہت صدمہ تھا۔ وہ بھی پشاور آ گئی۔ مگر جب وہ گل حمید کے گاؤں میں داخل ہو رہی تھی تو گل حمید کا جنازہ جا رہا تھا۔

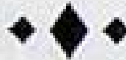
میاں کاردار نے لاہور میں اپنی فلمی زندگی کا آغاز کیا۔ ایم اسماعیل بھی بھاٹی دروازے میں رہائش پذیر تھے۔ انہوں نے ساٹھ سال فلمی دنیا میں گزارے اور مرتے دم تک شہرت کے آسمان پر جگمگاتے رہے۔ ''خزانچی'' فلم سے انہیں بے پناہ شہرت ملی۔ پاک و ہند کے مشہور ڈائریکٹر ایم صادق بھی اسی دروازے کے باسی تھے۔

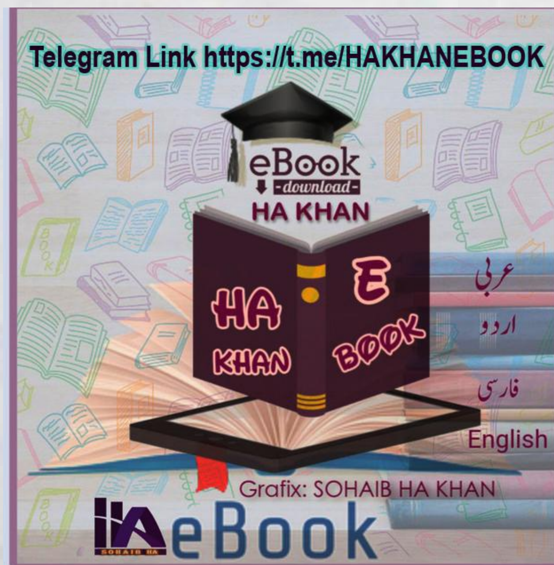
مشہور گلوکار محمد رفیع جو بین الاقوامی شہرت رکھتے تھے۔ وہ بھاٹی گیٹ کے اندر اونچی مسجد کے قریب گلی میں کاروبار کرتے تھے۔ ان کی دکان کے اندر ایک پردہ لگا ہوتا۔ اس پردے کے پیچھے رفیع نے ایک ہارمونیم رکھا ہوتا تھا۔ کام سے فارغ ہو کر وہ ہارمونیم لے کر بیٹھ جاتے اور گانا

شروع کر دیتے۔اسے کلاسیکی موسیقی کا بہت شوق تھا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اسے اتنا عروج عطا کیا کہ آج بھارت کے میوزک ڈائریکٹر کہتے ہیں کہ ایسا گلوکار صدیوں میں پیدا نہیں ہوگا۔آج اس کی نقل میں وہاں لوگ گانے کی کوشش کرتے ہیں اور نا کام ہو کر دو چار ٹھوکریں کھا کر وہیں رہ جاتے ہیں۔

بھاٹی دروازے کا ایک نام اور بہت مشہور تھا۔اس کا نام تا جی تھا۔یہ استاد منظوم پنجابی قصے کہانیاں سنا کر لوگوں پر ایک طرح سے جادو کر دیتا تھا۔اس کے بعد اس کے شاگرد مشہور گائک علی بخش ظہور نے گلوکاری کے حوالے سے برصغیر میں بڑا نام پیدا کیا۔محمد شفیع ناگی کا نام بھی ان دنوں لاہور میں بڑا مشہور تھا۔اسی طرح اگر بھاٹی گیٹ کی پوری شخصیتوں کا ذکر کیا جائے تو ایک کتاب مرتب ہو جائے گی۔





لاہور کا ایک خاموش دانشور

۱۹۴۸ء میں رسالہ ''ادب لطیف'' میں میری پہلی کہانی چھپی تو ایک ادبی محفل میں اردو کے نامور نقاد وقار عظیم صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنی مخصوص شگفتہ مسکراہٹ کے ساتھ فرمایا:

''آپ نے بڑی عمدہ کہانی لکھی ہے۔''

میرے لیے یہ بڑی عزت کی بات تھی کہ وقار عظیم ایسا اردو کہانی کا نقاد میری کہانی کی تعریف کر رہا ہے۔ میں نے وقار صاحب کا شکریہ ادا کیا تو انہوں نے مزید فرمایا:

''نہیں نہیں شکریے کی کیا بات ہے آپ نے عمدہ کہانی لکھی ہے۔''

وقار عظیم صاحب کی شہرت پاکستان کے قیام سے پہلے لاہور پہنچ چکی تھی۔ اردو افسانے پر ان کی رائے حرف آخر کا درجہ رکھتی تھی۔ پھر وہ لاہور تشریف لے آئے۔ ان سے میری پہلی ملاقات کہاں ہوئی؟ یاد نہیں رہا۔ ماضی کے دھندلکوں میں ایک اچکن پوش دبلی پتلی دلکش شخصیت کو دیکھتا ہوں کہ ایک لمبا مفلر گردن سے ہوتا ہوا سینے پر پڑا ہے۔ تنگ موری کا سفید پاجامہ، سانولے چہرے پر ذہانت کی چمک، بال گہرے سیاہ اور لہریالے، چال میں متانت اور وقار، چہرے پر ایک مسکراہٹ رہتی ہے۔ آواز بھاری مگر لہجہ دھیما اور نرم۔ بات ختم ہونے پر بھی چہرے پر مسکراہٹ کھلی رہتی ہے۔ حلقہ ارباب ذوق اور ترقی پسند مصنفین کی انجمن میں یکساں طور پر مقبول ہیں۔ ہر کوئی انہیں احترام کی نظر سے دیکھتا ہے اور ان کی رائے کو بڑی وقعت دیتا ہے۔ اس اتوار حلقہ ارباب ذوق کے ادبی جلسے کی صدارت کر رہے ہیں تو دوسرے ہفتے انجمن ترقی پسند مصنفین کے ادبی اجلاس میں کرسی صدارت پر تشریف فرما ہیں۔ سبھی ان کا ادب کرتے ہیں۔ ایک صاحب الرائے نقاد، ایک استاد اور ایک خوش اخلاق شریف النفس انسان کی حیثیت سے بھی۔

وقار عظیم صاحب رسالہ ''نقوش'' کے ایڈیٹر ہوئے تو مجھے افسانے کے لیے ضرور کہتے۔ یہ میرے لیے بڑے اعزاز کی بات تھی۔ کبھی کبھی ایبک روڈ پر واقع رسالہ ''نقوش'' کے دکان نما دفتر

میں ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہو جاتا۔ان کے چہرے پر ایسی شگفتگی آ جاتی جو اپنے پیاروں کو دیکھ کر آتی ہے۔ میں خود ان کی دلکش اور اسکالرانہ شخصیت سے بڑا متاثر تھا۔ وقار صاحب اورینٹل کالج لاہور میں اردو پڑھاتے تھے۔ بلکہ اردو ناول اور کہانی پڑھاتے تھے۔ میں بھی اسی کالج میں پڑھتا تھا۔اسی زمانے کے پرسکون اورینٹل کالج کی یادیں بڑی حسین اور شگفتہ ہیں۔ اونچی چھت والے ٹھنڈے ٹھنڈے خاموش برآمدے اور کاریڈور، محدود طلبا اور طالبات علم کی فراوانی، علم حاصل کرنے والوں کی کمیابی، کشادہ خالی خالی کمرے، کہیں فارسی کے استاد عبدالشکور احسن صاحب، کہیں ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب لیکچر دے رہے ہیں تو کہیں ڈاکٹر سید عبداللہ، پروفیسر عبدالصمد صادم اور وقار صاحب نے کلاسیں لے رکھی ہیں۔ وقار عظیم صاحب اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ کمرے میں داخل ہوتے اور سمٹ کر کرسی پر بیٹھ جاتے۔ان کے لیکچر آج بھی یاد آتے ہیں۔ مجھے موسم بہار کا وہ دن نہیں بھولتا۔ وقار عظیم صاحب کلاس روم میں لیکچر دے رہے تھے۔ یہ شروع موسم بہار کا زمانہ تھا۔ درختوں پر نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ کالج کے صحن میں جو برگد کا بہت بڑا درخت تھا اس کی شاخوں پر بھی لال اور نسواری رنگ کے پتے آ رہے تھے۔ کسی کسی ٹہنی پر کوئی زرد خزاں نصیب پتا ابھی تک اٹکا ہوا تھا۔ ہوا کا جھونکا آتا تو وہ اپنی شاخ سے ٹوٹ کر نیچے گر پڑتا۔ مجھے یاد ہے لیکچر دیتے وقار عظیم کی نگاہ کھڑکی میں سے برگد کے درخت پر پڑی۔ ایک زرد پتا ٹہنی سے جدا ہو کر چکراتا ہوا نیچے گرا۔ وقار عظیم صاحب کے چہرے پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ تھی۔ پھر انہوں نے گردن پھیر کر طلبا کی طرف دیکھا اور لیکچر دینے لگے۔

ایک روز کی بات ہے۔ سردیوں کا موسم تھا۔سنہری دھوپ کالج کے چھوٹے سے لان میں پھیلی ہوئی تھی۔ وقار عظیم صاحب مجھے کوئی بات سمجھا رہے تھے کہ انہوں نے نگاہیں اٹھا کر برگد کے درخت کو دیکھا اور فرمایا:

''ابھی یہ درخت نوعمر ہے، ایک دن یہ بہت گنجان درخت بن جائے گا۔''

اورینٹل کالج کا سالانہ مشاعرہ تھا۔ ہال طلبا اور طالبات سے بھرا ہوا تھا۔ کچھ طلبا شور مچا رہے تھے۔ باہر سے کچھ معزز مہمان بھی آئے ہوئے تھے۔ وقار صاحب صدارت کر رہے تھے۔ طلبا ہر شعر پر منہ نیچے کر کے ہوٹنگ کرتے۔ اسٹیج سیکرٹری نے ایک دو بار منع بھی کیا مگر لڑکے باز نہ آئے

اس پر وقار عظیم مسکراتے ہوئے طلبا سے مخاطب ہوئے۔

''ہوٹنگ ضرور کیجیے مگر اچھے شعر کی داد بھی دیجیے۔ شعر فہمی اورینٹل کالج کی قدیم روایات میں شامل ہے۔''

لڑکے یہ سن کر چپ ہو گئے اور اچھے شعروں پر داد دینے لگے۔ کالجوں میں سیاست اور پارٹی بازیاں چلا ہی کرتی ہیں مگر وقار عظیم نے کبھی ان سرگرمیوں میں حصہ نہیں لیا تھا۔

ناصر کاظمی بیمار ہو کر اسپتال میں داخل ہوا تو ان دنوں میں ریڈیو پاکستان اسٹاف آرٹسٹ یونین کا صدر تھا۔ ہم نے صوبائی حکومت کی توجہ اس عظیم شاعر کے علاج کی طرف دلانے کے لیے ریڈیو یونین کی طرف سے ایک جلوس نکالنے کا فیصلہ کیا۔ میں خود وقار عظیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے جلوس میں شرکت کی درخواست کی۔ وقار صاحب علیل تھے۔ انہیں سانس کی تکلیف تھی اور زیادہ پیدل نہیں چل سکتے تھے۔ لیکن وہ ایک پلے کارڈ تھامے دوسرے شاعروں، ادیبوں آرٹسٹوں کے ساتھ جلوس میں شامل ہوئے اور شملہ پہاڑی سے میو ہسپتال تک پیدل چلے۔ یہ تو ایک نامور شاعر کا معاملہ تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اس کی جگہ اگر کوئی دوسرا غریب آدمی ہوتا تب بھی وقار صاحب جلوس میں ضرور شامل ہوتے۔ انسانوں سے پیار ان کے مزاج کا حصہ تھا۔

اردو مرکز والے ظہیر صاحب سے بھی ان کے بڑے مراسم تھے۔ رسالہ ''سویرا'' کے دفتر جاتے ہوئے جب کبھی وقار صاحب اردو مرکز کے آفس میں بیٹھے دکھائی دیتے تو میں ان کی خدمت میں سلام کرنے ضرور حاضر ہوتا۔ وہ اپنی روایتی محبت اور شفقت سے ملتے۔

اورینٹل کالج میں وقار صاحب کا کمرہ برآمدے کے شمالی کونے پر کامن روم کے پہلو میں تھا۔ میز، کرسی، کتابیں، مسکراہٹ اور چائے، یہ اس کمرے کا سامان تھا۔ اس کمرے کی ساری رونق وقار صاحب کے دم قدم سے تھی۔

وہ کمرے میں ہوتے تو کمرہ بھرا بھرا لگتا۔ میں کبھی ان کی کرسی خالی پاتا تو دل گرفتہ سا ہو کر کامن روم میں چلا جاتا۔ جب انہیں اپنے کمرے میں داخل ہوتے دیکھتا تو دو منٹ بعد میں بھی ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتا۔ مجھے دیکھتے ہی وقار صاحب گھنٹی بجا کر چپراسی کو بلاتے اور کہتے:

''چائے کا پانی رکھ دیجیے۔''

بجلی کے چولہے پر چائے کے لیے پانی رکھ دیا جاتا۔ وقار صاحب کوئی فائل کھولتے ہوئے

میری طرف دیکھ کر مسکراتے اور کہتے:

''ایک منٹ میں یہ کام نمٹا لوں، پھر آپ سے باتیں ہوں گی۔''

وہ کام میں مصروف ہو جاتے اور میں کھلی کھڑکی میں سے باہر برگد کے درخت کو تکنے لگتا۔ میں وقار عظیم صاحب کے سامنے سگریٹ نہیں پیتا تھا۔ ایک روز میں وقار صاحب کے پاس کالج کے لان میں بیٹھا تھا کہ پروفیسر محی الدین اثر صاحب تشریف لے آئے۔ وہ وقار صاحب سے کسی ادبی موضوع پر باتیں کرنے لگے۔ اثر صاحب نے جیب سے گولڈ فلیک کی ڈبی نکالی تو مجھے بھی سگریٹ دیا۔ میں نے معذرت کر دی۔ وقار عظیم بولے:

''بھئی آپ میرا اتنا خیال نہ کیا کیجیے، سگریٹ لے لیجیے۔''

انہوں نے یہ بھی نہ کہا کہ میں جانتا ہوں آپ سگریٹ پیتے ہیں۔ وقار صاحب کے کمرے میں برقی چولہے پر چائے کا پانی کھولنے لگا تھا۔ وقار صاحب نے بھی کام ختم کر لیا تھا۔ میں نے خود چائے بنا کر انہیں پیش کی تو وہ بڑے خوش ہوئے۔

''بڑی عمدہ چائے بنائی ہے آپ نے۔''

مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ انہیں میری بنائی ہوئی چائے پسند آئی تھی۔ ان ہی دنوں ایک روز نامور افسانہ نگار، نقاد اور مترجم محمد حسن عسکری صاحب سے پاک ٹی ہاؤس میں ملاقات ہوئی تو انہوں نے فرمایا:

''بھئی حمید صاحب! آپ نے اپنے جن افسانوں میں شہر کی گلیوں میں رہنے والے لوگوں کا ذکر کیا ہے وہ ہمیں پسند ہیں۔ آپ ان لوگوں کے بارے میں زیادہ لکھا کریں۔''

مگر مشکل یہ تھی کہ میں عسکری صاحب کی پسند کے افسانے نہیں لکھ سکتا تھا۔ میں اپنی پسند کے افسانے لکھ رہا تھا۔ تیسرے روز کالج میں وقار صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے انہیں عسکری صاحب کا ریمارکس سنایا۔ وہ مسکرائے۔ کہنے لگے:

''ایک طرح سے ان کا مشورہ بھی اپنی جگہ پر درست ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جس طرح سے آپ لکھتے ہیں اسی طرح سے آپ کو لکھتے رہنا چاہیے۔''

ان ہی دنوں وقار عظیم صاحب نے کالے رنگ کی ایک پرانی گاڑی خرید لی۔ اب روزانہ

ڈرائیور انہیں کار پر لاتا لے جاتا۔ وہ کالج کے گیٹ پر کار سے اترتے۔ ڈرائیور کار ایک طرف پارک کر دیتا۔ ہم بڑے خوش تھے کہ وقار صاحب کو تانگے کے ہچکولوں سے نجات مل گئی۔ شروع شروع میں وقار صاحب بھی بڑے خوش تھے۔ لیکن ان کی یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی۔ پرانی کار نے انہیں پریشان کرنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے کار بیچ ڈالی اور ایک بار پھر تانگے پر کالج آنے لگے۔

میں اورینٹل کالج سے فارغ ہو چکا تھا اور صبح شام پاک ٹی ہاؤس میں دوستوں سے خوش گپیاں ہوتیں۔ میری کہانیوں کے دو مجموعے اور کچھ ناول چھپ چکے تھے۔ کبھی کبھار وقار صاحب بھی ٹی ہاؤس آ جاتے۔ کبھی میں ان سے ملنے اورینٹل کالج چلا جاتا۔ وقار صاحب زیادہ باتیں نہیں کرتے تھے۔ ضرورت کی بات کرنے کے بعد خاموش ہو جاتے مگر ان کی خاموشی میں بھی بڑی علمیت تھی۔ ان کی خاموشی بھی بہت کچھ سکھا دیتی تھی۔

سمن آباد والا مکان انہوں نے ڈاکٹر عنایت صاحب کے ساتھ ہی بنوالیا تھا۔ اس زمانے میں بورڈ والے چوک سے ایک کچا راستہ ان کے گھر تک جاتا تھا۔ یہ مکان یا کوٹھی چوک کی دوسری طرف والی اسٹریٹ میں تھی۔ ان کا یہ مکان میں نے پہلی بار اس وقت دیکھا جب میں بھی فلیمنگ روڈ سے اٹھ کر سمن آباد میں آ گیا تھا۔ وقار کے ہاں میں پہلی بار ان سے ملنے گیا تو دیکھا کہ مکان کے چھوٹے سے برآمدے میں ایک تخت بچھا ہے۔ جس پر تکیہ لگا ہے۔ دیوار پر منی پلانٹ والی بوتل لٹک رہی تھی۔ سامنے باغیچے میں پیڑ لگے تھے۔ وقار صاحب مجھے خندہ پیشانی سے ملے اور اندر لے گئے کہنے لگے:

''بھئی میں نے سنا ہے آپ نے بھی یہیں کہیں مکان خرید لیا ہے۔''

ڈرائنگ روم بڑے سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ ٹرالی کے نچلے خانے میں خشک میووں سے بھری ہوئی پلیٹیں رکھی تھیں۔ دیوار پر چغتائی کی ایک دیدہ زیب تصویر کا پرنٹ آویزاں تھا۔ وہ خود چائے بنا رہے تھے کہنے لگے:

''یہ آپ نے بڑا اچھا کیا جو اپنا مکان خرید لیا۔''

ڈرائنگ روم میں بڑی خوشگوار ٹھنڈک تھی۔ میں تھوڑی دیر ان کی خدمت میں بیٹھا رہا۔ پھر اجازت لے کر چلا آیا۔

کچھ دنوں بعد ان کے ہاں گیا تو برآمدہ خالی تھا۔ معلوم ہوا کہ چور رات کو تخت اٹھا کر لے گئے ہیں۔ وقار صاحب باہر تخت بچھا کر ایک خاص تہذیب کی روایت نبھا رہے تھے مگر انہیں کیا معلوم تھا کہ یہاں راتوں کو جن پھرتے ہیں جو تخت اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ وقار صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا:

''غنیمت ہے کہ چور نے صرف تخت اٹھانے پر ہی اکتفا کیا۔''

اس کے بعد انہوں نے برآمدے میں لوہے کی جالیاں لگوالیں۔ ایک روز میں موسم برسات میں ان سے ملنے گیا تو دیکھا کہ وقار عظیم صاحب لان میں کرسی پر بیٹھے ہیں، موسم ابر آلود تھا۔ لان میں ایک طرف پپیتے کا درخت تھا اور سامنے کی جانب امرود کے کچھ پیڑ لگے تھے۔ امرود کے درختوں کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ یہ بھرے باغوں کے پیڑ ہیں۔ ایک دوست نے خاص طور پر لا کر دیے ہیں۔ ان کے امرود بڑے میٹھے ہوتے ہیں۔ ہم باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں ایک درخت پر پکا ہوا امرود پٹ سے گھاس پر گرا۔ وقار صاحب اٹھے، امرود اٹھایا اور اسے رومال سے صاف کرنے لگے۔

''کھائیں گے آپ؟''

کوٹھی کے صدر دروازے والے کونے میں انہوں نے ربڑ کا ایک درخت لگوا لیا تھا۔ یہ درخت دیکھتے دیکھتے بڑھ گیا ہے۔ لاہور میں اس درخت کا بڑا رواج ہو گیا ہے۔ اصل میں یہ ربڑ کا درخت نہیں ہے۔ اس سے ملتا جلتا بلکہ اسی خاندان کا ایک درخت ہے۔ ربڑ کے درخت میں نے سنگاپور، ملایا اور برما میں بڑے دیکھے ہیں۔ وہ ان درختوں سے ذرا مختلف ہوتے ہیں اور اتنے گھنے بھی نہیں ہوتے۔

آسمان پر بادل گھنے ہو رہے تھے۔ لگتا تھا کہ ابھی بارش ہونے لگے گی۔ وقار صاحب نے اپنے بچپن کی باتیں شروع کر دیں۔ میں ان سے پہلی بار ان کے بچپن کی یادیں سن رہا تھا۔

''ہمارے اسکول کو جو راستہ جاتا تھا۔ وہاں ایک نہر ہوا کرتی تھی۔ ساون کی جھڑیاں لگتیں تو ہم اس نہر میں نہایا کرتے۔ نہر کی دوسری طرف آم کے باغ تھے۔ ہم ان باغوں میں گھس جاتے اور کچے پکے آم توڑ کر کھاتے۔''

اپنے بچپن کی یادیں تازہ کرتے ہوئے ان کے چہرے پر بچپن کی معصومیت آ گئی تھی۔ وقار

صاحب نے آم کے ایک درخت کا خاص طور پر ذکر کیا جوان کے اسکول کے راستے میں پڑتا تھا۔ کہنے لگے کہ درخت کی بڑی رکھوالی ہوتی تھی۔ کیونکہ اس پر بڑے عمدہ قسم کے آم لگتے تھے۔

''مگر ہم چند شرارتی بچے کسی نہ کسی طرح دیوار کے سہارے اس درخت پر چڑھ جاتے اور آم توڑتے جب رکھوالا شور مچاتا تو ہم بھاگ جاتے۔''

میں نے اپنے مکان کی پہلی تعمیر نو کی تو اپنے دوستوں کی دعوت کی۔ وقار صاحب کو میں نے خاص طور پر دعوت دی۔ ہمارے مکان کے پچھلے صحن میں ساتھ والوں کے گھر اگے ہوئے آم کے درخت کی شاخیں جھکی ہوئی تھیں۔ اس کا پھل ہمارے صحن میں بھی گرتا تھا۔ اپریل کا مہینہ تھا درخت پر ہرے ہرے آم لگے تھے۔ وقار صاحب نے کہا کہ یہ اچاری آم ہیں۔ میں نے کچھ آم توڑ کر انہیں پیش کیے۔ جو وہ اپنے ساتھ لیتے گئے۔ وقار صاحب کو زردہ بہت پسند تھا۔ زردہ میری بھی کمزوری رہا ہے۔ اور اس روز میں نے خاص طور پر زردے کی دیگ پکوا رکھی تھی۔ اس کام کے لیے موچی دروازے کا خاص باورچی بلوایا گیا تھا جس نے بڑے کمال کا زردہ پکایا۔ آج کل بیاہ شادیوں میں جو زردہ پکتا ہے اس میں نہ جانے کیا کچھ ڈال دیا جاتا ہے جس سے زردے کی اصل شخصیت دب کر رہ جاتی ہے۔ ہمارے والا زردہ سادہ اور اصلی تھا۔ یعنی اس میں بادام، ناریل اور ترنج کی ہوائیاں ہی چھوڑی گئی تھیں اور موچی دروازے کے باہر باورچی نے ایسی ہوائیاں چھوڑی تھیں کہ کسی کو نظر ہی نہیں آتی تھیں۔ اور سارا زردہ اس کی خوشبو سے مہک رہا تھا وقار صاحب نے زردے کو بہت پسند کیا۔ دوسرے روز صبح صبح میں زردے کا تھال لے کر وقار صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ صرف اپنی محبت اور احترام کی وجہ سے جو میرے دل میں ان کے لیے تھا۔ زردہ ذرا سا لگ جائے تو اس کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ زردے کی گھروڑی کون امرتسری کشمیری ہوگا جو چھوڑ دے۔ اس کے لیے تو سب کچھ چھوڑا جا سکتا ہے۔ ہمارے ہاں شاید کسی کی سالگرہ تھی ہم نے وقار صاحب کو خاص طور پر دعوت دی تھی۔ وہ تشریف لائے اور اپنے ساتھ دو نئی کتابیں لیتے آئے۔ ایک کتاب کا نام ''اقبال، شاعر اور فلسفی'' تھا دوسری کتاب ''اقبال معاصرین کی نظر میں'' یہ دونوں کتابیں انہوں نے اپنے ہاتھ سے بڑے پیارے جملے لکھ کر مجھے دیں۔ یہ کتابیں آج بھی ایک نایاب تحفے کے طور پر میرے پاس محفوظ ہیں اور مجھے بہت عزیز ہیں۔ کیونکہ وقار ایسے نقاد اور شریف النفس بزرگ خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ چونکہ میں ان کے ہمسائیوں میں تھا۔ اس لیے

ان سے شرف ملاقات کا موقع ملتا ہی رہتا تھا۔ پھر ان کی علمی اور ادبی مصروفیات بڑھتی گئیں۔ دو مہینے ان سے ملے بغیر گزر گئے۔ ایک روز میں ریڈیو اسٹیشن کی دوسری منزل والے اپنے کمرے سے نکل کر راہ داری میں سے گزر رہا تھا کہ اچانک وقار عظیم سامنے سے آتے نظر آئے۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا:

''یہ عید کا چاند اچانک کیسے نکل آیا۔''

وقار صاحب مسکرا رہے تھے۔ انہوں نے اپنے ساتھ لگا لیا اور کہا:

''مصروفیت ہی کچھ ایسی تھی کہ ملنے کا موقع نہ نکال سکا۔''

وہ کسی پروگرام کی ریکارڈنگ کے لیے آئے ہوئے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ریڈیو پاکستان لاہور کی فضا علمی اور ادبی پروگراموں سے معمور رہا کرتی تھی اور بلند پایہ عالم، ادیب، شاعر اور نقاد حضرات سے اکثر ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ وقار عظیم صاحب کو میں اس پروڈیوسر کے کمرے میں لے آیا جس نے ان کی تقریر ریکارڈ کر لی تھی۔ جب تک وقار صاحب ریڈیو اسٹیشن کی عمارت میں رہے میں ان کے ساتھ رہا۔ ریکارڈنگ کے بعد میں نے انہیں چائے پیش کی۔ وہ پاکستان کے افسانوی ادب پر باتیں کر رہے تھے۔ پاکستان میں جو نئے افسانے لکھے جا رہے تھے وہ ان سے بے حد مطمئن تھے۔ انہوں نے کہا:

''یہ ایک تاریخی تسلسل ہوتا ہے جب کوئی قوم اپنی ایک الگ شناخت قائم کر لیتی ہے تو اس کی راہ میں کچھ رکاوٹیں آتی ہیں۔ مگر زندہ قومیں ان کو دور کر لیتی ہیں۔ پاکستانی بھی ایک زندہ اور آزاد قوم ہیں۔ ہماری قوم انشاء اللہ دوسرے شعبوں کے ساتھ ساتھ علم و ادب میں بھی بہت ترقی کرے گا۔''

وقار صاحب کی باتیں ہمیشہ بڑی امید افزا اور رجائیت سے بھرپور ہوتی تھیں۔ انہیں اللہ پر بڑا بھروسہ تھا اور اس کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہوئے تھے۔ وہ خود نماز روزے کے پابند تھے۔ اور کلاس روم میں نوجوانوں کو نماز روزے کی پابندی کی تلقین کیا کرتے تھے۔

عید کی صبح تھی۔ گھنٹی بجی میں نے دروازہ کھولا سامنے وقار صاحب تھے ہاتھ میں پھلوں کا لفافہ لیے مسکرا رہے تھے۔

''سوچا آپ کو عید مبارک دیتا چلوں۔''

میرے لیے یہ بڑی عزت افزائی اور برکت کی بات تھی۔ میں نے سویاں اور سبز چائے پیش کی۔ انہوں نے صرف چائے پر اکتفا کی۔ بچوں کی عیدی دی اور چلنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں انہیں چھوڑنے کے لیے گاڑی تک آیا۔ اس کے بعد ہر عید پر وقار صاحب تھوڑی دیر کے لیے عید کی مبارک دینے ہمارے ہاں تشریف لاتے۔

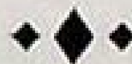
وقار صاحب کو سانس کی تکلیف تھی جس کا اظہار وہ کبھی نہیں کرتے تھے۔ تکلیف کچھ بڑھ گئی تو ان کا زیادہ تر وقت گھر پر ہی گزرنے لگا۔ میں ان کے آرام میں خلل ڈالنے کے خیال سے ان کی عیادت کو ہر روز نہ جاتا تیسرے چوتھے دن ان کے ہاں پہنچ جاتا۔ وہ بستر پر تکیوں کے سہارے نیم دراز ہوتے۔ وہ مسکراتے پلنگ کی پٹی پر ہاتھ پھیر کر فرماتے:

''یہاں بیٹھیے آپ دور کیوں بیٹھے ہیں۔''

یہ ان کی مجھ سے شفقت اور محبت تھی۔ وہ سب کا حال احوال پوچھتے۔ میں ان کا حال پوچھ لیتا۔ تو مسکرا کر کہتے:

''بس ٹھیک ہے جو دم گزر جائے غنیمت ہے۔''

اور پھر ایک روز وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ دنیائے ادب کا ایک تابندہ ستارہ ٹوٹ کر خلاؤں میں گم ہو گیا دنیا کے کام نہیں رکتے اور رکنے بھی نہیں چاہئیں۔ زندگی کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتی صرف زندہ رہنے والے پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتے رہتے ہیں۔ ایک ستارہ ٹوٹتا ہے تو کارخانہ قدرت سے دوسرا نمودار ہو جاتا ہے، لیکن انسان ہونے کے ناطے ہم میں کچھ جذباتی کمزوریاں بھی ہیں۔ ہم بڑی محبتیں کرتے ہیں۔ اپنے آپ کو جذباتی رشتوں کے جال میں الجھائے رکھتے ہیں۔ ہم ستاروں ایسی بے نیازی شاید پوری طرح سے اختیار نہیں کر سکتے۔ ہمارا کوئی پیارا ہم سے بچھڑ جائے تو اس کی یاد میں آنسو بھی بہاتے ہیں اور مرتے دم تک اس کی یاد سے اپنے غم کو بہلاتے رہتے ہیں۔ ایک چیز کا تکمیل تک پہنچ کر فنا ہو جانا قدرت کا تقاضا ہے۔ اسی چیز سے محبت کے رشتے استوار کرنا اور پھر اس کی یاد میں آنسو بہانا یہ ہماری مجبوری ہے۔ ہو سکتا ہے یہی وہ آنسو ہوں، یہی وہ جذبہ محبت ہو جو قدرت کو ایک ستارے کے ٹوٹ جانے پر دوسرے ستارے کی تخلیق پر آمادہ کرتا ہو۔



لاہور کے گم شدہ چہرے

لاہور میں لانڈری کی ایک دکان ہوا کرتی تھی۔

یہ میں ۴۹-۱۹۴۸ء کی بات کر رہا ہوں۔ یہ دکان ہال روڈ پر واقع تھی۔ بیڈن روڈ کے پیچھے سے آتا ہوا گندا نالہ جہاں ہال روڈ کو زیر زمین کراس کرتا ہوا مال روڈ کی طرف نکل جاتا ہے وہاں بائیں جانب دو تین سیڑھیاں اتر کر لانڈری کی یہ دکان تھی۔ دیواروں کے ساتھ شیشے کے دروازوں والی الماریاں لگی تھیں۔ دکان کے دروازے پر کاؤنٹر بنا ہوا تھا۔ کاؤنٹر کے پہلو سے ایک تختہ اوپر اٹھا کر دکان کے اندر جاتے تھے۔ اس دکان کے مالک ایک مولوی صاحب تھے۔ وہ شکل سے بالکل مولوی نہیں لگتے تھے۔ عمر پچپن سال کی ہوگی قد درمیانہ جسم بھاری اور مضبوط، رنگ گندمی، سر بالوں کے بغیر تھا۔ جو بجلی کے بلب کی روشنی میں چمک رہا ہوتا۔ میں مولوی صاحب کا نام بھول گیا ہوں۔ ان کے چہرے پر ہر وقت ایک خوش باش قسم کی مسکراہٹ کھلی رہتی تھی۔ چھوٹی سی دکان میں آتش پارے کی طرح ادھر ادھر چلتے پھرتے نظر آتے۔ گرمیوں کے موسم میں دکان میں استریوں کی گرمی ہوتی اور مولوی صاحب کے ماتھے اور ہونٹوں پر پسینے کے قطرے چمکتے رہتے تھے۔ دکان کے پیچھے کپڑوں پر استری ہوتی تھی۔ بیچ میں ہر وقت ایک پردہ گرا رہتا۔

مولوی صاحب کو میرے آرٹسٹ شاعر دوست انور جلال نے دریافت کیا تھا۔ خوش لباسی کے ساتھ ساتھ ہمیں اس بات کا بھی بڑا خیال رہتا تھا کہ کپڑے بہترین انداز میں استری ہوں۔ مولوی کا اس معاملے میں جواب نہیں تھا۔ وہ ایسی فنکاری اور حسن و خوبی سے ہماری قمیص استری کرتے کہ ہم اپنی قمیصوں کو دیکھتے ہی رہ جاتے۔ اگر ان پر گرد پڑتی تو ذرا سی جنبش دینے سے قمیص کے سینے پر سے گرد یوں جھڑ جاتی جیسے قمیص شیشے کی ہو۔ مولوی صاحب کلف بھی بڑی چابکدستی اور مہارت سے لگاتے۔ اس کلف اور ان کی استری کی وجہ سے قمیص چار چار دن تک ویسی کی ویسی رہتی کہیں ذرا سی بھی شکن نہ پڑتی۔

مولوی صاحب اہل زبان تھے اور شاعر بھی تھے ان کا ہینڈ رائٹنگ بڑا خوب صورت تھا۔

ہمیں کپڑوں کی دھلائی کا بل دیتے تو موقع کی مناسبت سے اس پر اپنے ہاتھ سے خطِ نسخ میں کوئی نہ کوئی شعر ضرور لکھ دیتے۔ انہیں بل کی ادائیگی سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں ہوتی تھی۔ بس اسی بات پر خوش رہتے کہ ہمیں ان کا شعر بہت پسند آ گیا ہے۔ بل پر شعر لکھتے ہوئے وہ ساتھ ساتھ شعر دہراتے بھی جاتے۔ شعر لکھ کر وہ بل ہماری طرف بڑھاتے۔ ان کے چہرے پر بچوں ایسی معصوم مسکراہٹ ہوتی اور بڑے اشتیاق سے پوچھتے:

''کیوں مولانا؟ کیسا شعر ہے؟''

میں ان دنوں الٰہی پارک مصری شاہ میں رہتا تھا۔ وہاں سے اپنے کپڑے مولوی صاحب کی دکان پر لاتا اور دھلی ہوئی قمیص تانگے میں پچھلی سیٹ پر رکھ کر مصری شاہ لے جایا کرتا تھا۔ میں نے اتنی احتیاط سے مولوی صاحب کی استری کی ہوئی قمیصیں تانگے میں رکھی ہوتیں جیسے تنور سے نکلی ہوئی تازہ باقر خانیاں گھر لے جا رہا ہوں۔ اب مجھے خیال آ رہا ہے کہ شاید ہم انہیں مولانا کہا کرتے تھے۔ اس زمانے میں ایک کپڑے کی دھلائی کیا ہوتی ہو گی؟ میرا خیال ہے یہی چار چھ آنے سے زیادہ نہیں ہو گی اور مولوی صاحب یا مولانا کی لانڈری پر زیادہ رش بھی ہم نے کبھی نہیں دیکھا تھا مگر وہ اس حال میں اتنا خوش رہتے تھے کہ تانبے کو سونے میں تبدیل کرنے والا کوئی کیمیاگر بھی اتنا خوش نہیں ہوتا ہو گا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ میں ان کی لانڈری پر کپڑے لینے آیا ہوں۔ مولانا نے اپنی بے لوث مسکراہٹ سے میرا استقبال کیا۔ کاؤنٹر پر کہنیاں ٹکا کر پنسل سے سفید کاغذ پر کوئی شعر لکھ کر کاغذ میری طرف بڑھا دیا اور کہا:

''آپ شعر پڑھیں میں کپڑے نکالتا ہوں۔''

ان کی دکان میں بھی اقبال، رومی اور حافظ کے اشعار قطعوں کی شکلوں میں لگے ہوئے تھے۔ میں اس لانڈری کا نام بھی بھول گیا ہوں۔ مولوی صاحب کی شکل پوری یاد ہے۔ انہیں آج بھی اپنی چھوٹی سی نیم روشن دکان کے اندر ادھر ادھر گردش کرتے دیکھ رہا ہوں۔ اب یہ دکان وہاں نہیں ہے۔ شاید وہاں کوئی بلڈنگ کھڑی ہے۔ جب کبھی ادھر سے گزرتا ہوں تو مولانا صاحب کو دیکھتا ہوں کہ الماری میں سے کپڑے نکال کر کاؤنٹر پر رکھ رہے ہیں اور پھر بل پر اپنے ہاتھ سے کوئی شعر لکھ کر مسکراتے ہوئے پوچھتے ہیں:

''مولانا! کیسا شعر ہے؟''

آرٹسٹ انور جلال شمزا کا مکان بیڈن روڈ کی ایک گلی میں شیزان کے پیچھے تھا۔ چوتھی منزل کے ایک کمرے میں اس کی بنائی ہوئی تصویریں لگی ہوتیں اور وہ کسی کینوس پر وارنش یا کوئی رنگ پھیرتا ہوا مجھے ملتا۔ جیسا کہ میں پہلے بھی کہیں لکھ چکا ہوں انور جلال شمزا انگریزی میں جس انداز میں اپنے دستخط کرتا تھا بالکل اسی طرح سے اس نے شیزان کے الفاظ انگریزی میں لکھ کر شیزان ہوٹل والوں کو دے دیے تھے اور اس نے مجھے کہا تھا کہ آج میں نے اپنے دستخط بیچ دیے ہیں۔ آج بھی انگریزی میں کسی جگہ شیزان یا شمزا لکھا ہوا دیکھتا ہوں تو مجھے بے اختیار اپنا خوب صورت آرٹسٹ دوست انور جلال شمزا یاد آ جاتا ہے جو لندن کے قریب کسی کاؤنٹی کے قبرستان میں آسودہ خاک ہے۔

انور جلال میرے آنے سے جلدی جلدی تیار ہو جاتا ہے۔ پھر ہم بیڈن روڈ سے نکل کر مال روڈ پر آ جاتے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ہم گلی سے نکل کر بیڈن روڈ پر آئے ہیں اور سامنے پٹھان جوس والے کی دکان پر افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کھڑے جوس پی رہے ہیں۔ ہم انہیں ادب سے سلام کرتے۔ ان کی خیریت دریافت کرتے اور کچھ دیر تک ان کی دلچسپ باتیں سننے کے بعد مال پر آ جاتے۔ مال روڈ (شاہراہ قائداعظم) پر ان دنوں یہ افراتفری نہیں ہوتی تھی۔ کبھی کبھی کوئی کار گزرتی تھی۔ ویگن اسکوٹر، رکشا کا تو ابھی نام نشان بھی نہیں تھا۔ وقفے وقفے سے تانگے ہی گزرتے تھے۔ مال کی فٹ پاتھ دور تک خالی خالی ہوتی تھی۔ اوپر ہرے بھرے پیپل کے درختوں کا سایہ ہوتا تھا۔ اب یہ درخت بسوں رکشوں کے دھوئیں کی مار کھا کھا کر بدحال ہو گئے ہیں اور پہچانے نہیں جاتے۔ وہاں سے گزرتے ہوئے انہیں دیکھتا ہوں تو وہ مجھے اور میں انہیں حیرت سے تکتا رہ جاتا ہوں۔ جیسے ہم ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں کہ کیا ہم وہی ہیں جو ۵۰-۱۹۴۹ء میں تھے؟ اور یہ وہی سڑک ہے؟ ان دنوں مال کی فٹ پاتھ پر گزرتے ہوئے بڑا لطف آتا تھا۔ انور جلال کے قہقہوں کی آواز سن کر فٹ پاتھ کے درختوں کے پرندے اڑ جاتے تھے۔

پاک ٹی ہاؤس کی طرف جاتے ہوئے راستے میں ایک اسٹاپ اشفاق احمد کے داستان گو والے دفتر کا آتا تھا۔ ہم وہاں تھوڑی دیر کے لیے رک جاتے۔ چائے ہم ٹی ہاؤس کی طرف جاتے ہوئے راستے میں کہیں نہیں پیتے تھے۔ یہ ہمارے خوبصورت دن کی رسم افتتاح ہوتی تھی۔ ہر صبح کی

چائے کی پہلی پیالی کے اشتیاق اور شوق کو پاک ٹی ہاؤس کے لیے بچا کر رکھتے تھے۔ ٹی ہاؤس میں بیٹھ کر جب ہاف سیٹ چائے میں سے پیالیوں میں چائے انڈیلی جاتی تو ہم یوں خوش ہوتے اور خوشی سے ہمارے چہرے یوں چمکنے لگتے جیسے ہمیں کوئی انمول خزانہ مل گیا ہو۔ یہی ہماری چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہوا کرتی تھیں۔ انہی خوشیوں میں ہمیں زندگی کا سکون اور لذتیں ملتی تھیں۔ ہم بار بار سگریٹ بھی نہیں پیتے تھے۔ سگریٹ کی لذت کو بھی ہم خاص خاص موقعوں کے لیے اٹھا رکھتے تھے۔ یہ نہیں کہ بار بار سگریٹ سلگا رہے ہیں اور پیے جا رہے ہیں، نہیں ایسا کبھی نہیں ہوتا تھا۔ آج بھی بار بار سگریٹ نہیں پیتا۔ دن میں چند ایک سگریٹ پیتا ہوں اور خاص موقعے پر پورے اہتمام کے ساتھ پیتا ہوں۔ مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ اب سگریٹ پینے سے احتراز ہی کرنا چاہیے کیونکہ سگریٹ اب پہلے جیسے نہیں رہے نہ ان کا تمباکو معیاری ہے اور نہ کاغذ، وہ پرانا کاغذ ہے۔ پہلے سگریٹ کا کاغذ بھی چاولوں کی پچھ سے بنایا جاتا تھا۔ نامور افسانہ نگار اشفاق احمد کے رسالے ''داستان گو'' کا دفتر مال روڈ پر ریگل کے پاس ہی ایک بلڈنگ کی دوسری منزل میں تھا۔ یہ پہلی اور دوسری منزل کے درمیان ایک شاہ نشین یا گیلری سی تھی۔ جس میں دفتر بنایا گیا تھا۔ صرف ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ یہاں ہم تھوڑی دیر کے لیے رکتے۔ سلیم چودھری اور اشفاق احمد سے ملتے۔ ہنسی مذاق کی باتیں کرتے۔ کوئی لطیفہ سنتے، کوئی لطیفہ سناتے۔ ہمارے قہقہوں کی آوازیں نیچے مال روڈ تک جاتیں۔ اشفاق احمد بھی اس زمانے میں نوجوان، خوب صورت اور خوش لباس ہوتا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے ہمیشہ امریکی اداکار کرک ڈگلس یاد آ جاتا۔ اشفاق احمد جتنا عظیم افسانہ نگار ہے اتنا ہی بڑا مزاح نگار بھی ہے۔ افسوس کہ اس نے مزاح نویسی باقاعدہ طور پر نہیں کی۔ اپنے رسالے میں وہ فرضی نام سے اور کبھی کبھار اپنے نام سے مزاحیہ چیزیں لکھا کرتا تھا۔ اس کا رسالہ ''داستان گو'' اپنے سائز اور مندرجات کے اعتبار سے بالکل منفرد رسالہ تھا۔ اس رسالے کے کچھ پرچے آج بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔ داستان گو میں ملک کے مشہور و معروف ادیب اور شاعر لکھا کرتے تھے۔ اشفاق احمد نے کچھ نئے ادیبوں کو متعارف کروایا۔ بطور افسانہ نگار تو اشفاق احمد کی عظمت سے کسی کو بھی انکار نہیں ہوگا۔ واقعی وہ اردو کا بڑا ادیب ہے لیکن مجھے اس کی شخصیت سے بھی بڑا پیار ہے اور اسی پیار کی وجہ سے میں اس سے بہت زیادہ بے تکلف بھی ہوں۔ اس زمانے میں اشفاق احمد سے تقریباً روز ہی ملاقات ہوا کرتی تھی۔ اگرچہ وہ پاک ٹی ہاؤس کے باقاعدہ بیٹھنے والوں بلکہ اڈہ جمانے

والوں میں سے نہیں تھا، لیکن دن میں ایک پھیرا پاک ٹی ہاؤس کا ضرور مار لیا کرتا تھا۔ پہلے وہ بھی ہماری طرح پیدل تھا۔ پھر اس نے ایک سائیکل خرید لی اور اسی پر ٹی ہاؤس یا اپنے دفتر جاتا۔ اس کی رہائش مزنگ روڈ پر تھی۔ پھر وہ سمن آباد چلا گیا۔ میں وہاں بھی اس سے ملنے جایا کرتا۔ اب وہ ماڈل ٹاؤن میں آ گیا ہے اور بہت مصروف ہوتا ہے۔ میں بھی مصروف رہنے لگا ہوں۔ یہ دنیاداریوں کی مصروفیات ہیں جنہیں میں بہت ضروری اور بہت بیکار سمجھتا ہوں۔ کبھی کبھار ہی ملنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ جب ملتے ہیں تو خوب باتیں کرتے ہیں۔ خوب قہقہے لگاتے ہیں اور دنیاداریوں کی بیکار مصروفیتوں کی کلفتوں اور اذیتوں کو تھوڑی دیر کے لیے اپنے قہقہوں میں گم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

میں پھر پرسکون زمانے کی مال روڈ کی طرف آتا ہوں۔ میں اور انور جلال داستان گو کے دفتر سے اتر کر فٹ پاتھ پر چلتے باتیں کرتے ہنستے مسکراتے جنرل پوسٹ آفس میں آ کر نواز کو کاؤنٹر کے پیچھے سے باہر نکالتے جہاں وہ رجسٹریوں پر مہریں لگا رہا ہوتا۔ نواز بھی کیا محبت اور صرف محبت کرنے والا ہمارا دوست ہے۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ کاؤنٹر پھلانگ کر ہمارے پاس آ جاتا اور ہم تینوں پاک ٹی ہاؤس کی طرف چل پڑتے۔

میرے کچھ صنم خانے، کچھ چائے خانے پاک ٹی ہاؤس کے علاوہ بھی تھے۔ ان میں گوالمنڈی کے چائے خانے بھی تھے اور کچھ شہر کے اندر پھیلے ہوئے تھے۔ ان چائے خانوں میں بنچ پر یا بوسیدہ کرسیوں پر بیٹھ کر ابال ابال کر پاگل کی ہوئی چائے پینے کا کچھ اپنا مزہ ہوتا تھا۔

پاک ٹی ہاؤس کافی ہاؤس اور شیزان لارڈز وغیرہ کے اپنے دوسرے خوش پوش اور آسائش پسند دوستوں کے برعکس میں نے بڑی سخت زندگی گزاری تھی۔ دوسرے ملکوں میں فاقے بھی کیے تھے اور کشادہ سڑکوں کے فٹ پاتھوں پر سویا تھا اور اسی لاہور شہر کے ریلوے یارڈ میں کھڑے ریل گاڑیوں کے ڈبوں اور حضوری باغ میں بھی راتیں گزاری تھیں۔ اس لیے مجھے بوسیدہ چائے خانوں میں بیٹھ کر تیز پتی والی ابلی ہوئی چائے پینے کی بھی عادت تھی۔ یہ چائے اور گھٹیا سے گھٹیا سگریٹ بھی میرا کچھ نہیں بگاڑتا تھا۔ بلکہ زمرد رنگ کی کیتلی میں سے نکلی ہوئی چائے اور ہتھوڑے کا سگریٹ پی کر مجھے بڑی خوشی ہوتی۔ یہ خوشی آج بھی مجھے ویسے ہی ہوتی ہے۔ زندگی کی بھٹی میں تپ کر میں کندن تو نہیں بن سکا لیکن سخت جان ضرور ہو گیا ہوں اور یہ سخت جانی آج بھی میرے

مزاج کا حصہ ہے۔ فائیو اسٹار ہوٹل کے پرسکون لاؤنج میں بیٹھ کر خوشبودار لطیف چائے پی کر گالز وردی کے سیب کے درخت اور مائیکل اینجلو کی مونا لیزا کی دنیاؤں کی سیر بھی کر لیتا ہوں اور کاموں کی منڈی کے موڑ پر کسی بھی چائے کی دکان میں اپنے ڈرائیور بھائیوں کے ساتھ بیٹھ کر چائے اور ہتھوڑے کے سگریٹ پینے میں بھی لطف محسوس کرتا ہوں۔

اس زمانے میں اکبری منڈی کے اندر ایک تنگ بازار میں خلیفے نے اپنا چائے خانہ کھولا تو ہم امرتسری دوست گوالمنڈی سے اٹھ کر خلیفے کے چائے خانے میں آگئے۔ درمیانے قد اور مضبوط جسم والا سرخ وسفید خلیفہ ہمیں دیکھ کر بڑا خوش ہوا۔ یہ کشمیری نژاد امرتسری خوش ہو کر اور زیادہ سرخ ہو گیا۔ اس نے بڑی محبت سے ہمارے لیے دودھ پتی والی چائے کی کیتلی تیار کر کے ہمارے سامنے رکھ دی۔ امرتسر کی مارکیٹ حکم سنگھ میں بھی خلیفے کی چائے کی دکان تھی۔ وہاں دودھ پتی والی چائے کو ڈبے والی چائے کہا جاتا تھا۔ یعنی ڈبے میں دودھ پتی ڈال کر اسے جوش دیا جاتا۔ یہ تانبے کا گول ڈبہ خاص طور پر خلیفے نے دودھ پتی چائے کے لیے بنوایا تھا۔ ہم نئے نئے امرتسر سے ہجرت کر کے لاہور آئے تھے بچھڑے ہوئے دوستوں کی باتیں شروع ہو گئیں۔ فلاں کہاں رہتا ہے؟ کیا بشیر اپنے محلے سے نکل آیا تھا؟ رفیق مجھے والٹن کیمپ میں ملا تھا۔ خلیفہ ہمارے لیے پان اور سگریٹ تھال میں سجا کر لے آیا۔ یہ اس کی محبت اور خلوص تھا۔ ہم دیر تک خلیفے کے چائے خانے میں بیٹھے باتیں کرتے اور چائے پیتے رہے۔ خلیفہ بھی اڈے پر لڑکے کو بٹھا کر ہمارے پاس آگیا ہے۔ مجھے یاد ہے اسی دوران ایک آدمی نے آ کر خلیفے سے کہا کہ چودھری صاحب بلاتے ہیں۔ خلیفے نے وہیں سے جواب دیا:

”نہیں کہو ذرا ٹھہر کر آؤں گا۔“

وہ آدمی بولا ”خلیفہ تمہاری آڑھت کی کمیشن کا معاملہ ہے۔ آ کر اپنی رقم ہی لے جاؤ۔“ خلیفے نے پلٹ کر کہا:

”او یار تمہیں کہہ دیا ہے کہ ذرا ٹھہر کر آؤں گا دیکھتے نہیں میرے یار آئے ہوئے ہیں۔“

اور وہ آدمی حیرت سے سر کو ہلاتا چلا گیا کہ یہ کیسا آدمی ہے کہ جس کو کمیشن کی رقم سے زیادہ اپنے یار عزیز ہیں۔ وہ آدمی نہیں جانتا تھا کہ یہ امرتسری مزاج ہے جس کا مظاہرہ خلیفے نے کیا تھا۔

یعنی پہلے یار کی یاری اور پھر دنیا داری...... خلیفے کے چائے خانے میں جانا ہوتا تو اس سے ملاقات ہو جاتی۔ پھر فاصلے پڑتے گئے۔ لاہور میں ہجوم بڑھتا گیا۔ پیاروں کے چہرے ویگنوں، بسوں ٹرکوں کی اوٹ میں اوجھل ہوتے چلے گئے اور ان ہی چہروں میں خلیفے کا سرخ و سفید چہرہ بھی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اب یہ چہرہ نظر نہیں آتا۔

ایک ایسا ہی چھوٹا سا چائے خانہ پانی والے تالاب میں ہوا کرتا تھا۔ یہ چائے خانہ مشہور ادیب شاعر اور حکیم ظفر عسکری کے مطب کے پہلو میں ٹیوب ویل کے پاس ہوا کرتا تھا۔ حکیم ظفر عسکری بھی کیا دلکش شخصیت کے مالک تھے، خوش شکل، وجیہہ خوش لباس، خوش گفتار مشرقی ادب آداب کی قدیم روایات کے پابند۔ جب بھی ملتے چہرے پر ایک دلکش مسکراہٹ کھلی ہوتی۔ ایک بار سخت سردیوں کے موسم میں میں ان سے ملنے ان کے مطب میں گیا۔ کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ شاید اس روز لاہور میں بارش بھی ہوئی تھی۔ حکیم صاحب نے کمرے میں ایک بہت بڑی انگیٹھی رکھی ہوئی تھی جس میں کوئلوں کی آگ دہک رہی تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی یوں لگا جیسے شدید برف باری سے نکل کر کسی گرم پر سکون کاٹج میں آ گیا ہوں۔ ان دنوں ہمارا قیام شیشہ موتی بازار میں تھا۔ یہاں ایک تنگ سی گلی میں ہمیں ایک چار منزلہ مکان الاٹ ہو گیا تھا جس کی ہر منزل کا بوسیدہ چھجا آگے کو جھکا ہوا تھا۔ ہمارے مکان سے دو تین مکان چھوڑ کر معروف نقاد اور میرے امرتسر کے دوست سید مظفر علی سید کو مکان الاٹ ہوا تھا۔ ابھی قیام پاکستان کو سال ڈیڑھ سال ہی گزرے ہوں گے۔ اس محلے میں سبھی مشرقی پنجاب کے پناہ گزین آباد تھے۔ جہاں گلی آگے جا کر بند ہو جاتی تھی وہاں ایک مکان میں پٹیالے کا ایک کنبہ آباد تھا۔ اس مکان سے ایک ضعیف العمر بوڑھا صبح کو نکل کر باہر ٹوٹی ہوئی چارپائی پر بیٹھ جاتا اور وہاں سے جو بھی گزرتا اس سے کمزور کپکپاتی آواز میں اپنے جوان بیٹے رفیق کے بارے میں پوچھتا کہ وہ پٹیالے میں آیا ہے کہ نہیں؟ رفیق اس کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا جسے سکھوں نے پٹیالے کے ایک بازار میں شہید کر دیا تھا۔

میں چائے خانے کی بات کر رہا تھا جو حکیم ظفر عسکری کے مطب کے پہلو میں ایک چھوٹی سی نیم روشن دکان میں تھا۔ یہاں ایک قلعہ بیچنے والا بھی ہوا کرتا تھا۔ اس کا قلفہ سارے علاقے میں مشہور تھا۔ چائے خانہ معمولی سا تھا مگر وہاں مکس چائے بڑے کمال کی ملتی تھی۔ میں اور آرٹسٹ

بھائی وہاں چائے پینے جاتے۔شاید وہ زمانہ ہی خالص اور غیر ملاوٹی تھا۔چائے سامنے بیٹھی باتیں کرتی دکھائی دیتی تھی۔کیا ذائقہ تھا، کیا خوشبو تھی۔چائے پی کر بھی جی چاہتا کہ کوئی افسانہ لکھا جائے۔ سبز جنگلوں میں سفر کرنے والے قافلوں کا افسانہ، سردیوں کی بارش کا افسانہ جس طرح میرے زمانے کے ترقی پسند دوست غریبوں مزدوروں کے بارے میں نظمیں افسانے لکھا کرتے تھے میں ایسا نہیں کرتا تھا۔میں غریبوں میں مزدوروں کے بارے میں خاص طور پر ارادہ کر کے کبھی کچھ نہیں لکھتا تھا۔شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ میں خود غریب اور مزدور ٹائپ تھا یعنی لکھ کر کماتا اور گزارا کرتا تھا۔مجھے اپنی غریبی اور اس غریبی کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسائل سے صرف اس حد تک دلچسپی تھی کہ میں کوئی مضمون یا افسانہ لکھ کر پیسے لاتا اور میرے مسائل حل ہو جاتے تھے۔میں ان کا پراپیگنڈا نہیں کرتا تھا۔آدمی محنت سے کام کرے، کسی سے قرض نہ لے اور دولت پیدا کرنے کے لالچ میں نہ پڑے تو معاشی الجھنوں سے بچا رہتا ہے۔زیادہ تر ہمارے مسئلے اسی لیے پیدا ہوتے ہیں کہ ہم محنت سے جی چراتے ہیں۔اپنی ڈیوٹی دیانتداری سے ادا نہیں کرتے۔بس یہ چاہتے ہیں کہ کم سے کم کام کریں اور زیادہ سے زیادہ آرام کریں جبکہ ہمارا دین اسلام ہمیں دیانتداری سے اپنا فرض ادا کرنے اور محنت سے کام کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ہم بڑے اطمینان سے دودھ میں پانی ملا دیتے ہیں۔آٹے سے سوجی میدہ نکال لیتے ہیں۔جعلی ٹیکے تیار کر کے دکانداروں کو سپلائی کر دیتے ہیں۔مرچوں میں اینٹوں کا چورا ملا دیتے ہیں۔ہمیں سڑکیں بنانے کا ٹھیکہ ملتا ہے تو مسالہ پورا نہیں ڈالتے جس سے سڑکیں ٹوٹ پھوٹ جاتی ہیں اور بارشوں میں وہاں تالاب بن جاتے ہیں۔

یہاں مجھے میڈیکل کی ایک طالبہ کے خط کا خیال آ گیا ہے جو پرسوں کی ڈاک میں مجھے ملا تھا۔یہ خط فاطمہ جناح میڈیکل کالج کی ایک طالبہ نے میرے نام لکھا ہے۔میں اس کا نام یہاں نہیں لکھوں گا۔وہ لکھتی ہیں:

"محترم اے حمید صاحب!...... میں نوائے وقت میں آپ کا کالم "بارش، سمادار، خوشبو" باقاعدگی سے پڑھتی ہوں بلکہ جمعہ میگزین ہی اس لیے پڑھتی ہوں کہ اس میں آپ کا لکھا ہوا کالم ہوتا ہے۔اس سے پہلے بھی آپ نے جو بھی جمعہ میگزین میں لکھا ہے۔ہم اسے پڑھتے تھے۔آپ بہت معلوماتی باتیں لکھتے ہیں۔تفریح بھی ہو جاتی ہے اور تاریخ بھی معلوم ہو جاتی ہے...... میں کوئی ایسی باذوق قاری نہیں ہوں۔بہرحال آپ کی تحریر میں

زمانے کا کوئی غم نہیں ہوتا۔کوئی الجھن نہیں ہوتی اور نہ ہی کوئی تصوراتی بات ہوتی ہے۔اس لیے اچھی لگتی ہے۔ ہماری آپ سے درخواست ہے کہ اس سلسلے کو بند مت کیجیے گا۔آپ اپنے کالم میں بارش کا بہت ذکر کرتے ہیں اور اسے بہت ہی خوبصورت گردانتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس قدر گند کیچڑ والے موسم میں آپ کو کیا خوبصورتی نظر آجاتی ہے۔آپ کیا جانیں کہ جب صبح کالج کے لیے نکلیں اور بارش ہو جائے تو انسان کو کن مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے جبکہ جانا بھی ویگن میں ہو۔سڑک پر ٹخنوں سے اوپر تک پانی کھڑا ہو تو انسان کو اپنے بے قصور جوتوں پر کتنا ترس آتا ہے اور اگر بارش کی وجہ سے کالج نہ جا سکیں اور اگلے دن ڈاکٹر صرف ایک لیکچر اٹینڈ نہ کرنے کی پاداش میں ہمیں آنے والے ٹیسٹ میں سپلی دے دیں تو کتنا ڈپریشن ہوتا ہے۔آپ کو معلوم ہو گا کہ میڈیکل میں پڑھائی کتنی مشکل ہوتی ہے۔اوپر سے پاس پرسنٹیج بھی پچاس فیصد ہوتی ہے۔آپ خود ہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اتنی ہمت سے پاس کیے گئے ٹیسٹ میں صرف بارش کی وجہ سے فیل ہونے پر ایک انسان کے کیا جذبات ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ بھی بارش کتنے مسئلے پیدا کرتی ہے۔اتنا تو آپ بھی جانتے ہوں گے کہ بارشوں میں غریبوں کے جھونپڑے بہہ جاتے ہیں۔ان لوگوں کے لیے یہ بارش کتنی خطرناک ہوتی ہے۔پھر اس موسم میں بیماریاں بھی کتنی پھیلتی ہیں اور حادثات کی شرح بھی بڑھ جاتی ہے۔آپ اپنے کالم کے ذریعے بتائیے کہ اتنی مشکلات پیدا کرنے والی بارش میں کون سی حسین بات ہے۔آپ کو میرا خط انتہائی خشک معلوم ہو گا لیکن اس میں ہمارا قصور نہیں ہے۔کیونکہ ہماری میڈیکل کی کتابوں میں خطوں کے لکھنے کے بارے میں کوئی طریقہ نہیں بتایا گیا۔جواب ضرور دیجیے گا۔......فقط......"

فاطمہ جناح میڈیکل کالج کی اس ہونہار طالبہ نے اپنے خط میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ بالکل درست ہیں۔یہ سب مسائل اپنی جگہ پر موجود ہیں اور بارش کے بعد جو کیچڑ پھیل جاتا ہے، میں بھی اس میں سے پیدل چل کر گزرتا ہوں۔میرے پاس کوئی کار نہیں ہے کہ میں اپنے حصے کے کیچڑ کو دوسروں پر اچھالوں۔دوسری بات یہ ہے کہ جو خدا آسمانوں سے بارش برساتا ہے اسی نے میرے دل میں بارش کی محبت بھی پیدا کر دی ہے۔آپ مجھے اٹھا کر سڑک کے کیچڑ میں

پھینک سکتے ہیں، مگر میرے دل سے بارش کی محبت کو نہیں چھین سکتے ہیں۔

یہ کیچڑ، یہ جھونپڑے، یہ ٹوٹی ہوئی سڑکیں، ان سڑکوں کے گڑھے ہم نے پیدا کیے ہیں بارش نے نہیں، سڑکوں کے گڑھے بارش سے پہلے موجود ہوتے ہیں۔ بارش کا پانی تو قدرت کے اس اصول کے تحت ان میں بھر جاتا ہے کہ پانی اپنی سطح ہمیشہ ہموار رکھتا ہے۔ ہماری سڑکوں پر مٹی اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیر بارش سے پہلے ہی موجود ہوتے ہیں۔ یہ مٹی اور کوڑا کرکٹ بارش سے مل کر کیچڑ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ بارش کیچڑ نہیں برساتی۔ بارش تو اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔ ہم خود اس نعمت کو مٹی میں ملاتے ہیں۔



لاہور کا باغ جناح

باغ جناح لاہور میں ایک بڑا ارسٹو کریٹ قسم کا قدیم درخت ہے۔ اس درخت سے میری پاکستان بننے سے پہلے کی دوستی ہے۔ میں جب کبھی باغ جناح جاؤں تو اس درخت سے ضرور ملاقات کرتا ہوں۔ یہ درخت اوپن ایئر کینٹین کے قریب ہی رہتا ہے۔ میں ہاف سیٹ چائے منگوا کر اس درخت کے نیچے گھاس پر بیٹھ جاتا ہوں۔ ایک پیالی اپنے لیے اور ایک اپنے اس درخت دوست کے لیے بناتا ہوں۔ درخت کی پیالی والی چائے میں اس کے تنے کے قریب رکھ دیتا ہوں اور پھر ہم دیر تک باتیں کرتے ہیں۔ پچھلے دنوں میں کافی دیر کے بعد اپنے اس دوست درخت سے ملنے گیا تو دیکھا کہ وہ پہلے ایسا سر سبز و شاداب نہیں تھا میں نے اس کے تنے کو ہاتھ لگایا تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ بہت آہستہ آہستہ سانس لے رہا تھا۔ میں نے اس کی خیریت پوچھی تو ایک سرد آہ بھر کر بولا:

مجھے ان لوگوں نے بیمار کر دیا ہے۔ جو یہاں سیر کرنے آتے ہیں۔ چند ایک صحت مند لوگوں کو چھوڑ کر باقی سب ایسے ہیں جو گیس کے مریض ہیں۔ صبح صبح میری آکسیجن لے جاتے ہیں اور مجھے اپنی گیس ٹربل دے جاتے ہیں۔ ان میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جن کو ڈاکٹروں نے نسخے میں صبح کی سیر دوائی کے طور پر لکھ دی ہے۔ بعض لوگ صرف سیاست، انکم ٹیکس، پنشن، جائیداد کے مقدموں اور اسٹاک ایکسچینج ہی کی باتیں کرتے ہیں۔ ان کی باتیں سن سن کر میری ٹہنیوں کے پتے زرد ہونے لگے ہیں۔ مجھے ان کی غیر قدرتی یعنی ان نیچرل باتیں سننی ہی پڑتی ہیں۔ کیوں کہ میں یہاں سے بھاگ نہیں سکتا۔ تم بھاگ کر پاک ٹی ہاؤس چلے جاتے ہو۔ میرے پاؤں زمین نے پکڑ لیے ہیں۔ میں کہاں جاؤں؟ بس میری بیماری کی یہی وجہ ہے۔ میں کچھ کہنے لگا تو درخت نے اپنی ٹہنی میرے کندھے پر رکھ دی اور کہا:

''چھوڑو یار ان باتوں کو۔ ہاٹ سیٹ چائے منگواؤ۔ اس شہر میں ایک ہی شے پینے والی رہ گئی ہے۔ جب سے تم گئے ہو چائے کو ترس گیا ہوں۔''

میں نے اوپن ایئر کیفے سے ہاف سیٹ چائے منگوائی اور ایک پیالی اپنے درخت دوست

کے لیے بنا کر اس کے تنے کے پاس رکھ دی۔ اس کے بعد ہم باتیں کرنے لگے۔ درخت نے کہا "زمانہ بڑا بدل گیا ہے۔ کبھی لوگ صرف ہمیں دیکھنے، ہماری ٹہنیوں پر کھلے ہوئے پھولوں کو دیکھنے کے لیے سیر کرنے آیا کرتے تھے۔ اب ایسے نیچر پرست لوگ بہت کم رہ گئے ہیں۔ زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہے جو زیادہ کھانے، زیادہ آرام کرنے اور کوئی کام نہ کرنے کی وجہ سے قسم قسم کی سمجھ میں نہ آنے والی بیماریوں میں مبتلا ہو گئے ہیں اور ہانپتے ہوئے صبح شام میرے نیچے سے گزرتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہوئے بیماریوں کے ایسے ایسے نام لیتے ہیں کہ میرے ٹہنیوں کے پتے اپنا سانس روک لیتے ہیں۔

درخت خاموش ہو گیا۔ میں نے دیکھا اس کی پیالی کی آدھی چائے ختم ہو چکی تھی۔ کہنے لگا، "یار آج چائے بڑی نیچرل ہے۔ میرا مطلب ہے تم نے اسے ہلایا نہیں ناں اور اس میں چینی بھی نہیں ڈالی۔ یہی فرسٹ امپریشن چائے ہے۔" میں نے سگریٹ سلگا لیا۔ اعلیٰ کوالٹی کے خاندانی سگریٹ کی خوشبو اڑی تو درخت نے گہرا سانس بھرا اور بولا:

"لوگ سگریٹ پی کر مرنے لگے ہیں۔ موت کتنی ارزاں ہو گئی ہے۔ اصل میں اکثر لوگوں پر موت کا خوف طاری ہو گیا ہے۔ کیونکہ ان کے پاس چھوڑ کر جانے کے لیے بہت کچھ ہے۔ انہوں نے دنیا کے ان نیچرل کاموں میں اپنے بدن پر اتنی کنڈیاں پھنسا رکھی ہیں کہ جب موت آ کر کنڈیاں کھینچتی ہے تو ان کا جسم چھلنی ہو جاتا ہے۔ نیچرل آدمی تو موت کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر زندگی کا سفر کرتا ہے۔"

درخت پھر چپ ہو گیا۔ وہ چائے پی رہا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس کی پیالی میں سے چائے ختم ہو رہی ہے۔ میں درخت کے پاس بڑا خوش بیٹھا تھا اور میرے چہرے پر اپنے آپ مسکراہٹ آ رہی تھی۔ درخت بولا:

"یار لوگ اپنی تاریخ کو بھی نہیں پڑھتے۔ تم نے ضرور پڑھا ہو گا کہ جب مولانا روم کا آخری وقت آیا تو بستر کے پاس بیٹھے ان کے شاگرد رونے لگے۔ مولانا روم نے آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا اور فرمایا میرے اور خالق حقیقی کے درمیان ایک ہی حجاب باقی رہ گیا تھا جسے میں نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اب وہ پردہ اپنے آپ اٹھ رہا ہے تو تم آنسو کیوں بہاتے ہو۔ یہ تو خوش ہونے کا وقت ہے۔"

درخت کی آواز خاموش ہوگئی۔ چینک میں تھوڑی سی چائے ابھی باقی تھی۔ یہ چائے کا سنہری قہوہ تھا۔ بلکہ چائے کی تلچھٹ تھی۔ میں اسے اپنی پیالی میں ڈالنے لگا تو درخت نے کہا، "نہیں نہیں یار...... اسے میری پیالی میں ڈال دو۔"

میں نے قہوہ درخت کی پیالی میں انڈیل دیا۔ درخت اسے دودھ اور چینی کے بغیر ہی پی گیا۔ نیچر چائے کی تلچھٹ نے درخت کی شاخوں اور اس کے پتوں کو روشن کر دیا تھا۔ کہنے لگا:

"آوا ہی الٹ گیا ہے۔ ہر شے ان نیچرل ہوگئی ہے درختوں کا ہاتھ بھی قدرت کے ہاتھ سے چھوٹ رہا ہے۔ یہاں اسی باغ میں میرے کئی رشتے دار درخت غیر قدرتی طور پر پیدا ہوئے ہیں۔ لوگ ساٹھ ساٹھ لاکھ کی کوٹھیوں .... میں خوشی تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ میری جڑوں کی انگلیاں زمین کی نبض پر ہیں۔ ہم سب زمین کے بیٹے ہیں اور ہمیں اسی زمین میں واپس جانا ہے۔ خوشی نہ جھونپڑیوں میں ہے نہ ساٹھ لاکھ کے بنگلے میں...... تو پھر کہاں ہے خوشی؟"

درخت چپ ہوگیا۔ مجھے اس کی دبی دبی ہنسی کی آواز آ رہی تھی۔ میں بھی ہنسنے لگا۔ ہوا کے آزاد بے پروا جھونکے درخت کی شاخوں میں سے سرسراتے ہوئے گزرے تو درخت کے پتے بھی کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔ درخت نے مجھ سے پوچھا:

"اب تم یہاں صبح کی سیر کو کیوں نہیں آتے؟ پہلے تم روز منہ اندھیرے آیا کرتے تھے۔ صبح صبح تم سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ پچھلے پہر گرنے والی شبنم بھی مجھ سے تمہارا پوچھ رہی تھی۔"

میں ہنس رہا تھا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم جا رہے ہو...... پھر کب آؤ گے۔" درخت نے پوچھا۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور مسکراتا ہوا پلاٹ میں سے نکل گیا۔ درخت نے ٹھیک کہا تھا۔ پہلے میں تقریباً روز باغ جناح صبح کی سیر کرنے جایا کرتا تھا۔ ان دنوں میں فلیمنگ روڈ پر رہتا تھا۔ صبح صبح اٹھ کر میں لاہور ہوٹل "منٹگمری روڈ اور چیئرنگ کراس سے ہوتا ہوا باغ جناح میں داخل ہو جاتا۔ اس باغ میں مجھے ہمیشہ تنگ اور غیر قدرتی ماحول کا احساس ہوتا۔ ابھی باغ جناح کو لارنس باغ ہی کہا جاتا تھا اور ایک جگہ لوکاٹ کے درخت ہی تھے جن کے سائے میں ایک چھوٹی سی نہر بلکہ

نالہ بہتا تھا۔ یہ نالہ مجھے کمپنی باغ کی نہر کی یاد دلاتا تھا۔ اس لیے مجھے بڑا اچھا لگتا۔ لوکاٹ کے درختوں سے بھی میری بچپن کی ایسوسی ایشن تھی۔ ۱۹۴۷ء میں جب میں نے پہلی بار کوہ مری کے راستے میں چھتر اور بری پور ہزارے میں لوکاٹ کے باغ در باغ دیکھے تو مجھ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

باغ جناح کے یہ لوکاٹ کے درخت اوپن ایئر کیفے کے سامنے والے پلاٹ میں تھے۔ لوکاٹ کے کیسری رنگ کے گچھے نالے پر جھکے ٹھنڈے پانی کے گدلے شیشے میں اپنا عکس دیکھنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ نہر کی بھی اپنی ایک خوشبو ہوتی ہے۔ یہ مرطوب اور سبز گیلی خوشبو ہوتی ہے۔ مجھے ہمیشہ یوں محسوس ہوتا جیسے میں سانس کے ساتھ خوشبو پی رہا ہوں۔ باغ جناح کی اس چھوٹی سی ٹھنڈی نہر کی بھی ایک خوشبو اور ایک آواز ہوتی تھی۔ سرسراتی سرگوشی ایسی آواز۔ جیسے نہر کا پانی لوکاٹ کے درختوں سے باتیں کرتا گزر رہا ہو۔ پھر باغ جناح ترقی کرتا گیا۔ روشوں پر قدرتی مٹی کی جگہ پتھر ڈال دیا گیا۔ لوگوں کی تفریح کی خاطر باغ کو نیچر سے دور کر دیا گیا۔ صبح کی سیر کو میں نیچر کی عبادت کا درجہ دیتا ہوں۔ میں کبھی کسی بیماری سے نجات پانے کے لیے یا عادت سے مجبور ہو کر صبح کی سیر کرنے نہیں گیا۔ نہ ہی میں نے سیر کو ایک سخت اصول کے طور پر اپنایا ہے۔ بس منہ اندھیرے کی تازہ ان چھوئی شبنمی ہوا اور اندھیرے میں ستاروں کی طرح نظر آنے والے سفید گلابوں اور موتیے کی پھولوں کی سرگوشیاں مجھے بستر سے اٹھا کر اپنے پاس لے آتی ہیں۔ امرتسر میں بھی میں کمپنی باغ سے بہت کم صبح کی سیر کو جاتا تھا۔ ہر روز صبح منہ اندھیرے میرا رخ چالی کھوہ کی جانب ہوتا جہاں قدرتی ماحول تھا اور حد نگاہ تک کھیت ہی کھیت پھیلے ہوتے۔ یہاں بنانے والی ریلوے لائن کے پیچھے لوکاٹ، امرود اور ناشپاتیوں کے بہت باغ تھے۔ ان میں دیسی ناخ کے اونچے اونچے قدرے گھنے درخت بھی تھے اور بگوگوشے کے نازک اور چھریرے درختوں کے باغ بھی تھے۔ بہار کے دنوں میں میں پچھلے پہر کے اندھیرے میں پھول توڑ کر گھر لے آتا۔ ان پھولوں کو ناشپاتیاں بننا ہوتا تھا، مگر وہ گلدان میں اپنی اپنی منزل تک نہیں پہنچتے تھے۔ پھر میں نے پھلدار درختوں کے پھول توڑنا ترک کر دیا تھا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ امرتسر میں ہمارا مکان ایک ایسے علاقے میں تھا جو امرتسر کا کشادہ اور سرسبز علاقہ تھا۔ یعنی وہاں سے کمپنی باغ پندرہ منٹ کے فاصلے پر تھا۔ میں بہت چھوٹا تھا۔ میرے پہلوان والد صاحب مجھے اذان سے پہلے بستر سے اٹھا کر

اپنے ساتھ لائن پار والی بمبئی کے پاس شیخ چلی کے اکھاڑے میں لے جاتے تھے اور مجھے اکھاڑے میں ادھر ادھر پھینکا کرتے تھے۔ یہ منظر مجھے دھندلے خواب کی طرح یاد ہے۔ اس اکھاڑے کی چاروں طرف امرود کے بڑے بڑے درخت تھے۔ ان درختوں میں سے کچے امرودوں کی مہک آیا کرتی تھی۔ جوں جوں بڑا ہوتا گیا درختوں، نہروں، کھیتوں شبنم طلوع آفتاب اور منہ اندھیرے کے مرطوب پاکیزہ دھندلکوں سے میری محبت بڑھتی چلی گئی۔ امرتسر سے ہجرت کر کے لاہور آیا تو شادباغ کے کھیتوں اور دور شاہ حسین کے مزار تک جاتے ناشپاتیوں کے باغوں نے امرتسر کے باغوں کو بھلا دیا۔ ہمارا گھر مصری شاہ میں تھا۔ میں تڑکے اٹھ کر ان کھیتوں میں جا کر بدن پر تیل مل کر ورزش کرتا۔ گلاب کے پھولوں کا گلدستہ بناتا اور اذان ہو رہی ہوتی تھی کہ میں اپنے گھر میں داخل ہوتا۔ یہاں سے فلیمنگ روڈ پر آیا تو سیر گاہوں کی قدرتی فضا مجھ سے جدا ہو گئی۔ اب باغ جناح کے جدید فیشن کے انداز میں بنائے گئے پلاٹ اور باغ کے اندر تک جاتی تارکول کی چھوٹی سڑکیں تھیں۔ باغ میں تارکول کی سڑک مجھے کبھی برداشت نہیں ہو سکی۔ دوسرے جب سیر کر کے واپس آتا تو منٹگمری روڈ پر بھنگی جھاڑو دے رہے ہوتے اور گرد و غبار اڑ رہا ہوتا تھا۔ پھر بھی میں ہفتے میں تین چار بار باغ جناح سیر کرنے ضرور جاتا۔ میرے لیے وہاں سب سے بڑی کشش گلستان فاطمہ میں لگے ہوئے خوب صورت ولایتی گلاب تھے۔ میں قینچی اور بڑا لفافہ گھر سے لے کر آتا۔ ان ولایتی گلابوں کی کیاریوں کے پاس کھڑا ہو جاتا۔ قینچی اور لفافہ پودوں کے پاس رکھ دیتا۔ پھر بازو اوپر لے جا کر انہیں زمین کے ساتھ یوں بار بار لگاتا جیسے میں ورزش کر رہا ہوں۔ یعنی اگر دور سے کوئی مالی صبح کی نیم روشن فضا میں مجھے دیکھ بھی رہا ہو تو وہ یہی سمجھے کہ میں ورزش کر رہا ہوں۔ جونہی میں بازو اوپر سے نیچے زمین پر لاتا وہاں پہلے سے قینچی پڑی ہوتی تھی۔ جلدی سے ایک گلاب کی ٹہنی کاٹ ڈالتا۔ دس بارہ دفعہ اوپر نیچے ہاتھ لے جانے کے بعد پودوں کے پاس دس بارہ لمبی ٹہنیوں والے گلابوں کی لاشیں پڑی ہوتی تھیں۔ میں انہیں بڑی احتیاط سے لفافے میں ڈالتا اور یوں مزے مزے سے گلستان فاطمہ کی قیمتی کیاریوں سے باہر نکل آتا جیسے مجھے جانے کی کوئی جلدی نہیں ہے۔ لیکن جونہی میں لارنس روڈ والے گیٹ کے قریب پہنچتا تو اتنی تیز چلنے لگتا جیسے میرے پیچھے پولیس لگی ہو۔ یہ گلاب میرے فلیمنگ روڈ والے کمرے میں کئی کئی دن تک کھلے رہتے۔ میں روز گلدانوں کا پانی بدلتا۔ گلابوں کی ٹہنیاں تھوڑی نیچے سے کاٹتا۔ کبھی پانی میں تھوڑا سا نمک بھی

ڈال دیتا۔ پھر ایسا ہوا کہ ہم سمن آباد آ گئے۔

یہ شاید ۶۵ء کے ایک سال بعد کی بات ہے۔ ان دنوں سمن آباد میں قدرے سکون تھا اور ابھی آس پاس کی کالونیاں نہیں بنی تھیں جہاں ہم نے مکان لیا وہ سمن آباد کا نسبتاً پرسکون اور خوبصورت علاقہ تھا۔ یعنی یہاں باغ اور پلے گراؤنڈ تھی مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ صبح کی سیر کے لیے مجھے ایک باغ مل گیا ہے۔ اگرچہ یہ باغ، باغ جناح اور کمپنی باغ تو نہیں تھا، لیکن پھر بھی اس میں قدامت کی ایک جھلک ضرور تھی اور کیاریوں میں گلاب گیندا اور موتیے کے پودے لگے تھے۔ این ٹائپ کے بہت کم مکان ابھی کوٹھیوں میں تبدیل ہوئے تھے۔ کچھ پرانی طرز کی اونچی چھت کے برآمدوں والی کوٹھیاں ضرور تھیں۔ ہمارے مکان سے تھوڑی دور باغ کے کونے پر ایک دومنزلہ کوٹھی تھی۔ اس کی محرابیں اور ستون الحمرا کے محلات کی یاد تازہ کرتے تھے۔ اس کوٹھی کے باہر ایک بزرگ کرسی پر بیٹھے اکثر دکھائی دیتے۔ ان کی شکل میرے دادا جان سے کافی ملتی جلتی تھی۔ وہ مجھے بڑے اچھے لگتے۔ میں آتے جاتے انہیں سلام کرنا کبھی نہیں بھولتا تھا۔ گرمیوں میں ان کے ہاتھ میں کھجوری پنکھا ہوتا تھا اور سردیوں میں وہ کمبل اوڑھے ہوتے۔ سفید ڈاڑھی، نورانی مسکراتا چہرہ، آج وہ دومنزلہ کوٹھی تو ویسے ہی ہے مگر وہ بزرگ دکھائی نہیں دیتے۔ ان کی کرسی بھی برآمدے میں سے اٹھالی گئی ہے۔ سمن آباد کافی بدل گیا ہے۔ نئی نئی ماڈرن کوٹھیاں بن گئی ہیں۔ مگر یہ دومنزلہ کوٹھی ویسی کی ویسی ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔ صبح سیر کرتے ہوئے جب میں اس کوٹھی کے قریب سے گزرتا ہوں تو مجھے بے اختیار وہ نورانی چہرے والے بزرگ یاد آجاتے ہیں۔ میں انہیں کوٹھی کے برآمدے میں کرسی پر بیٹھے دیکھتا ہوں۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا دیتے ہیں اور میں دل ہی دل میں انہیں سلام کرکے آگے نکل جاتا ہوں۔ مسجد خضرا والی گراؤنڈ پہلے کافی کشادہ تھی۔ اس کی ایک جانب باغ کے قطعے تھے جن کی کیاریوں میں دیسی اور ولایتی گلاب کے بے شمار پودے ہوا کرتے تھے۔ گرمیوں میں ایک گول قطعے میں جو موتیے کے پودے لگے تھے، ان میں موتیے کے سفید پھولوں کے چہرے پچھلے پہر کے کافوری اندھیرے میں ستاروں کی طرح ٹمٹماتے نظر آتے۔ میں ان جھاڑیوں میں گھس جاتا اور رومال بھر کر موتیے کے پھول لا کر اپنی میز پر رکھ دیتا۔ سارا دن میرا کمرہ موتیے کی خوشبو سے مہکتا رہتا۔ اس باغ میں یوکلپٹس کے درخت بھی لگائے گئے تھے۔ مگر انہیں لوگ اکھاڑ کر لے گئے۔ پھر موتیے کی جگہ کانٹے دار پودے لگا دیے گئے جنہیں کوئی

پھول نہیں لگتا تھا۔ گیندے کی کیاریاں بھی ویران ہونے لگیں۔ میں نے ایک مالی سے بات کی تو اس نے کہا:

''کیا کریں جی۔ لوگ کوئی پھول پودا چھوڑتے ہی نہیں۔ کچھ اکھاڑ کر لے جاتے ہیں جو پودے بچ جاتے ہیں انہیں ان کے دنبے کھا جاتے ہیں۔''

میں نے اپنی آنکھوں سے ۱۳ لوگوں کو کلہاڑی، آری اور دنبے لے کر باغ میں گھستے اور شہتوت کے درخت کا قتل عام کرتے دیکھا ہے۔ اسکول کی دیوار کے ساتھ ساتھ کارپوریشن نے کئی بار خوب صورت سایہ دار درختوں کے پودے لگائے مگر اسکول کے بچوں نے ایک بھی نہ چھوڑا۔ سب پودے اکھاڑ کر پھینک دیئے۔ کارپوریشن نے باغ کے اردگرد دو تین فٹ اونچی دیوار بنا کر اس کے اوپر بڑا دیدہ زیب سفید جنگلہ لگوایا۔ لوگ اس جنگلے کو بھی اکھاڑ کر لے گئے۔ دیوار کی اینٹیں بھی نہیں چھوڑی گئیں۔ اب اس باغ کا یہ حال ہے کہ اس میں سبزہ ضرور ہے درخت بھی ہیں مگر پھول دار پودا کہیں نظر نہیں آتا۔ پہلے اس باغ کی فضا پھولوں کی مہک سے لبریز رہتی تھی۔ اب پچھلے پہر یہاں سوائے سبزے کی سبز مرطوب خوشبو کے دوسری کوئی خوشبو نہیں ہوتی۔ یہی بڑی غنیمت ہے۔ سوچتا ہوں اگر قدرت کی نیچر کی یہ تھوڑی بہت نشانیاں بھی نہ رہیں تو کہاں جاؤں گا۔

سمن آباد میں ایسے خوش نصیب لوگ بہت ہیں جنہیں سبزہ و گل سے پیار ہے۔ انہوں نے اپنے گھروں کے باہر قسم قسم کے پھول دار پودے اور خوش نما درخت لگا رکھے ہیں۔ بالکونیوں پر رنگین خوشبودار پھولوں والی بیلیں چڑھائی ہوئی ہیں جن کو دیکھ کر دل سے بے اختیار اس گھر کے لیے دعا نکلتی ہے۔ اب میں جس مکان میں رہتا ہوں وہاں سرو کے دو درخت پہلے ہی سے لگے تھے دو سرو کے درخت میں نے لگا دیے جو اب کافی جوان ہو گئے ہیں اور میں نے ان کی شادی بھی کر دی ہے۔

دو سال ہوئے میں نے صحن میں دیوار کے ساتھ املتاس کا ایک پودا لگایا۔ پودا دیکھتے دیکھتے بڑا ہو گیا مگر اس پر پھول نہیں لگ رہے تھے۔ املتاس کا درخت میری یہ تحریر ضرور پڑھے گا۔ اس لیے اس سے معذرت کے ساتھ میں عرض کروں گا کہ املتاس کا درخت کوئی اتنا زیادہ خوب صورت نہیں ہوتا مگر ان پر زرد پھولوں کے جو گچھے لٹکتے ہیں وہ بے حد خوب صورت ہوتے ہیں۔ جون کے آخر میں ان پر پھول آتے ہیں اور دیکھتے دیکھتے درخت کی شاخوں پر زرد پھولوں کے فانوس ہی

فانوس لٹکنے لگتے ہیں۔ ایک گرمیاں گزر گئیں میں بڑے غور سے اپنے املتاس کی ایک ایک شاخ کو دیکھتا مگر پھول آنے کی کوئی نشانی نہ ملتی۔ ایک روز میں اپنے ایک دوست کے ساتھ املتاس کے اس درخت کے پاس کھڑا املتاس کے بارے میں ہی باتیں کر رہا تھا۔ میں نے تنگ آ کر اسے کہا۔ اگر اس موسم میں اس درخت پر پھول نہ آئے تو میں اسے کٹوا دوں گا۔

میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ درخت میری باتیں سن رہا ہے۔ آپ یقین کریں کہ دو ماہ بعد جب جون کا مہینہ آیا تو اس درخت پر پھولوں کا بور آ گیا اور چند ہی دنوں میں اس کی شاخوں پر زرد پھولوں کے نوعمر فانوس لٹک رہے تھے۔ میں تو حیران رہ گیا۔ میں درخت کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھنے لگا پھر اس کے نوجوان تنے پر بڑی محبت سے ہاتھ رکھ کر کہا:

"یار! مجھے معاف کر دینا کہ میں نے تمہارے کٹوا دینے کے بارے میں سوچا......

تمہارے پھولوں کا شکریہ۔"

درخت یقیناً بڑا خوش ہوا ہوگا۔ یہ درخت میرے گھر میں اتنا خوش ہے کہ اس کی شاخوں پر اگست کے اواخر تک پھول آتے رہے جبکہ املتاس کی بہار چند دن ہی ہوتی ہے

شروع شروع میں سمن آباد کے مکانوں میں لوگ امرود کے درخت بہت لگاتے تھے۔ اب یہ درخت کہیں کہیں ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کی جگہ پھولدار پودے لگانے کا رواج ہو گیا ہے۔ پہلے پہل ہمارے مکان کے باہر کی جانب انار کا ایک درخت ہوتا تھا۔ اس پر کچے کچے انار لگے تو بچوں نے حملہ کر دیا۔ ایک لڑکے نے کچے اناروں کے لیے ساتھ والے مکان کی دیوار پھاندی تو میں سامنے برآمدے میں بیٹھا تھا۔ لڑکا وہیں رک گیا۔ میں اسے ڈانٹنے ہی والا تھا کہ مجھے امرتسر کی مجیٹھہ روڈ والی کوٹھی یاد آ گئی جس کی دیوار پھاند کر میں انار توڑا کرتا تھا۔

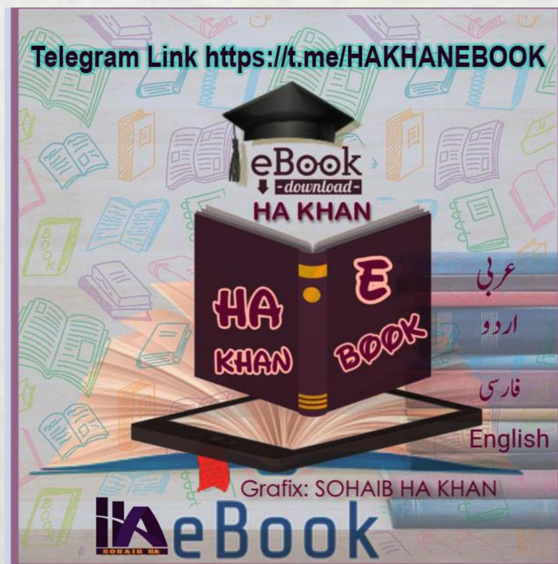
میں نے لڑکے سے کہا، "توڑ لے یار تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔" جب مکان کی تعمیر نو ہوئی تو انار کا یہ درخت مجھے داغ مفارقت دے گیا۔ ان دنوں میں امریکہ میں تھا ورنہ انار کا درخت مجھ سے کبھی جدا نہ ہوتا۔ سردیوں کی راتوں کو پچھلے پہر سمن آباد کے باغ کے اوپر والا آسمان بڑا خوبصورت ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے عہد قدیم کے بابل و نینوا کی کوئی شہزادی آسمان پر سے گزرتے وقت اپنے سارے زر و جواہر پیچھے پھینکتی ہوئی گزر گئی ہے۔ سفید، نیلے، سرخی مائل چمکتے، ٹمٹماتے جھلملاتے ستارے ہیرے موتیوں کی طرح بکھرے ہوتے ہیں۔ صبح کا ستارہ آسمان کے

مشرقی افق سے ذرا اوپر سفید گل داؤدی کے پھول کی طرح جھلملا رہا ہوتا۔ ستارہ زہرہ نیلم کی طرح دمک رہا ہوتا۔ یہ محبت ادب اور حسن کا ستارہ ہے۔ کم از کم اس کے بارے میں یہی کہا جاتا ہے۔ ان ستاروں کو سمن آباد کے باغ میں رات کے پچھلے پہر دیکھنا چاہیے۔ گھر کی چھت پر سے دیکھو تو یہ کچھ اور ہی نظر آتے ہیں۔ ایک بار میں صبح کی سیر کو نہ گیا اور مکان کی چھت پر چڑھ کر ستاروں پر نظر ڈالی تو وہ مجھے عالم پریشانی میں ادھر ادھر دیکھتے نظر آئے۔ جیسے انہیں پولیس گاڑی میں بٹھا کر وہاں چھوڑ گئی ہو اور وہ ہر ایک سے پوچھتے پھرتے ہوں کہ بھائی موچی دروازے والی ویگن کہاں سے ملے گی؟ اسٹیشن کو کون سا راستہ جاتا ہے؟ ایڈل جی کی دکان کہاں ہے؟ ایسی کسمپرسی کے عالم میں میں نے ستاروں کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

یہ ستارے امریکہ کے آسمان پر بھی مجھے اکھڑے اکھڑے نظر آئے۔ امریکہ میں میرا مستقل قیام واشنگٹن میں ہے۔ یہ ایک جدید ترین میکانکی شہر ہے۔ ہائی رائز عمارتیں آسمان کو چھوتی ہیں مگر وہاں کسی کو آسمان کی طرف دیکھنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ میں منہ اندھیرے دفتر جاتے ہوئے اپارٹمنٹ بلڈنگ کی لابی سے نکلتے ہی ایک نظر آسمان پر ڈالنا کبھی نہ بھولتا تھا۔ مئی جون کی راتوں میں یہاں ستارے پھر بھی چمکتے جھلملاتے نظر آتے۔ باقی دنوں میں آسمان زیادہ تر ابر آلود ہی رہتا یا بارشیں ہو رہی ہوتیں اور برف گر رہی ہوتی تھی۔ میں واشنگٹن میں ورجینیا کے علاقے میں تھا۔ یہاں دو تین بڑے خوشنما باغ اور پارک تھے۔ ایک باغ کا تو نام ہی روز گارڈن تھا اور وہاں بڑے گلاب لگے تھے۔ مگر وہاں کبھی کوئی شخص سیر کرتا دکھائی نہ دیا۔ کبھی کبھار کوئی لڑکا یا لڑکی دوڑ لگاتی یعنی جوگنگ کرتی ضرور دکھائی دے جاتی تھی۔ لاہور سے چلتے وقت میں نے سوچا تھا کہ واشنگٹن پہنچ کر صبح کی سیر کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ میں ستمبر میں وہاں پہنچا۔ تب موسم سرما کا آغاز ہو چکا تھا۔ میپل اور چنار کے درختوں کے پتوں کا رنگ زرد، سنہری اور سرخ ہو گیا تھا اور وہ گرنا شروع ہو گئے تھے۔ ستمبر میں وہاں سردی ایسی تھی کہ ویسی سردی لاہور میں دسمبر میں بھی نہیں پڑتی۔ شروع کے کچھ دن میں ووڈ برج کے علاقے میں اپنے ایک دوست کے مکان میں رہا۔ جاتے ہی دفتر کا کام شروع ہو گیا۔ وہ لوگ ایک سیکنڈ بھی ضائع نہیں ہونے دیتے۔ صبح ساڑھے سات بجے دفتر پہنچنے کے لیے ہمیں ساڑھے پانچ بجے گھر سے نکلنا پڑتا۔ ساڑھے پانچ بجے گھر سے نکلنے کے لیے چار بجے اٹھ کر تیاری شروع کرنی پڑتی تھی۔ گھر سے وائس آف امریکہ کے دفتر کا تیز رفتار گاڑی کا

تقریباً ایک گھنٹے کا سفر تھا۔ صبح صبح ایسی تیز ٹھنڈی ہوا کے پھانڈے چل رہے ہوتے کہ نانی یاد آجاتی۔ ایک روز میں نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ اس سردی اور طوفانی ہواؤں میں ستارے بھی جیسے جیکٹیں پہنے سروں پر گرم مفلر لپیٹے آسمان پر ٹھٹھر رہے تھے۔ یہاں صبح کی سیر کا نہ وقت تھا نہ حوصلہ...... کچھ دنوں بعد میں اپنے اپارٹمنٹ میں اٹھ آیا تھا۔ سردی اور ٹھنڈی ہواؤں کی شدت میں اضافہ ہوگیا تھا۔ چھٹی کے دن میں ہمت کر کے خوب گرم کپڑے پہن کر سیر کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ ہمارے پیچھے یونین ہلز کا بڑا خوبصورت علاقہ تھا جہاں خوشنما پھلواڑیوں کے درمیان کرسمس کارڈوں کی طرح کاٹج بنے ہوئے تھے ایک چکر لگانے کے بعد ہی میری ہمت جواب دے گئی۔ ایک تو منہ اندھیرے کی فضا میں شبنم اور پھولوں کی مہک کی بجائے پٹرول اور دھوئیں کی ہلکی ہلکی مستقل بو رچی ہوتی تھی......؟

ختم شد



راشد اشرف کی کتابوں کی تفصیل

نمبر شمار	کتاب کا نام	ناشر	قیمت
1	ابن صفی۔ شخصیت اور فن	اٹلانٹس پبلی کیشنز، کراچی	790
2	حیرت کدہ، جلد اول (خود نوشتوں سے ماورائے عقل واقعات)	اٹلانٹس پبلی کیشنز، کراچی	690
3	گلدستۂ شاہد احمد دہلوی (خاکے، مضامین)	فضلی سنز، کراچی	600
4	دل ہی تو ہے (خود نوشتوں سے رومانی واقعات)	اٹلانٹس پبلی کیشنز، کراچی	590
5	اردو کے نادر و کمیاب شخصی خاکے (جلد اول)	اٹلانٹس پبلی کیشنز، کراچی	790
6	اردو کے نادر و کمیاب شخصی خاکے (جلد دوم)	اٹلانٹس پبلی کیشنز، کراچی	790
7	مختصر سفر نامے اور رپورتاژ (رسائل و جرائد سے)	فضلی سنز، کراچی	600
8	مولانا عبد السلام نیازی۔ یادیں اور باتیں	فضلی سنز، کراچی	400
9	ابن صفی: کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا (خاکے)	فضلی سنز، کراچی	500
10	طرز بیاں اور (خود نوشتوں پر تبصرے، مقالے)	فضلی سنز، کراچی	500
11	چراغ حسن حسرت: ہم تم کو نہیں بھولے (خاکے)	فضلی سنز، کراچی	400
12	شکاریات کی ناقابل فراموش داستانیں۔ جلد اول	اٹلانٹس پبلی کیشنز، کراچی	690
13	شکاریات کی ناقابل فراموش داستانیں، جلد دوم	فضلی سنز، کراچی	500
14	شکاریات کی ناقابل فراموش داستانیں، جلد سوم	اٹلانٹس پبلی کیشنز، کراچی	690
15	شکاریات کی ناقابل فراموش داستانیں، جلد چہارم	اٹلانٹس پبلی کیشنز، کراچی	690
16	ماضی کے جھروکوں سے (تقسیم سے قبل تا سنہ ساٹھ کی دہائی کے رسائل و جرائد سے دلچسپ تحریروں کا مجموعہ)	اٹلانٹس پبلی کیشنز، کراچی	500
17	حیرت کدہ (جلد دوم)، ماورائے عقل واقعات	اٹلانٹس پبلی کیشنز، کراچی	690

18	ڈائجسٹ کہانیاں , پہلی جلد ، (یادگار اور حساس کہانیوں کا انتخاب)	اٹلانٹس پبلی کیشنز، کراچی	780
19	ڈائجسٹ کہانیاں، دوسری جلد ۔ ڈائجسٹوں سے ازحد دلچسپ سائنس فکشن پر مبنی کہانیوں کا انتخاب	اٹلانٹس پبلی کیشنز، کراچی	840
20	ڈائجسٹ کہانیاں، تیسری جلد ۔ پاسبان شب/ قاصد جاں، رائڈر ہیگرڈ کے دو یادگار ناول، ایک جلد میں	اٹلانٹس پبلی کیشنز، کراچی	610
21	ڈائجسٹ کہانیاں، چوتھی جلد ۔ طویل کہانیوں کا انتخاب...... سڈنی شیلڈن، عبدالقیوم شاد و دیگر	اٹلانٹس پبلی کیشنز، کراچی	810
22	وشوا ناتھ طاؤس کے فلمی و ادبی مضامین ۔ معروف بھارتی ادیب آنجہانی وشوا ناتھ طاؤس کے تقسیم سے قبل وفوراً بعد کی فلموں اور اُسی دور کے ادبی موضوعات پر موقر اور دلچسپ مضامین ۔ ایسے کہ گویا ... وہ لکھے اور پڑھا کرے کوئی ۔ بقول شاعر ...... دیکھئے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا...... 654 صفحات کی ایک منفرد کتاب	اٹلانٹس پبلی کیشنز، کراچی	1200
23	وہ بھولی داستاں (VERY RARE PRESS BOOKLETS OF EARLY INDIAN TALKIES, 1931 - 1940) A Coffee Table Book	اٹلانٹس پبلی کیشنز، کراچی	20,000
24	شکاریات کی ناقابل فراموش داستانیں، پانچویں جلد	اٹلانٹس پبلی کیشنز، کراچی	1090
25	شکاریات کی ناقابل فراموش داستانیں، چھٹی جلد	اٹلانٹس پبلی کیشنز، کراچی	1090

زندہ کتابیں سلسلہ

نمبر	کتاب کا نام	قیمت
1	بزم داغ (داغ دہلوی سے متعلق یادداشتیں)، احسن مارہروی و رفیق مارہروی	300
2 اور 3	لندن سے آداب عرض/دیس سے باہر، آغا محمد اشرف، (ایک جلد میں)	400
4	موسیقار اعظم نوشاد کی از حد دلچسپ خودنوشت	480
5	یاران نجد (شخصی خاکے)، مقبول جہانگیر	380
6	کیا قافلہ جاتا ہے (شخصی خاکے)، نصر اللہ خاں، تیسرا ایڈیشن	500
7	بھوپت ڈاکو کی سوانح عمری	400
8	ملا واحدی معاصرین کی نظر میں (غیر مطبوعہ خاکے و متفرقات)	400
9	چراغ حسن حسرت: ہم تم کو نہیں بھولے (تیسرا ایڈیشن)، راشد اشرف	400
10	ابن صفی: کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا (تیسرا ایڈیشن)، راشد اشرف	500
11	طرز بیاں اور (خودنوشتوں پر تبصرے، مقالے)، راشد اشرف، تیسرا ایڈیشن	500
12	سفر امریکہ کی ڈائری، اختر حمید خان	380
13	یادوں کا سفر (خودنوشت)، اخلاق احمد دہلوی	640
14	کوچہ قاتل (خودنوشت)، رام لعل	500
15	چاند چہرے (فلمی مضامین)، علی سفیان آفاقی	550
16	سنگ دوست (یادگار شخصی خاکے)، اے حمید	720
17 اور 18	یادیں اور خاکے/ان کہی کہانیاں، عام انسانوں کے دلدوز شخصی خاکے، سیدہ انیس فاطمہ بریلوی۔ (ایک جلد میں)	400
19 اور 20	دھندلے سائے/بستی بستی روشن تھی، نا قابل فراموش خاکے اور یادداشتیں، ایم اے عثمانی۔ (ایک جلد میں)	500
21	مشاہدات (خودنوشت)، نواب ہوش یار جنگ (نظام دکن کے مصاحب)	600
22	پیر سابر متی (گاندھی کی سوانح عمری)، اندولال کنہیالال یاجنک، (مترجم: ظفر احمد انصاری)، اشاعت ثانی۔	500
23 اور 24	یہ پری چہرہ لوگ/دلیپ کمار کے رومان (ایک جلد میں)، شوکت ہاشمی رجعفر منصور۔	500
25	سحر ہونے تک (خودنوشت)، آغا جانی کاشمیری (انڈین فلم اسٹوری رائٹر)	450

26	سفرنامہ ہند (تاریخی و معلوماتی سفرنامہ)، پروفیسر محمد اسلم	400
27 اور	ترقی پسند تحریک اور بمبئی/ انگارے: ایک جائزہ، مرتبہ: پروفیسر صاحب علی/	600
28	شبانہ محمود، (ایک جلد میں)۔	
29 اور	یادوں کے گلاب/ ڈربے، (سوانحی مضامین/ سوانحی ناول)، اے حمید، (ایک	600
30	جلد میں)	
31	دریچوں میں رکھے چراغ (خاکے)، رام لعل	500
32	گورنر جنرل ہاؤس سے آرمی ہاؤس تک (یادداشتیں)، فخر عالم زبیری	450
33	بھولی ہوئی کہانیاں/ ہفت محفل (یادداشتیں)، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، (ایک	400
اور 34	جلد میں)	
35	ٹنڈو آدم سے کراچی (آپ بیتی)، ڈاکٹر رضوان اللہ خان	450
36	یادوں کی دستک (آپ بیتی)، صوفیہ انجم تاج	500
37	آدمی غنیمت ہے/ آدمی آدمی انتر (شخصی خاکے و تذکرے)، انیس شاہ جیلانی	500
اور 38	(ایک جلد میں)	
40،39	اور پھر بیاں اپنا، پھر وہی بیاں اپنا، میرا بیان (خاکے)، اخلاق احمد دہلوی،	500
اور 41	(ایک جلد میں)	
42	آہنگ بازگشت (خودنوشت)، مولوی محمد سعید (پاکستان ٹائمز)	500
43	جالب جالب (یادداشت)، مجاہد بریلوی	300
44	امرتسر کی یادیں (یادداشت)، اے حمید	580
46،45	یادیں کچھ کرداروں کی/ یہ باتیں ہیں جب کی/ سبزہ بیگانہ...	500
اور 47	(یادداشت/ یادداشت/ سوانحی مضامین)، (ایک جلد میں)	
48	کارپٹ صاحب (جم کوربٹ کی سوانح عمری)، ترجمہ نگار: مسز رابعہ سلیم	690
49	شکار اور آسیب (شکاریات کی کہانیوں کے تراجم)، سید حشمت سہیل	790
50	مولانا عبدالسلام نیازی (یادیں اور خاکے)، مرتبہ: راشد اشرف (اضافہ شدہ ایڈیشن)	400
51	چند سیپیاں سمندروں سے (سفرنامہ)، پروین شیر	200

52	یادوں کی کہکشاں (آپ بیتی / جگ بیتی)، سید حشمت سہیل	200
53اور 1	اصبار الغالب / بزم داغ (اول: مرزا غالب سے متعلق ایک اہم دستاویز / دوم: داغ دہلوی کی ہم نشینی میں گزرے ہوئے ۱۳ برسوں کی روداد)، مصنفین: ناصر الدین احمد خاں (غالب کے رشتے کے پوتے) / رفیق مارہروی	400
54	یادِ ایام، آپ بیتی، نواب محمد احمد سعید خان چھتاری	500
55	صادقین ۔مصور، شاعر، خطاط، صادقین پر اپنی نوعیت کی پہلی کتاب۔ خاکے، خودنوشت اور بہت کچھ۔ چند غیر مطبوعہ مضامین و نادر تصاویر کے ہمراہ	500
56اور 57	سفرنامہ مقبوضہ ہندوستان مع محاکمہ (رئیس امروہوی، شکیل عادل زادہ اور انیس جیلانی کے مابین سفرنامے سے متعلق دلچسپ مراسلت)، سید انیس شاہ جیلانی	500
58اور 59	شورشِ دوراں / ہم ساتھ تھے (آپ بیتیاں)، حمیدہ سالم، ہمشیرہ مجاز	500
60	Sir گزشت، آپ بیتی، شاہ محی الحق فاروقی	680
61	شکاریات کی ناقابل فراموش داستانیں، جلد دوم، مرتبہ: راشد اشرف	500
62	ورودِ مسعود (آپ بیتی)، مسعود حسن خاں (علی گڑھ)	500
63	جلتی بجھتی یادیں، آپ بیتی، عارف نقوی	400
64	اردو کی مختصر آپ بیتیاں، مشفق خواجہ	550
65	کال کوٹھری، جیل میں بیتے دنوں کی دلچسپ روداد، حمید اختر	500
66	آشنائیاں کیا کیا، شخصی خاکے، حمید اختر	500
67	حیرت کدہ، جلد دوم، ماورائے عقل واقعات، مرتبہ: راشد اشرف	690
68	اردو گیت، تاریخ، تحقیق اور تنقید کی روشنی میں، ڈاکٹر بسم اللہ نیاز احمد	400
69	جو ہم پہ گزری، یادداشتیں، سید سبط یحیٰی نقوی (سابق سفارت کار)	400
70	ماضی کے جھروکوں سے، رسائل و جرائد سے دلچسپ مضامین کا انتخاب، مرتبہ: راشد اشرف	500
71	شکاریات کی ناقابل فراموش داستانیں، جلد اول، مرتبہ: راشد اشرف	690
72	شکاریات کی ناقابل فراموش داستانیں، جلد سوم، مرتبہ: راشد اشرف	690
73	شکاریات کی ناقابل فراموش داستانیں، جلد چہارم، مرتبہ: راشد اشرف	690
74	نایاب ہیں ہم، خاکے اور مضامین، آصف جیلانی (بی بی سی لندن)	200
75	بیدار دل لوگ، شخصی خاکے، شاہ محی الحق فاروقی	450
76	قافلے اجالوں کے، شخصی خاکے، ڈاکٹر محمود احمد کاوش	300

77	وہ کہاں گئے (خاکے)، ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی	480
78	ساقی کا جوش نمبر، ایک کمیاب دستاویز	1200
79	گلدستہ شاہد احمد دہلوی، مرتبہ راشد اشرف	600
80	ڈائجسٹ کہانیاں، ڈائجسٹوں سے یادگار کہانیوں کا انتخاب، راشد اشرف	780
81	مختصر سفرنامے اور رپورتاژ (تقسیم سے قبل اور بعد کے رسائل سے)، راشد اشرف	600
82	حیات سعید، حکیم سعید کی سوانح عمری، ستار طاہر کے قلم سے	700
83	اے تحیر عشق (ناول)، ڈاکٹر رفیع مصطفیٰ	500
84	قید یاغستان (قید و بند و فرار کی ایک لازوال داستان)، محمد اکرم صدیقی	1290
85	عظمتِ رفتہ، خاکے، ضیاء الدین برنی	700
86	خوش نفساں، خاکے، پروفیسر امجد علی شاکر	400
87 اور 88	لخت لخت داستان/ دھند اور دھنک، (آپ بیتی اور خاکے)، بریگیڈیئر اسمٰعیل صدیقی	700
89	ڈائجسٹ کہانیاں، دوسری جلد۔ ڈائجسٹوں سے از حد دلچسپ سائنس فکشن پر مبنی یادگار کہانیوں کا انتخاب۔ مرتبہ: راشد اشرف	840
90	ڈائجسٹ کہانیاں، تیسری جلد۔ پاسبان شب/ قاصدِ جاں، رائڈر ہیگرڈ کے دو بہترین ناول، ایک جلد میں۔ مرتبہ: راشد اشرف	610
91	ڈائجسٹ کہانیاں، چوتھی جلد۔ طویل کہانیوں کا انتخاب... سڈنی شیلڈن، عبدالقیوم شاد و دیگر۔ مرتبہ: راشد اشرف	810
92، 93 اور 94	جم کوربٹ، پہلی جلد۔ برصغیر کے نامور شکاری جم کوربٹ کی تین کتابیں، ایک جلد میں۔ (کماؤں کے آدم خور، رودر پریاگ کا آدم خور چیتا اور کماؤں کے دیگر آدم خور)	650
95، 96 اور 97	جم کوربٹ، دوسری جلد۔ برصغیر کے نامور شکاری جم کوربٹ کی یادداشتوں پر مبنی تین کتابیں، ایک جلد میں۔ میرا ہندوستان، جنگل کہانی اور ٹری ٹوپس	500
98، 99 اور 100	ابن صفی کے ہمبگ دی گریٹ کی مکمل کہانی، (دلچسپ حادثہ، بے آواز سیارہ، ڈیڑھ متوالے) پیشکش کے ایک نئے انداز میں، الہ آباد کے اداریے، ڈیڑھ متوالے پر تجزیاتی مضامین، تصاویر..... اور بہت کچھ۔ A Collector's Item	890

101	ساقی کا شاہد احمد دہلوی نمبر، ۷۰۰ صفحات کی ایک اہم دستاویز جس میں شاہد احمد دہلوی گویا زندہ ہو کر سامنے آجاتے ہیں	1600
102	افکار کا جوش نمبر، جوش ملیح آبادی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتی ایک ضخیم دستاویز	1600
103	ادب سے فلم تک، رشید انجم (بھوپال)....۱۴۵ شخصیات پر ایک ضخیم اور موقر کتاب۔ اُن معروف ادبی شخصیات کا تذکرہ جن کی تخلیقات نے فلم کے میدان میں بھی نام کمایا۔ 920 صفحات پر مشتمل ایک قیمتی کتاب۔	1980
104	کاروانِ حیات (آپ بیتی)، نواب مشتاق احمد خاں (ایجنٹ جنرل حیدرآباد دکن)	650
105	یادوں کی بستی (یادداشتوں پر مبنی ڈائری)، خان کفایت اللہ حافظ	690
106	سری ادب اور ابن صفی، ۲۰۱۳ء مولانا آزاد یونیورسٹی، حیدرآباد دکن میں منعقدہ ابن صفی سیمینار میں پڑھے گئے مقالوں پر مبنی کتاب	900
107	باتوں، ملاقاتوں میں شہریار (ہندوستانی شاعر شہریار سے متعلق یادیں)، پریم کمار	800
108	آپ کا سعادت حسن منٹو (منٹو کے کمیاب خطوط)، بمبئی سے شائع ہوئی ایک اہم اور دلچسپ کتاب	900
109	خونِ جگر ہونے تک (قحطِ بنگال کے پس منظر میں لکھا ایک یادگار ناول)، فضلی احمد کریم فضلی	900
110	روشن دان، خاکے، جاوید صدیقی	480
111	یادوں کے انمول خزانے، آپ بیتی، حافظ لدھیانوی	800
112 اور 113	متاعِ گم گشتہ، متاعِ بے بہا، شخصی خاکے، حافظ لدھیانوی	800
114	کس پہ کھولوں گٹھڑی، آپ بیتی، کرتار سنگھ دگل، اردو و ہندی کے جانے پہچانے ادیب، آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ رہے کرتار سنگھ دگل کی ۶۲۵ صفحات پر مشتمل ایک ضخیم اور دلچسپ آپ بیتی	900

133	رقصِ شرر، آپ بیتی، ملک زادہ منظور (لکھنؤ)، اردو کی ایک عمدہ اور دلچسپ آپ بیتی	1200
134	سحر ہونے تک،، ناول، فضل احمد کریم فضلی	1200
135	وہ بھولی داستاں (VERY RARE PRESS BOOKLETS OF EARLY INDIAN TALKIES, 1931 - 1940) A Coffee Table Book..........A Collector' Item برصغیر کی تقسیم سے قبل کی فلموں کا ایک ایسا ریکارڈ جو پہلی مرتبہ اس شکل میں پیش کیا جا رہا ہے۔ 650 صفحات، 128 گرام کے Vintage کاغذ پر، کافی ٹیبل (Coffee Table) کتاب۔ انتہائی کمیاب تصاویر کے ہمراہ۔ اس کتاب میں برصغیر کی گم شدہ فلمی تاریخ کو محفوظ کیا گیا ہے۔ جہاں آرا کجن، جدن بائی، مظہر خان، گل حمید اور بہت سے دوسرے فنکاروں کی تصویری داستان۔	20,000
136	جو یا درہا، آپ بیتی، عابد سہیل (لکھنؤ)	1680
137	پورے، آدھے اور ادھورے، شخصی خاکے، عابد سہیل (لکھنؤ)	590
138 اور 139	اوراق ہستی (آپ بیتی) اور ہمارے گاؤں ہمارے لوگ (خاکے)، رضوان اللہ (دہلی)	1200
140	میری دلی، آپ بیتی، اسلم پرویز، ایک ہنستی مسکراتی کتاب، دلی مرحوم کی تہذیب کا مرقع	750
141	آگرہ اور آگرہ والے، یادداشتیں، میکش اکبرآبادی (انڈیا)	750
142	جن سے الفت تھی بہت، خودنوشت، سید قمر الحسن (انڈیا)	1000
143	جہدِ مسلسل۔ علی گڑھ سے علی گڑھ تک، آپ بیتی، عابد اللہ الانصاری غازی	1000
144 & 145	دربدری اور بیتے ہوئے دن، اردو کی دو اہم آپ بیتیاں، رتن سنگھ کے قلم سے	1000
146	اوراق حیات، ایک ہزار صفحات پر مشتمل مولانا وحید الدین خاں کی خودنوشت تحریروں پر مبنی سوانحی کتاب، شاہ عمران حسن (دہلی)	2000
147	گئو دھول، خودنوشت سوانح حیات، سید محمد عقیل (الہ آباد)	1000

148	رابعہ مہدی علی خاں کی ادبی خدمات، عبدالقدیر مقدر (انڈیا)	1200
149	سونے چاندی کے بت، فلمی خاکے و مضامین، خواجہ احمد عباس	640
150	جزیرہ نہیں ہوں میں (آپ بیتی)، خواجہ احمد عباس، I Am Not An Island کا اردو ترجمہ۔ اس اہم اور دلچسپ آپ بیتی کے ترجمہ نگار، خواجہ احمد عباس کی سگی بھانجی ڈاکٹر شبلا نقوی اور چندی گڑھ کے ڈاکٹر نریش ہیں۔	1650
151	داستان میری، خودنوشت، ڈاکٹر اقبال حسین (خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ بہار کے ڈائرکٹر)	1200
152	فن اور شخصیت (بمبئی)، کوائف نمبر، صابر دت	1200
153	عرض و سماع، آپ بیتی، سید مظفر حسین (آل انڈیا ریڈیو سے ۱۹۴۲ء میں ملازمت کا آغاز کرنے والے ایک براڈ کاسٹر کی از حد دلچسپ داستان حیات	1000
154	شکاریات کی ناقابل فراموش داستانیں، پانچویں جلد، مرتبہ: راشد اشرف	1090
155	شکاریات کی ناقابل فراموش داستانیں، چھٹی جلد، مرتبہ: راشد اشرف 6 جلدوں پر مشتمل 3200 صفحات میں برصغیر کا تقریباً تمام اہم شکاریاتی ادب محفوظ کردیا گیا ہے۔	1090
156	فن اور فنکار، خاکے، ڈاکٹر علی احمد فاطمی (الہ آباد)	1000
157	رشید حسن خاں کے خطوط، جلد اول، مرتبہ: ڈاکٹر ٹی. آر رینا (جموں)	1600
158	رشید حسن خاں کے خطوط، جلد دوم، مرتبہ: ڈاکٹر ٹی. آر رینا (جموں)	1600
159	رشید حسن خاں کے خطوط، جلد سوم، مرتبہ: ڈاکٹر ٹی. آر رینا (جموں)	1200
160	کشمیر... سرزمینِ پشیمانی (Kashmir: Land of Regrets) کا ترجمہ، موسیٰ رضا، آئی. اے. ایس (سابق چیف سیکریٹری، جموں کشمیر)	890
161	دنیا میرے آگے، خاکے و سوانحی مضامین، ندا فاضلی (انڈیا)	590
162	رسالہ ''جن''، نیاز فتح پوری کے زیر ادارت جنوری ۱۹۳۰ء تا دسمبر ۱۹۳۰ء، کل بارہ کمیاب شمارے، پہلی مرتبہ کتابی شکل میں۔ ارواح، جنات و دیگر مافوق الفطرت واقعات....	1290

163	ہندوستانی فلم کا آغاز وارتقاء، الف انصاری (کلکتہ)	1980
164	شکاریات، محمد جسیم خان، سیر و شکار کے موضوع پر ایک معروف ومنفرد کتاب	790
165,166 اور 167	روداد قفس، بجھے دیوں کی قطار، آشنا چہرے، حفیظ نعمانی (لکھنؤ)......اسیری کی روداد...اور شخصی خاکے	1100
168	درشن، خاکے و یادداشتیں، وقار قادری (انڈیا)	690
169	سری ادب کا پہلا اور آخری آدمی، ابن صفی پر مضامین (انڈیا و پاکستان کے مولفین کی مشترکہ پیشکش)......بڑے سائز میں	1600
170	خط انشاء جی کے، مرتبہ: ڈاکٹر ریاض اے ریاض، ابن انشاء کے سدا بہار خطوط کا مجموعہ	590
171, 172, 173 & 174	خلت قزاق سیریز: خلت قزاق پراسرار دنیا میں، منحوس ستارہ اور خلت قزاق، خلت قزاق کے آخری معرکے، Harold Lamb کی معرکتہ الآرا تصنیف The Curved Saber کا رواں اور سلیس ترجمہ، سابق بیوروکریٹ محمد ہادی حسین کے قلم سے۔ مہم جوئی اور شجاعت کی لازوال داستان۔	1490
175	"سلسلۂ مکاتبت"، مشفق خواجہ اور ہند کی معروف ادبی شخصیت رشید حسن خاں کے مابین ہوئی دوطرفہ مراسلت کا مجموعہ	1200
176 اور 177	دو ملک ایک کہانی (رپورتاژ) اور جیل کے دن جیل کی راتیں (قید و بند کی روداد)، ابراہیم جلیس کی دو یادگار کتابیں...ساٹھ برس کے بعد دوبارہ زیور طبع سے آراستہ کی گئی ہیں۔	890
178	علی گڑھ میری شخصیت کے آئینے میں، یادداشتیں، پروفیسر محمد عابد (علی گڑھ)	900
179	خواب، خیال اور زخم، خاکے ومضامین، پروفیسر امجد علی شاکر	1000
180	ابن انشاء۔یادیں باتیں...بہار خزاں (یادداشتیں)، اے حمید کے سدا بہار قلم سے	790
181	لاہور کی یادیں، اے حمید (لاہور سے وابستہ یادداشتیں)	890

182　تقسیم ہند، ابوالکلام آزاد کی کتاب India Wins Freedom کے　790
جواب میں لکھی گئی کتاب India Wins Freedom: The Other Side کا ترجمہ۔ اس کے مصنف عبدالوحید خان ۶۰ء کی دہائی میں وفاقی وزیر تھے۔ تاریخ کے دھندلکوں میں کھو جانے والی ایک بے حد اہم اور دلچسپ کتاب کی بازیافت۔

زیر ترتیب

۱...... دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھا، خودنوشت، رئیس الدین فریدی (انڈیا)
۲...... میری صحافتی زندگی، آپ بیتی، احمد سعید ملیح آبادی، کلکتہ، انڈیا
۳...... بمبئی کی بزم آرائیاں، خودنوشت، رفعت سروش (دلی)
۴...... اور بستی نہیں یہ دلی ہے، خودنوشت، رفعت سروش (دلی)
۵...... جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی، خودنوشت، کلیم عاجز (انڈیا)
۶...... ابھی سن لو مجھ سے، خودنوشت، کلیم عاجز (انڈیا)
۷...... میری افسانہ نویسی کے چالیس برس، یادداشتیں، اوپندر ناتھ اشک
۸...... شکار، لکھنؤ سے اسی کی دہائی میں شائع ہوئی ایک دلچسپ کتاب، سید اشتیاق علی علوی
۹...... جنگل، لکھنؤ سے اسی کی دہائی میں شائع ہوئی ایک دلچسپ کتاب، سید اشتیاق علی علوی
۱۰...... محقق غالب کالی داس گپتا رضا (خاکے و یادیں)
۱۱...... خبر گیر، قیصر تمکین، ایک صحافی کی آپ بیتی
۱۲...... رہ گزر در رہ گزر، آپ بیتی، پروفیسر حامدی کاشمیری (جموں)
۱۳...... رقص بسمل، آپ بیتی، شین مظفر پوری (پٹنہ، بہار)
۱۴...... پانچواں چراغ، آپ بیتی، قمر آزاد ہاشمی (دہلی)
۱۵...... ساحر فن اور شخصیت (خاکے و یادیں)، مرتبہ: سلطانہ مہر
۱۶...... جنگی قیدی کی ڈائری، یادداشتیں، بریگیڈیئر منصور الحق
۱۷...... بسنگ آمد اور کوہ گراں، آپ بیتیاں، کیپٹن ادریس
۱۸...... تحریک ہجرت (پانچ آپ بیتیاں ایک جلد میں)، عزیز ہندی، مولوی محمد علی قصوری، میاں اکبر شاہ، حاجی فیض محمد اور کابل میں سات سال، مولانا عبید اللہ سندھی
۱۹...... دستخط، نیا ورق، بمبئی کے مدیر، ساجد رشید کے اداریوں کا مجموعہ

اٹلانٹس کی فلمی مطبوعات

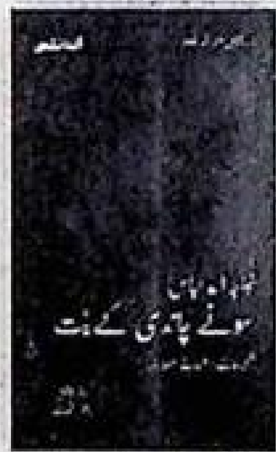


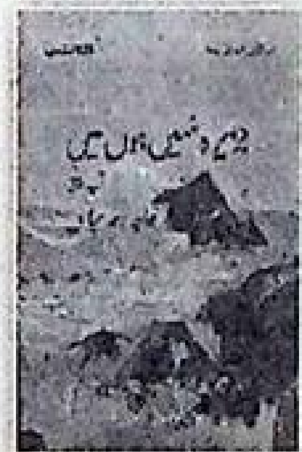












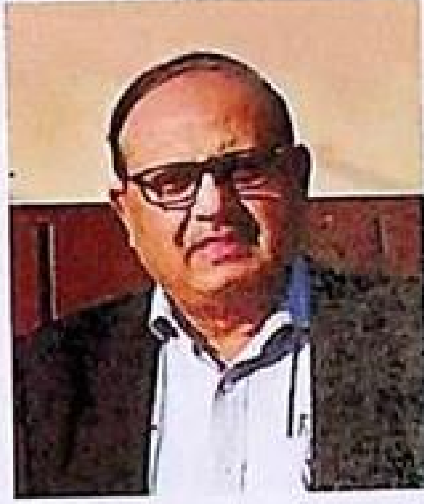












ڈاکٹر پرویز حیدر (سرپرست اعلی زندہ کتابیں)



راشد اشرف (بانی زندہ کتابیں)

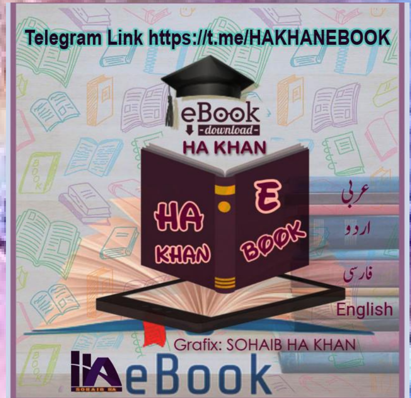
www.atlantispublications.com.pk

لاہور کی یادیں

(یادداشتیں)



اے حمید



ISBN: 978-969-601-354-9



اٹلانٹس پبلیکیشنز
موبائل نمبر 0348-2568546
کراچی فون نمبر 021-32581720
customercare@atlantispublications.com.pk

اٹلانٹس پبلیکیشنز